Bisween Sadi Mein Ghair Afsanavi Nasr Ke Irteqa Mein Aligarh Ka Hissa

Abstract

Thesis

Submitted for the Award of the Degree of

Doctor of Philosophy

in

Urdu

Under the Supervision of
Dr. Shahabuddin (Saqib)

By
Noman Alam

DEPARTMENT OF URDU
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH (INDIA)

2008

بیسوی صدی میں غیر افسانوی نثر
کے
ارتقا میں علی گڑھ کا حصہ

تلخیص

مقالہ برائے

پی ایچ - ڈی (اردو)

نگراں

ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب

پیش کردہ

نعمان عالم

شعبۂ اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۰۰۸ء

تلخیص

تحقیق ایک پرخطر وادی ہے، جہاں بہتوں کے قدم متزلزل ہو جاتے ہیں۔ کسی خاص نتیجے تک رسائی یا منطقی نتائج کا استخراج بہت مشکل ہوتا ہے۔ تحقیق کو اگر اس کے مکمل مفہوم اور معنویت کے ساتھ سامنے رکھا جائے اور اس کے مطالبات کی تکمیل کی جائے تو یقیناً یہ عمل تحقیق کہلائے گا۔ پہلے زمانے کے محققین جاں گسل واقع ہوئے تھے اور انھوں نے تحقیق کی پرخطر وادیوں میں اپنے پاؤں کو لہولہان کیا تھا اور شب و روز کی تمیز کو بھلا کر متعلقہ موضوع کے تعلق سے حیرت انگیز انکشافات کیے تھے، اس لیے پہلے کی تحقیق میں تحیر کا عنصر شامل تھا، مگر آج تحقیق کی صورت بدل گئی ہے۔

میں نے اپنا موضوعِ تحقیق منتخب کرتے وقت یہ پیش نظر رکھا تھا کہ کسی نئے زاویے کی جستجو کی جائے اور عام تحقیقی روش سے ہٹ کر ایک نئے انداز پر ایک نئے انداز کا کام کیا جائے، اس لیے میں نے شخصیت اور فن کے بجائے ایک ایسے موضوع کا انتخاب کیا جس کا دائرہ بھی وسیع تھا اور جس میں کچھ نئے نتائج کے استخراج کا امکان بھی۔ نہایت فرسودہ قسم کے موضوع سے الگ ہٹ کر میں نے اپنے تجسس اور تفحص کی تسکین کے لیے ''بیسویں صدی میں غیر افسانوی نثر کے ارتقا میں علی گڑھ کا حصہ'' کا انتخاب کیا تھا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ موضوع نہایت محنت، مشقت اور مغز ماری کا متقاضی ہے۔ جب میں نے اس موضوع کی تمام جہتوں کا احاطہ کیا تو محسوس ہوا کہ یہ تو بڑا ہی دشوار طلب اور حوصلہ آزما کام ہے۔ چونکہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایک عظیم دانش گاہ ہے، جس کے فرزند معنوی پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ علم و ادب کا ایک مرکز ہونے کے ناطے یہاں

کے طلبا میں علمی ادبی ذوق بھی رہا ہے، چاہے وہ کسی بھی شعبے سے وابستہ ہوں، کسی بھی پیشے سے تعلق رکھتے ہوں، مگر ان کے اندر بے پناہ ادبی ذوق بھی ہے اور اس کی تکمیل کے لیے اکثر لوگ مقالات، مضامین بالخصوص سفرنامے، خاکے اور خودنوشت لکھتے رہے ہیں۔ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے فرزندان علی گڑھ کی تخلیقی سرگرمیوں کا مکمل احاطہ کرنا دشوار کام تھا، پھر بھی میں نے کوشش کی ہے کہ اپنے موضوع سے متعلق تمام چیزیں اکٹھی کرلوں تاکہ کوئی بھی پہلو تشنہ نہ رہ جائے، چنانچہ اس تحقیقی سفر کے دوران بہت سے مسائل اور مصائب سے گزرتے ہوئے میں نے اس علمی تخلیقی سرمائے کی جستجو میں کامیابی حاصل کی اور اپنے موضوع سے متعلقہ مواد کے حصول میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں برتی، پھر بھی امکان ہے کہ بہت سے نام چھوٹ گئے ہوں گے اور بہت سی کتابیں رہ گئی ہوں گی، کیونکہ علی گڑھ سے وابستہ افراد کی ایک بڑی تعداد ہے جن کے بارے میں فرداً فرداً معلومات حاصل کرنا مشکل ہے۔ بہرحال میں نے جس تحقیقی موضوع کا انتخاب کیا ہے اس کے دائرے میں بہت سی اہم ہستیاں اور افراد آتے ہیں جنھوں نے اردو ادب کے تخلیقی سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہی نہیں کیے، بلکہ بعض نئی جہتیں بھی پیدا کیں، اور بعض نئی بنیادیں بھی تعمیر کیں۔

خاکہ، خودنوشت، سوانح، خطوط اور سفرنامے کے حوالے سے وابستہ افراد کا کارنامہ اتنا اہم ہے کہ ہر ایک پر اگر تفصیل سے لکھا جائے تو ہر باب ایک ضخیم کتاب کی شکل اختیار کرلے گا۔ ان جملہ اصناف میں فرزندان علی گڑھ نے نہ صرف یہ کہ اپنی تخلیقی قوتوں کا بھرپور استعمال کیا بلکہ اس کے روایتی فریم اور حدود میں بھی وسعت پیدا کی اور نئے رنگ و نور پیدا کیے اور اسی طرح ان تمام اصناف میں علی گڑھ کی خدمات نہ صرف مسلم ہیں بلکہ اس اعتبار سے بھی قابل لحاظ ہیں کہ ان اصناف کو نئی وسعتیں اور نئے امکانات میسر آئے ہیں۔ ان تمام اصناف میں فرزندان علی گڑھ کی بیش بہا خدمات رہی ہیں جو کئی دہائیوں پر محیط ہیں۔ خاکہ کے تعلق سے بات کی جائے تو مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، آغا حیدر حسن، خواجہ غلام السیدین، شاہد احمد دہلوی، جلیل قدوائی، مولانا عبدالماجد دریابادی، اعجاز حسین، غلام فرقت کاکوروی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، معین الدین دردائی، ڈاکٹر خلیق الرحمٰن اعظمی، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، سید حامد، حمیدہ اختر حسین اور

اختر الواسع وغیرہ ایسے نام ہیں جنھوں نے اردو خاکہ نگاری کی توسیع میں اہم کردار ادا کیے۔علی گڑھ کے خاکہ نگاروں کا امتیاز یہ ہے کہ وہ ویلوز اور اقدار کو نظر انداز نہیں کرتے، وہ اخلاقی اقدار وصفات کا بھی ذکر کر دیتے ہیں تاکہ موضوع کی سیرت وصورت کا واضح نقش سامنے آجائے۔مولوی عبدالحق اور رشید احمد صدیقی خاکہ نگاری کے دو ایسے نام ہیں جو اس صنف میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔نام دیو مالی (مولوی عبدالحق)، کندن (رشید احمد صدیقی) یہ دونوں ایسے خاکے ہیں جن سے تحریک پا کر خاکہ نگار عام انسانوں کو بھی خاکہ کا موضوع بنانے لگے۔نام دیو مالی کو باغ کے پھولوں، پودوں سے پیار محبت اور ایسی انسیت ہوگئی کہ نام دیو ہمیشہ اس کی تراش خراش میں مگن اور اس کی دیکھ ریکھ میں محو رہتا۔محنت اور ایمان داری سے باغ کی دیکھ بھال میں لگا رہتا۔یہی محنت، ایمانداری اور اپنا پن کے احساس نے مولوی عبدالحق کے ذہن پر دیو مالی کی عظمت کو نقش کر دیا۔اسی طرح کندن جو آرٹس فیکلٹی میں گھنٹہ بجاتا تھا اور وہ گھنٹہ بجانے کے وقت کا اتنا پابند تھا کہ لوگ اس کے بجانے سے وقت کا تعین کرتے۔وقت کی پابندی ہی انسان کو بڑا بناتی ہے۔کندن کی اس خوبی نے رشید صاحب کو اس کا خاکہ لکھنے پر مجبور کیا۔

سفرنامے کے تعلق سے بات کی جائے تو سب سے پہلے علی گڑھ کے سفرنامہ نگاروں میں سرسید احمد خاں کا نام آتا ہے۔جن کا سفرنامہ ''مسافران لندن'' کے نام سے مجلس ترقی ادب لاہور سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔سرسید کی اس کوشش سے تحریک پا کر محمد اسماعیل پانی پتی ''مسافران لندن''، کنور عبدالغور خاں ''سفرنامۂ عالم''، حاجی مولوی محمد اسحاق خاں مائل ''سفرنامۂ مائل''، راحل شیروانیہ بنت حاجی محمد عیسیٰ خاں شیروانی رئیس دتاولی علی گڑھ ''زادالسبیل''، ''رحلۃ الراحل''، مولانا عبدالماجد دریابادی ''سفر حجاز''، ''سفرنامہ لاہور''، ''ڈھائی ہفتے پاکستان میں'' اور ''سیاحت ماجدی''، خواجہ غلام ''روزنامچہ سیاحت''، خواجہ احمد عباس ''مسافر کی ڈائری''، قرۃ العین حیدر ''جہان دیگر'' اور ''دکھلائیے لے جا کے اسے مصر کا بازار''، ڈاکٹر عابد حسین ''رہ نورد شوق''، خواجہ غلام السیدین ''دنیا میرا گاؤں''، پروفیسر ثریا حسین ''پیرس و پارس''، حکیم سید ظل الرحمٰن ''ایران نامہ'' نے اور پروفیسر حافظ شائق محمد یحییٰ ''جہان دیگر'' سفر کے احوال، مشاہدات اور تجربات کو کتابی شکل پیش کیا۔

اسی طرح خودنوشت بھی فرزندان علی گڑھ کی محبوب صنف رہی ہے۔تقریباً اردو میں پچاس سے زائد خودنوشتیں ہیں جو علی گڑھ کی دین ہیں۔ یہ خودنوشتیں علی گڑھ کی روشن تہذیب، تابناک تاریخ، خوشگوار ماضی اور تحریک آزادی کی داستان کی امین ہیں۔ کیونکہ علی گڑھ محض دانش گاہ ہی نہیں بلکہ تہذیب وثقافت کا گہوارہ اور علم وفن کا منبع رہا ہے، وہاں کی تحریکی تربیت اور تعمیری سوچ نے مادر ہند کو ایسے سپوت دیے جن کی اولوالعزمی اور ثابت قدمی نے فرنگیوں کے ایوان اقتدار میں زلزلہ پیدا کر دیا۔اس اعتبار سے فرزندان علی گڑھ میں مولانا حسرت موہانی کا نام نہایت بلند ہے، جنھوں نے پہلی بار ہندوستان کی مکمل آزادی کا مطالبہ انگریزوں سے کیا اور جسے پنڈت جواہر لال نہرو نے سراہا بھی۔

آشفتہ بیانی میری (رشید احمد صدیقی)، یادوں کی دنیا (یوسف حسین خاں)، یادوں کی برات (جوش ملیح آبادی)، مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں (خواجہ غلام السیدین)، ہم ساتھ تھے (حمیدہ سالم)، خواب باقی ہیں (آل احمد سرور)، جواب دوست (نسیم انصاری)، حیات مستعار (جلیل قدوائی)، ورود مسعود (مسعود حسین خاں)، گفتنی ناگفتنی (وامق جونپوری)، اس آباد خرابے میں (اختر الایمان)، برگ گل (مقبول احمد)، اعمال نامہ (سر رضا علی عابدی)، خوں بہا (حکیم احمد شجاع)، یاد ایام (نواب سعید چھتاری)، جو کہا نہیں گیا (کسم انسل)، گرد راہ (اختر حسین رائے پوری)، شاہراہ پاکستان (چودھری خلیق الزماں)، شورش دوراں (حمیدہ سالم)، زرگذشت (مشتاق احمد یوسفی) ایسی خودنوشتیں ہیں جن میں علی گڑھ کا خوشگوار ماضی پوری طرح سانسیں لیتا نظر آتا ہے۔اس فہرست میں پروفیسر اطہر صدیقی کی خودنوشت ''میں کیا میری حیات کیا'' بھی شامل ہوسکتی تھی جو خودنوشت کے فن اور معیار پر کھری اترتی ہے، اردو کی بعض دیگر خودنوشتوں کی طرح اس میں تعلّی نہیں ہے۔ بقول ڈاکٹر قاضی عبدالستار ''اطہر صدیقی کے پاس خود پرستی اور خودستائی کے ڈھیروں مواقع تھے، لیکن وہ اس پل صراط سے اس طرح کامراں گزر گئے کہ حیرت ہوتی ہے۔لیکن چونکہ اس کی اس کی اشاعت ۲۰۰۳ء میں عمل میں آئی اور میرا موضوع ۱۹۰۱ سے ۲۰۰۰ء تک ہے۔ اسی طرح پروفیسر وارث کرمانی کی خودنوشت (گھومتی ندی) بھی اردو کی سوانحی خودنوشت میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے، گوکہ

اس میں مصنف نے خاندانی جاہ وحشمت کے بیان اور تعلّی کے اظہار میں فیاضی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کے باوجود غلام ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت، طرزِ حکومت اور ہندوستان کے اشرافیہ طبقے کا میلان و رجحان، اور شام اودھ کی رنگینیوں کا بیان اس میں موجود ہے۔ اسی طرح موصوف کے سفرِ ایران کے احوال اور وہاں کی ادبی، علمی تحریکات واشخاص کا بیان اس خودنوشت کے امتیازات ہیں جس کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، لیکن یہ کتاب بھی ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی اس لیے ہمارے دائرۂ بحث میں نہیں آتی۔

مذکورہ بالا خودنوشتوں کی بنیاد پر علی گڑھ اور غلام ہندوستان کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے کیونکہ یہ خودنوشتیں محض مصنّفین کے ذاتی کمالات، تحصیل علم کے بیانات اور حسب ونسب کی تفاصیل پر ہی مشتمل نہیں بلکہ تاریخی ،تہذیبی، ثقافتی، سماجی اور اقتصادی احوال پر مبنی ہیں، جن کا مطالعہ ہندستان کی تاریخ کی تفہیم اور تحریک آزادی سے واقفیت میں معاون ہوگا۔ تاریخ کے طلبا ہی نہیں اساتذہ کے لیے بھی ان خودنوشتوں کا مطالعہ بہت سے افادی پہلو رکھتا ہے۔ ان سے کوئی بھی مورخ صرفِ نظر نہیں کرسکتا کیونکہ ان میں بہت سے تاریخی حقائق محفوظ ہیں۔

خطوط نگاری بھی فرزندان علی گڑھ کی پسندیدہ صنف رہی ہے۔ عربی وفارسی کے الفاظ سے گریز، مرصع مقفّیٰ مسجع اسلوب سے عاری سادہ عام فہم، سہل انداز بیان کو مروج کرنے میں علی گڑھ بالخصوص سرسید اور رفقائے سرسید کی کوششوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہی اسلوب اور زبان وبیان کا عام فہم استعمال علی گڑھ سے وابستہ افراد کے خطوط میں دیکھا جاسکتا ہے۔ سرسید کی سہل نگاری، غالب کی مکالمہ نگاری، گفتگو کا بے تکلف انداز اور ابوالکلام آزاد کی علمیت کی آمیزش فرزندان علی گڑھ کے مکاتیب کے نمایاں اوصاف ہیں۔

سرسید احمد خاں (خطوطِ سرسید)، رشید احمد صدیقی کے خطوط (مرتب آل احمد سرور)، مکاتیب سرور (مرتب انجینئر وارث رفیع)، مکتوبات ماجدی (مرتب ڈاکٹر ہاشم قدوائی)، سخن دلنواز (خواجہ غلام السیدین مرتب ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی)، زیرلب (صفیہ اختر)، مکاتیب احسن مارہروی (مرتبین: ڈاکٹر عنوان چشتی، صغیر احسنی جلال آبادی)، خاموش آواز (جاں نثار اختر) اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے خطوط قابل ذکر ہیں۔ علی گڑھ سے متعلق مکتوب نگاری کی فہرست کافی طویل ہوسکتی ہے لیکن یہاں صرف انھیں مکتوب نگاروں اور ان کے

مکاتیب کو شامل کیا گیا ہے، جن کے خطوط فن کے معیار پر کھرے اترتے ہیں۔

بیسویں صدی میں علی گڑھ کے سوانح نگاروں کی تعداد طویل نہیں۔ چند اصحاب نے ہی اس جانب توجہ دی، گو کہ شبلی نعمانی اور مولانا حالی علی گڑھ کے نمائندہ سوانح نگار ہیں۔ ان دونوں حضرات نے سوانح کے فن کو اپنے قلم سے وہ معراج بخشا کہ یہ صنف بھی اردو ادب کی دیگر اصناف میں قابل اعتبار ٹھہری۔ ان دونوں حضرات سے تحریک پا کر بہتوں نے سوانح نگاری کے فن میں طبع آزمائی کی۔ حیات جاوید (مولانا الطاف حسین حالی)، حیات آفتاب، حیات محسن، حیات مولوی سمیع اللہ وغیرہ جیسی اعلیٰ پائے کی خونوشتیں فرزندان علی گڑھ کی ہی مرہونِ منت ہیں۔

میرا یہ مقالہ چھ ابواب پر محیط ہے۔ پہلے باب میں انیسویں صدی میں غیر افسانوی نثر کے جملہ اصناف میں فرزندان علی گڑھ کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ غیر افسانوی نثر سرسید اور رفقائے سرسید کی کوشش کی بدولت عبارت آرائی، لفظی بازی گری، تصنع اور بناوٹ سے پاک ہوگئی۔ اردو ادب میں بے شمار خامیاں تھیں، جنھیں سرسید اور ان کے احباب نے دور کیا۔ اردو شعر و ادب کی اصلاح اور زبان کو سادہ عام فہم بنانے کی کوشش سرسید رفقائے سرسید کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

دوسرا باب خاکہ نگاری سے متعلق ہے۔ اس میں خاکہ نگاری کے اسلوب، فن اور تعریف کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ اور تمام نمائندہ خاکہ نگاروں کے اسلوبیاتی امتیازات و تشخصات کو واضح کیا گیا ہے۔ اور یہ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ فرزندان علی گڑھ نے خاکہ نگاری کو ایک نئی شکل اور صورت دی ہے اور روایتی خاکہ نگاری سے الگ ہٹ کر ان لوگوں نے کچھ جدتیں اور ندرتیں بھی پیدا کی ہیں۔ اس طرح خاکہ نگاری کا فن جو شاید ایک سطح پر آ کر منجمد ہو جاتا ہے، تو اسے سیال اور متحرک بنائے رکھنے میں فرزندان علی گڑھ کا اہم کردار ہے۔

تیسرے باب میں خودنوشت کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ خودنوشت کے فن اور تعریف کے حوالے سے بات کرتے ہوئے اس عہد کی نمائندہ خودنوشتوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے اور ان امتیازات کی نشاندہی کی گئی ہے جو علی گڑھ کی شناخت ہے۔ چونکہ علی گڑھ کے فارغین دنیا کے وسیع و عریض حلقوں میں پھیلے

ہوئے ہیں اور انھوں نے اپنی خودنوشتوں میں علی گڑھ میں گزارے ہوئے ایام کو زندگی کے سنہرے ایام سے تعبیر کیا ہے، ایک طرح سے یہ خودنوشتیں انھیں سنہرے ایام کی بازیافت ہیں۔ فرزندان علی گڑھ کی خودنوشتیں کچھ سیاسی نوعیت کی ہیں، کچھ سماجی، کچھ مذہبی اور کچھ ادبی نوعیت کی ہیں۔ لہٰذا سب کا جائزہ بھی اسی زاویے سے لیا گیا ہے اور ساتھ ہی ان خودنوشتوں کی قدر و قیمت کا تعین بھی کیا گیا ہے۔

چوتھا باب سوانح سے متعلق ہے، جس میں سوانح کے فن، اسلوب اور تعریف کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے اور فرزندان علی گڑھ کے ذریعے رقم کی گئی سوانحی تصانیف کا اسلوبیاتی اور تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے اور ان امتیازات کی نشاندہی کی گئی ہے جو علی گڑھ اور سرسید تحریک کے رہین منت ہیں، کیونکہ سرسید کی جاں فشانی اور قربانیوں کے طفیل ہندوستان میں مسلمانوں کی عصری تعلیم کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ سرسید چونکہ سینے میں دردمند دل رکھتے تھے اور قوم کی زبوں حالی پہ کڑھتے تھے اور ہر دم ملت کی ترقی کی فکر میں لگے رہتے تھے، مولانا حالی ان کے دست راست تھے، سید کو انھوں نے قریب سے دیکھا اور سمجھا تھا لہٰذا حالی نے ان کی سوانح ''حیات جاوید'' کے نام سے لکھی۔ ''حیات جاوید'' بابائے قوم سرسید احمد خاں کی سیرت و شخصیت اور کدوکاوش کی تفصیل سے عبارت ہے۔ اس طرح اس باب میں رفقائے سرسید کی سوانح کا بھی جائزہ لیا گیا ہے اور بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جدید ہندوستان کی تعمیر میں رفقائے سرسید کا لہو بھی شامل ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سوانح کا فن ایک مقام پر ہی ٹھہر گیا تھا، لیکن علی گڑھ کے فرزندان کی توجہ، شغف اور دلچسپی کی بدولت یہ صنف بھی ارتقائی منزلوں سے ہمکنار ہوئی۔

پانچواں باب سفرنامہ کے حوالے سے ہے۔ اس میں سفرنامہ کی تعریف، اسلوب، ہیئت اور فن کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے اور علی گڑھ سے متعلق سفرنامہ نگاروں کے سفرناموں کا اسلوبیاتی مطالعہ کیا گیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ فرزندان علی گڑھ کی شعوری کوشش اور خصوصی شغف کی بدولت اردو میں جدید طرز کے سفرنامے لکھے گئے۔ اردو زبان کے ہمہ جہتی ارتقا میں سفرناموں کا بڑا ہاتھ ہے۔ سائنسی ایجادات و اختراعات کے طفیل دنیا سکڑ کر گاؤں میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ سائنس کی دین سے فائدہ

اٹھاتے ہوئے زندگی کو معنویت سے بھرپور بنانے کے لیے، ربط ضبط بڑھانے کے لیے، بقائے باہمی کے لیے، ایک دوسرے کو سمجھنے اور تہذیبی واقتصادی رشتے استوار کرنے کے نقطۂ نظر سے لوگوں نے اسفار کیے اوران مشاہدات واحوال کو سفرنامے کی شکل میں پیش کیا۔ لہٰذا اس باب میں سفرناموں کے بنیادی نکات و محرکات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے، جو اس سے پہلے کے سفرناموں میں خال خال ہی نظر آتا ہے۔

آخری باب خطوط کے حوالے سے ہے، خطوط انکشاف ذات کا اہم ذریعہ ہیں۔ کیونکہ انسان جو راز و نیاز کی باتیں علی الاعلان نہیں کہہ پاتا اسے خطوط میں آسانی سے بیان کر دیتا ہے۔ فرزندان علی گڑھ کے خطوط ادب کا سرمایہ ہیں، لہٰذا اس باب میں ان کے خطوط کے امتیازات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ علی گڑھ سے متعلقہ افراد کے خطوط میں بناوٹ، سجاوٹ اور تصنع کے بجائے بے لاگ انداز بیان ہے، قدیم اور فرسودہ القاب و آداب کی جگہ مائی ڈیر، مکرمی، محبی ومکرمی جیسے القاب وآداب سے خطوط کا آغاز علی گڑھ کے مکاتیب کے نمایاں اوصاف ہیں اور اس نمائندہ اسلوب کے فروغ کا سہرا بھی فرزندان علی گڑھ کے سر جاتا ہے۔

اخیر میں ''ماحصل'' کے عنوان کے تحت تمام ابواب کے مباحث کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے تاکہ یہ آئندہ ہو سکے کہ بیسویں صدی میں غیر افسانوی نثر کے ارتقا میں فرزندان علی گڑھ کا کیا رول رہا ہے۔

نعمان عالم
ریسرچ اسکالر
شعبۂ اُردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۴؍ستمبر ۲۰۰۸ء

Bisween Sadi Mein Ghair Afsanavi Nasr Ke Irteqa Mein Aligarh Ka Hissa

Thesis

Submitted for the Award of the Degree of

Doctor of Philosophy

in

Urdu

Under the Supervision of
Dr. Shahabuddin (Saqib)

By
Noman Alam

DEPARTMENT OF URDU
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH (INDIA)

2008

بیسوی صدی میں غیر افسانوی نثر
کے
ارتقا میں علی گڑھ کا حصہ

مقالہ برائے

پی ایچ - ڈی (اردو)

نگراں

ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب

پیش کردہ

نعمان عالم

شعبۂ اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۰۰۸ء

T-7224

Department of Urdu
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY, ALIGARH – 202002 (INDIA)

Tel.: { **2700920, 921**
Extn. 1631

Dated:22.9.2008

Certificate

This is to certify that the Thesis for the award of Ph.D. degree entitled: " BISWEEN SADI MEIN GHAIR AFSANAVI NASR KE IRTEQA MEIN ALIGARH KA HISSA"
By Noman Alam ,is an original research work and has not been submitted for any other degree of this or any other University.
It is now forwarded for the award of Ph.D. degree in Urdu language and literature.

Counter Signature

(Prof. Khursheed Ahmad)

Chairman

Supervisor

22.9.8.

(Dr. Shahabuddin)

فہرست

مقدمہ ۳

بابِ اوّل

انیسویں صدی میں اردو نثر: ایک جائزہ ۱۳

بابِ دوم

علی گڑھ میں خاکہ نگاری کا ارتقا ۲۴

بابِ سوم

علی گڑھ میں خودنوشت نگاری کا ارتقا ۵۱

بابِ چہارم

علی گڑھ میں سوانح نگاری کا ارتقا ۱۳۳

بابِ پنجم

علی گڑھ میں سفرنامہ نگاری کا ارتقا ۱۷۶

بابِ ششم

علی گڑھ میں مکتوب نگاری کا ارتقا ۲۳۱

ماحصل ۲۷۳

مقدمه

تحقیق ایک پرخطر وادی ہے، جہاں بہتوں کے قدم متزلزل ہو جاتے ہیں۔ کسی خاص نتیجے تک رسائی یا منطقی نتائج کا استخراج بہت مشکل ہوتا ہے۔ تحقیق کو اگر اس کے مکمل مفہوم اور معنویت کے ساتھ سامنے رکھا جائے اور اس کے مطالبات کی تکمیل کی جائے تو یقیناً یہ عمل تحقیق کہلائے گا۔ پہلے زمانے کے محققین جاں گسل واقع ہوئے تھے اور انھوں نے تحقیق کی پرخطر وادیوں میں اپنے پاؤں کو لہولہان کیا تھا اور شب و روز کی تمیز کو بھلا کر متعلقہ موضوع کے تعلق سے حیرت انگیز انکشافات کیے تھے، اس لیے پہلے کی تحقیق میں تحیر کا عنصر شامل تھا، مگر آج تحقیق کی صورت بدل گئی ہے۔

میں نے اپنا موضوعِ تحقیق منتخب کرتے وقت یہ پیش نظر رکھا تھا کہ کسی نئے زاویے کی جستجو کی جائے اور عام تحقیقی روش سے ہٹ کر ایک نئے انداز پر ایک نئے انداز کا کام کیا جائے، اس لیے میں نے شخصیت اور فن کے بجائے ایک ایسے موضوع کا انتخاب کیا جس کا دائرہ بھی وسیع تھا اور جس میں کچھ نئے نتائج کے استخراج کا امکان بھی۔ نہایت فرسودہ قسم کے موضوع سے الگ ہٹ کر میں نے اپنے تجسس اور تفحص کی تسکین کے لیے ''بیسویں صدی میں غیر افسانوی نثر کے ارتقا میں علی گڑھ کا حصہ'' کا انتخاب کیا تھا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ موضوع نہایت محنت، مشقت اور مغز ماری کا متقاضی ہے۔ جب میں نے اس موضوع کی تمام جہتوں کا احاطہ کیا تو محسوس ہوا کہ یہ تو بڑا ہی دشوار طلب اور حوصلہ آزما کام ہے۔ چونکہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایک عظیم دانش گاہ ہے، جس کے فرزند معنوی پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ علم و ادب کا ایک مرکز ہونے کے ناطے یہاں

کے طلبا میں علمی ادبی ذوق بھی رہا ہے، چاہے وہ کسی بھی شعبے سے وابستہ ہوں، کسی بھی پیشے سے تعلق رکھتے ہوں، مگران کے اندر بے پناہ ادبی ذوق بھی ہے اوراس کی تکمیل کے لیے اکثر لوگ مقالات، مضامین بالخصوص سفرنامے، خاکے اور خودنوشت لکھتے رہے ہیں۔ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے فرزندان علی گڑھ کی تخلیقی سرگرمیوں کا مکمل احاطہ کرنا دشوار کام تھا، پھر بھی میں نے کوشش کی ہے کہ اپنے موضوع سے متعلق تمام چیزیں اکٹھی کرلوں تاکہ کوئی بھی پہلو تشنہ نہ رہ جائے، چنانچہ اس تحقیقی سفر کے دوران بہت سے مسائل اور مصائب سے گزرتے ہوئے میں نے اس علمی تخلیقی سرمائے کی جستجو میں کامیابی حاصل کی اور اپنے موضوع سے متعلقہ مواد کے حصول میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں برتی، پھر بھی امکان ہے کہ بہت سے نام چھوٹ گئے ہوں گے اور بہت سی کتابیں رہ گئی ہوں گی، کیونکہ علی گڑھ سے وابستہ افراد کی ایک بڑی تعداد ہے جن کے بارے میں فرداً فرداً معلومات حاصل کرنا مشکل ہے۔ بہرحال میں نے جس تحقیقی موضوع کا انتخاب کیا ہے اس کے دائرے میں بہت سی اہم ہستیاں اور افراد آتے ہیں جنھوں نے اردو ادب کے تخلیقی سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہی نہیں کیے، بلکہ بعض نئی جہتیں بھی پیدا کیں، اور بعض نئی بنیادیں بھی تعمیر کیں۔

خاکہ، خودنوشت، سوانح، خطوط اور سفرنامے کے حوالے سے وابستہ افراد کا کارنامہ اتنا اہم ہے کہ ہر ایک پر اگر تفصیل سے لکھا جائے تو ہر باب ایک ضخیم کتاب کی شکل اختیار کرلے گا۔ ان جملہ اصناف میں فرزندان علی گڑھ نے نہ صرف یہ کہ اپنی تخلیقی قوتوں کا بھرپور استعمال کیا بلکہ اس کے روایتی فریم اور حدود میں بھی وسعت پیدا کی اور نئے رنگ و نور پیدا کیے اور اسی طرح ان تمام اصناف میں علی گڑھ کی خدمات نہ صرف مسلم ہیں بلکہ اس اعتبار سے بھی قابل لحاظ ہیں کہ ان اصناف کو نئی وسعتیں اور نئے امکانات میسر آئے ہیں۔ ان تمام اصناف میں فرزندان علی گڑھ کی بیش بہا خدمات رہی ہیں جو کئی دہائیوں پر محیط ہیں۔ خاکہ کے تعلق سے بات کی جائے تو مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، آغا حیدر حسن، خواجہ غلام السیدین، شاہد احمد دہلوی، جلیل قدوائی، مولانا عبدالماجد دریابادی، اعجاز حسین، غلام فرقت کاکوروی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، معین الدین دردائی، ڈاکٹر خلیق الرحمٰن اعظمی، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، سید حامد، حمیدہ اختر حسین اور اختر الواسع وغیرہ ایسے نام ہیں جنھوں نے اردو خاکہ نگاری کی توسیع میں اہم کردار ادا کیے۔ علی گڑھ کے خاکہ

نگاروں کا امتیاز یہ ہے کہ وہ ویلوز اور اقدار کو نظر انداز نہیں کرتے، وہ اخلاقی اقدار وصفات کا بھی ذکر کر دیتے ہیں تا کہ موضوع کی سیرت وصورت کا واضح نقش سامنے آجائے۔ مولوی عبدالحق اور رشید احمد صدیقی خاکہ نگاری کے دو ایسے نام ہیں جو اس صنف میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نام دیو مالی (مولوی عبدالحق)، کندن (رشید احمد صدیقی) یہ دونوں ایسے خاکے ہیں جن سے تحریک پا کر خاکہ نگار عام انسانوں کو بھی خاکہ کا موضوع بنانے لگے۔ نام دیو مالی کو باغ کے پھولوں، پودوں سے پیار محبت اور ایسی انسیت ہوگئی کہ نام دیو ہمیشہ اس کی تراش خراش میں مگن اور اس کی دیکھ ریکھ میں محو رہتا۔ محنت اور ایمان داری سے باغ کی دیکھ بھال میں لگا رہتا۔ یہی محنت، ایمانداری اور اپنا پن کے احساس نے مولوی عبدالحق کے ذہن پر دیو مالی کی عظمت کو نقش کر دیا۔ اسی طرح کندن جو آرٹس فیکلٹی میں گھنٹہ بجاتا تھا اور وہ گھنٹہ بجانے کے وقت کا اتنا پابند تھا کہ لوگ اس کے بجانے سے وقت کا تعین کرتے۔ وقت کی پابندی ہی انسان کو بڑا بناتی ہے۔ کندن کی اس خوبی نے رشید صاحب کو اس کا خاکہ لکھنے پر مجبور کیا۔

سفرنامے کے تعلق سے بات کی جائے تو سب سے پہلے علی گڑھ کے سفرنامہ نگاروں میں سرسید احمد خاں کا نام آتا ہے۔ جن کا سفرنامہ ''مسافران لندن'' کے نام سے مجلس ترقی ادب لاہور سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ سرسید کی اس کوشش سے تحریک پا کر محمد اسماعیل پانی پتی ''مسافران لندن''، کنور عبدالغفور خاں ''سفرنامۂ عالم''، حاجی مولوی محمد اسحاق خاں مائل ''سفرنامۂ مائل''، راحل شیروانیہ بنت حاجی محمد عیسیٰ خاں شیروانی رئیس دتاولی علی گڑھ ''زادالسبیل''، ''رحلۃ الراحل''، مولانا عبدالماجد دریابادی ''سفر حجاز''، ''سفرنامہ لاہور''، ''ڈھائی ہفتے پاکستان میں'' اور ''سیاحت ماجدی''، خواجہ غلام ''روزنامچہ سیاحت''، خواجہ احمد عباس ''مسافر کی ڈائری''، قرۃ العین حیدر ''جہان دیگر'' اور ''دکھلائیے لے جا کے اسے مصر کا بازار''، ڈاکٹر عابد حسین ''رہ نورد شوق''، خواجہ غلام السیدین ''دنیا میرا گاؤں''، پروفیسر ثریا حسین ''پیرس و پارس''، حکیم سید ظل الرحمٰن ''ایران نامہ'' نے اور پروفیسر حافظ شائق محمد یحییٰ ''جہان دیگر'' سفر کے احوال، مشاہدات اور تجربات کو کتابی شکل پیش کیا۔

اسی طرح خودنوشت بھی فرزندان علی گڑھ کی محبوب صنف رہی ہے۔ تقریباً اردو میں پچاس سے زائد خودنوشتیں ہیں جو علی گڑھ کی دین ہیں۔ یہ خودنوشتیں علی گڑھ کی روشن تہذیب، تابناک تاریخ، خوشگوار ماضی اور

تحریک آزادی کی داستان کی امین ہیں۔ کیونکہ علی گڑھ محض دانش گاہ ہی نہیں بلکہ تہذیب وثقافت کا گہوارہ اور علم وفن کا منبع رہا ہے، وہاں کی تحریکی تربیت اور تعمیری سوچ نے مادر ہند کو ایسے سپوت دیے جن کی اولوالعزمی اور ثابت قدمی نے فرنگیوں کے ایوان اقتدار میں زلزلہ پیدا کر دیا۔ اس اعتبار سے فرزندان علی گڑھ میں مولانا حسرت موہانی کا نام نہایت بلند ہے، جنھوں نے پہلی بار ہندوستان کی مکمل آزادی کا مطالبہ انگریزوں سے کیا اور جسے پنڈت جواہر لال نہرو نے سراہا بھی۔

آشفتہ بیانی میری (رشید احمد صدیقی)، یادوں کی دنیا (یوسف حسین خاں)، یادوں کی برات (جوش ملیح آبادی)، مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں (خواجہ غلام السیدین)، ہم ساتھ تھے (حمیدہ سالم)، خواب باقی ہیں (آل احمد سرور)، جواب دوست (نسیم انصاری)، حیات مستعار (جلیل قدوائی)، ورود مسعود (مسعود حسین خاں)، گفتنی ناگفتنی (وامق جونپوری)، اس آباد خرابے میں (اختر الایمان)، برگ گل (مقبول احمد)، اعمال نامہ (سر رضا علی عابدی)، خوں بہا (حکیم احمد شجاع)، یاد ایام (نواب سعید چھتاری)، جو کہا نہیں گیا (کسم انسل)، گرد راہ (اختر حسین رائے پوری)، شاہراہ پاکستان (چودھری خلیق الزماں)، شورش دوراں (حمیدہ سالم)، زرگذشت (مشتاق احمد یوسفی) ایسی خودنوشتیں ہیں جن میں علی گڑھ کا خوشگوار ماضی پوری طرح سانسیں لیتا نظر آتا ہے۔ اس فہرست میں پروفیسر اطہر صدیقی کی خودنوشت ''میں کیا میری حیات کیا'' بھی شامل ہو سکتی تھی جو خودنوشت کے فن اور معیار پر کھری اترتی ہے، اردو کی بعض دیگر خودنوشتوں کی طرح اس میں تعلّی نہیں ہے۔ بقول ڈاکٹر قاضی عبدالستار ''اطہر صدیقی کے پاس خود پرستی اور خودستائی کے ڈھیروں مواقع تھے، لیکن وہ اس پل صراط سے اس طرح کامراں گزر گئے کہ حیرت ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ اس کی اس کی اشاعت ۲۰۰۳ء میں عمل میں آئی اور میرا موضوع ۱۹۰۱ سے ۲۰۰۰ء تک ہے۔ اسی طرح پروفیسر وارث کرمانی کی خودنوشت (گھومتی ندی) بھی اردو کی سوانحی خودنوشت میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے، گو کہ اس میں مصنف نے خاندانی جاہ وحشمت کے بیان اور تعلّی کے اظہار میں فیاضی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کے باوجود غلام ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت، طرز حکومت اور ہندوستان کے اشرافیہ طبقے کا میلان ورجحان، اور شام اودھ کی رنگینیوں کا بیان اس میں موجود ہے۔ اسی طرح موصوف کے سفر ایران کے احوال

اور وہاں کی ادبی، علمی تحریکات واشخاص کا بیان اس خودنوشت کے امتیازات ہیں جس کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، لیکن یہ کتاب بھی ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی اس لیے ہمارے دائرۂ بحث میں نہیں آتی۔

مذکورہ بالا خودنوشتوں کی بنیاد پر علی گڑھ اور غلام ہندوستان کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے کیونکہ یہ خودنوشتیں محض مصنّفین کے ذاتی کمالات، تحصیل علم کے بیانات اور حسب ونسب کی تفاصیل پر ہی مشتمل نہیں بلکہ تاریخی ،تہذیبی، ثقافتی، سماجی اور اقتصادی احوال پر مبنی ہیں، جن کا مطالعہ ہندستان کی تاریخ کی تفہیم اور تحریک آزادی سے واقفیت میں معاون ہوگا۔ تاریخ کے طلبا ہی نہیں اساتذہ کے لیے بھی ان خودنوشتوں کا مطالعہ بہت سے افادی پہلو رکھتا ہے۔ ان سے کوئی بھی مورخ صرفِ نظر نہیں کرسکتا کیونکہ ان میں بہت سے تاریخی حقائق محفوظ ہیں۔

خطوط نگاری بھی فرزندان علی گڑھ کی پسندیدہ صنف رہی ہے۔ عربی وفارسی کے الفاظ سے گریز، مرصع مقفّیٰ مسجع اسلوب سے عاری سادہ عام فہم، سہل انداز بیان کو مروج کرنے میں علی گڑھ بالخصوص سرسید اور رفقائے سرسید کی کوششوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہی اسلوب اور زبان و بیان کا عام فہم استعمال علی گڑھ سے وابستہ افراد کے خطوط میں دیکھا جاسکتا ہے۔ سرسید کی سہل نگاری، غالب کی مکالمہ نگاری، گفتگو کا بے تکلف انداز اور ابوالکلام آزاد کی علمیت کی آمیزش فرزندان علی گڑھ کے مکاتیب کے نمایاں اوصاف ہیں۔

سرسید احمد خاں (خطوطِ سرسید)، رشید احمد صدیقی کے خطوط (مرتب آل احمد سرور)، مکاتیب سرور (مرتب انجینئر وارث رفیع)، مکتوبات ماجدی (مرتب ڈاکٹر ہاشم قدوائی)، سخن دلنواز (خواجہ غلام السیدین مرتب ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی)، زیرلب (صفیہ اختر)، مکاتیب احسن مارہروی (مرتبین: ڈاکٹر عنوان چشتی، صغیر احسنی جلال آبادی)، خاموش آواز (جاں نثار اختر) اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے خطوط قابل ذکر ہیں۔ علی گڑھ سے متعلق مکتوب نگاری کی فہرست کافی طویل ہوسکتی ہے لیکن یہاں صرف انھیں مکتوب نگاروں اور ان کے مکاتیب کو شامل کیا گیا ہے، جن کے خطوط فن کے معیار پر کھرے اترتے ہیں۔

بیسویں صدی میں علی گڑھ کے سوانح نگاروں کی تعداد طویل نہیں۔ چند اصحاب نے ہی اس جانب توجہ دی، گو کہ شبلی نعمانی اور مولانا حالی علی گڑھ کے نمائندہ سوانح نگار ہیں۔ ان دونوں حضرات نے سوانح کے فن کو اپنے قلم سے وہ معراج بخشا کہ یہ صنف بھی اردو ادب کی دیگر اصناف میں قابل اعتبار ٹھہری۔ ان دونوں

حضرات سے تحریک پا کر بہتوں نے سوانح نگاری کے فن میں طبع آزمائی کی۔ حیات جاوید (مولانا الطاف حسین حالی)، حیات آفتاب، حیات محسن، حیات مولوی سمیع اللہ وغیرہ جیسی اعلیٰ پائے کی خونوشتیں فرزندان علی گڑھ کی ہی مرہونِ منت ہیں۔

میرا یہ مقالہ چھ ابواب پر محیط ہے۔ پہلے باب میں انیسویں صدی میں غیر افسانوی نثر کے جملہ اصناف میں فرزندان علی گڑھ کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ غیر افسانوی نثر سرسید اور رفقائے سرسید کی کوشش کی بدولت عبارت آرائی، لفظی بازی گری، تصنع اور بناوٹ سے پاک ہوگئی۔ اردو ادب میں بے شمار خامیاں تھیں، جنھیں سرسید اور ان کے احباب نے دور کیا۔ اردو شعر و ادب کی اصلاح اور زبان کو سادہ عام فہم بنانے کی کوشش سرسید رفقائے سرسید کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

دوسرا باب خاکہ نگاری سے متعلق ہے۔ اس میں خاکہ نگاری کے اسلوب، فن اور تعریف کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ اور تمام نمائندہ خاکہ نگاروں کے اسلوبیاتی امتیازات و تشخصات کو واضح کیا گیا ہے۔ اور یہ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ فرزندان علی گڑھ نے خاکہ نگاری کو ایک نئی شکل اور صورت دی ہے اور روایتی خاکہ نگاری سے الگ ہٹ کر ان لوگوں نے کچھ جدتیں اور ندرتیں بھی پیدا کی ہیں۔ اس طرح خاکہ نگاری کا فن جو شاید ایک سطح پر آ کر منجمد ہو جاتا ہے، تو اسے سیال اور متحرک بنائے رکھنے میں فرزندان علی گڑھ کا اہم کردار ہے۔

تیسرے باب میں خودنوشت کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ خودنوشت کے فن اور تعریف کے حوالے سے بات کرتے ہوئے اس عہد کی نمائندہ خودنوشتوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے اور ان امتیازات کی نشاندہی کی گئی ہے جو علی گڑھ کی شناخت ہے۔ چونکہ علی گڑھ کے فارغین دنیا کے وسیع و عریض حلقوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور انھوں نے اپنی خودنوشتوں میں علی گڑھ میں گزارے ہوئے ایام کو زندگی کے سنہرے ایام سے تعبیر کیا ہے، ایک طرح سے یہ خودنوشتیں انھیں سنہرے ایام کی بازیافت ہیں۔ فرزندان علی گڑھ کی خودنوشتیں کچھ سیاسی نوعیت کی ہیں، کچھ سماجی، کچھ مذہبی اور کچھ ادبی نوعیت کی ہیں۔ لہٰذا سب کا جائزہ بھی اسی زاویے سے لیا گیا ہے اور ساتھ ہی ان خودنوشتوں کی قدر و قیمت کا تعین بھی کیا گیا ہے۔

چوتھا باب سوانح سے متعلق ہے، جس میں سوانح کے فن، اسلوب اور تعریف کے حوالے سے گفتگو کی

گئی ہے اور فرزندان علی گڑھ کے ذریعے رقم کی گئی سوانحی تصانیف کا اسلوبیاتی اور تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے اور ان امتیازات کی نشاندہی کی گئی ہے جو علی گڑھ اور سرسید تحریک کے رہین منت ہیں، کیونکہ سرسید کی جاں فشانی اور قربانیوں کے طفیل ہندوستان میں مسلمانوں کی عصری تعلیم کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ سرسید چونکہ سینے میں دردمند دل رکھتے تھے اور قوم کی زبوں حالی پہ کڑھتے تھے اور ہر دم ملت کی ترقی کی فکر میں لگے رہتے تھے، مولانا حالی ان کے دست راست تھے، سید کو انھوں نے قریب سے دیکھا اور سمجھا تھا لہٰذا حالی نے ان کی سوانح ''حیات جاوید'' کے نام سے لکھی۔ ''حیات جاوید'' بابائے قوم سرسید احمد خاں کی سیرت و شخصیت اور کدوکاوش کی تفصیل سے عبارت ہے۔ اس طرح اس باب میں رفقائے سرسید کی سوانح کا بھی جائزہ لیا گیا ہے اور بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جدید ہندوستان کی تعمیر میں رفقائے سرسید کا لہو بھی شامل ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سوانح کا فن ایک مقام پر ہی ٹھہر گیا تھا، لیکن علی گڑھ کے فرزندان کی توجہ، شغف اور دلچسپی کی بدولت یہ صنف بھی ارتقائی منزلوں سے ہمکنار ہوئی۔

پانچواں باب سفرنامہ کے حوالے سے ہے۔ اس میں سفرنامہ کی تعریف، اسلوب، ہیئت اور فن کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے اور علی گڑھ سے متعلق سفرنامہ نگاروں کے سفرناموں کا اسلوبیاتی مطالعہ کیا گیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ فرزندان علی گڑھ کی شعوری کوشش اور خصوصی شغف کی بدولت اردو میں جدید طرز کے سفرنامے لکھے گئے۔ اردو زبان کے ہمہ جہتی ارتقا میں سفرناموں کا بڑا ہاتھ ہے۔ سائنسی ایجادات و اختراعات کے طفیل دنیا سکڑ کر گاؤں میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ سائنس کی دین سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زندگی کو معنویت سے بھرپور بنانے کے لیے، ربط ضبط بڑھانے کے لیے، بقائے باہمی کے لیے، ایک دوسرے کو سمجھنے اور تہذیبی و اقتصادی رشتے استوار کرنے کے نقطۂ نظر سے لوگوں نے اسفار کیے اور ان مشاہدات و احوال کو سفرنامے کی شکل میں پیش کیا۔ لہٰذا اس باب میں سفرناموں کے بنیادی نکات و محرکات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے، جو اس سے پہلے کے سفرناموں میں خال خال ہی نظر آتا ہے۔

آخری باب خطوط کے حوالے سے ہے، خطوط انکشاف ذات کا اہم ذریعہ ہیں۔ کیونکہ انسان جو راز و نیاز کی باتیں علی الاعلان نہیں کہہ پاتا اسے خطوط میں آسانی سے بیان کر دیتا ہے۔ فرزندان علی گڑھ کے خطوط

ادب کا سرمایہ ہیں، لہٰذا اس باب میں ان کے خطوط کے امتیازات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ علی گڑھ سے متعلقہ افراد کے خطوط میں بناوٹ، سجاوٹ اور تصنع کے بجائے بے لاگ انداز بیان ہے، قدیم اور فرسودہ القاب وآداب کی جگہ مائی ڈیر، مکرمی، محبی ومکرمی جیسے القاب وآداب سے خطوط کا آغاز علی گڑھ کے مکاتیب کے نمایاں اوصاف ہیں اور اس نمائندہ اسلوب کے فروغ کا سہرا بھی فرزندان علی گڑھ کے سر جاتا ہے۔

اخیر میں ''ماحصل'' کے عنوان کے تحت تمام ابواب کے مباحث کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے تاکہ یہ آئندہ ہو سکے کہ بیسویں صدی میں غیر افسانوی نثر کے ارتقا میں فرزندان علی گڑھ کا کیا رول رہا ہے۔

میں اپنے مشفق استاد پروفیسر اصغر عباس صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس موضوع کا نہ صرف انتخاب میرے لیے کیا بلکہ موضوع سے متعلق گراں قدر مشوروں سے نواز کر بہت حد تک میری کلفتیں دور کر دیں۔

استاد محترم جناب ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب کی نگرانی میں یہ مقالہ تکمیل کو پہنچا۔ ایک نگراں کے علاوہ انھوں نے متفکر سرپرست اور شفیق مربی کا بھی حق ادا کر دیا اور اپنی ذاتی کتب مرحمت فرما کر مجھے بہت سی انجانی اذیتوں اور نادیدہ پریشانیوں سے محفوظ رکھا۔

اساتذہ کرام میں پروفیسر ابوالکلام قاسمی (ڈین فیکلٹی آف آرٹس)، صدر شعبہ اردو پروفیسر خورشید احمد، پروفیسر طارق چھتاری، ڈاکٹر محمد علی جوہر، ڈاکٹر راشد انور راشد، ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی، ڈاکٹر خالد سیف اللہ، ڈاکٹر سلطان احمد، جناب امتیاز احمد کا شکریہ کہ ان کے گراں قدر مشورے میرے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے۔

سمینار لائبریری (شعبۂ اردو، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی) کے مہتمم جناب سہیل احمد اور مولانا آزاد لائبریری کے اردو سیکشن میں باقر صاحب، محسن صاحب اور ڈاکٹر شائستہ خان میں کتابوں کی فراہمی کے سلسلے میں میری معاونت کی لہٰذا میں ان سب کا تہِ دل سے ممنون و متشکر ہوں۔

برادرم حقانی القاسمی صاحب کا شکریہ کہ انھوں نے مجھے اپنی ذاتی لائبریری کے استعمال کی آزادی دے دی اور بہت سی نجی کتابیں اور رسائل بھی مجھے مرحمت کیے۔ انھوں نے گاہے گاہے اپنے قیمتی مشوروں کے علاوہ ان مآخذ ومصادر کے حصول میں ہماری رہنمائی کی جو ہمارے وہم وگمان سے پرے تھے۔ بھابھی نزہت ناز کا بھی شکریہ جن کے اس جملے سے مجھے ہمیشہ تحریک ملتی رہی کہ ''اب کتنا کام باقی ہے؟'' برادران خورد

سلمان اختر، عمران اختر، مسعود عالم، مجاہد انور اور شاہنواز احمد کا شکریہ جو میرے مقالے کی جلد از جلد تکمیل چاہتے تھے۔ شریک حیات سفانہ تبسم کا شکریہ جو اکثر کہا کرتی ''جلد از جلد پی ایچ ڈی مکمل کیجیے۔''

اس مقالے کی تکمیل میں بہت سے احباب کی محبتیں اور ان کے دل کی دھڑکنیں شامل ہیں، جن میں انتخاب عالم (بابا)، محمد ارشد، ڈاکٹر ذوالفقار مدنی، معید الرحمٰن، محبوب الٰہی، فاخرہ یٰسین، شاہ عالم، یامین انصاری، ڈاکٹر عطا بن فطرت، ڈاکٹر قمر تبریز صدیقی، سید محمد کامران، نعمان ظفر محمد قیصر، خان محمد منصور، محمد ثاقب، محمد فیروز، محمد فاروق، وحید الحق، محمد سالم، محمد عمر، آفتاب عالم نجمی، نوید انجم، محمد ہارون، بھابھی ماریہ ہارون، بکر اے صدیقی ابو مسعود، محمد اصغر، شہزاد احمد خان، حیدر علی خان، نوازش مہدی، فرمان چودھری، عادل رشید، مرزا اعجاز بیگ (نائب صدر چھتیس گڑھ اردو اکادمی) اور سب سے آخر میں صدیق مکرم ہمدم دیرینہ جناب امتیاز احمد انصاری (سکریٹری چھتیس گڑھ اردو اکادمی، رائے پور) کا شکریہ، جو میری پی ایچ ڈی کی تکمیل کے لیے متفکر رہا کرتے اور کہا کرتے، پی ایچ ڈی کب مکمل ہوگی۔ احباب میں وسیم شمسی اور محمد اسلام خان کا شکریہ جنھوں نے کمپوزنگ میں خصوصی دلچسپی لی اور میرے مقالے کے اس طویل سفر کو اختتام تک پہنچایا۔

میں اپنے والدین (جناب محمد الیاس صاحب، مرحومہ شمیمہ خاتون صاحبہ) کا شکریہ نہیں ادا کر سکتا کیونکہ میرا وجود ان کے احسان سے گراں بار ہے۔ ان کی دعائیں ہمیشہ سائے کی طرح میرے ہمراہ رہیں اور میری محافظت کا فریضہ انجام دے رہی ہیں۔ خاص طور پر مرحومہ والدہ محترمہ میری پی ایچ ڈی کی تکمیل اپنی حیات میں ہی چاہتی تھیں، لیکن کاتب تقدیر کو یہ منظور نہیں تھا۔ اگر وہ آج باحیات ہوتیں تو انھیں بے انتہا مسرت ہوتی۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو روشنی سے بھر دے اور جنت الفردوس میں چین و سکون عطا فرمائے، آمین!!

نعمان عالم

ریسرچ اسکالر

شعبۂ اُردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۴ر ستمبر ۲۰۰۸ء

بابِ اوّل

انیسویں صدی میں اُردو نثر: ایک جائزہ

انیسویں صدی میں غیر افسانوی نثر کی کائنات فورٹ ولیم کالج کی داستانیں سرسید کی سادہ اور عام فہم تحریریں اور غالب کے خطوط تک محدود تھی۔ فورٹ ولیم کالج میں اردو کے مصنّفین ومترجمین تنخواہ پر تراجم، تصانیف وتالیف کے لیے مامور کیے گئے تھے، جن کا مقصد ہندوستان کی آسان اور عام فہم بول چال کی زبان میں تحریر کرنا تھا۔ کالج کے قیام کا اصل مقصد نو وارد انگریز افسران کو ہندوستان کی زبان کے ساتھ تہذیب وثقافت سے روشناس کرانا تھا اس لیے زیادہ تر داستانوں کے ترجمے کرائے گئے۔ داستان ہندوستان کی تہذیب وثقافت کا امین ہے، فورٹ ولیم کالج کی تمام داستانوں میں میر امن کی باغ وبہار کو جو شہرت عام نصیب ہوئی وہ کسی اور داستان کو شاید ہی حاصل ہوئی ہو۔ اس مقبولیت کی اصل وجہ باغ وبہار کی سادگی اور بول چال کی زبان ہے۔ چونکہ جان گلکرسٹ نے میر امن کو ہدایت دی کہ:

> ''اس قصے کو ٹیٹھ ہندوستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بچے، خاص و عام آپس میں بولتے ہیں ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسے اسی محاورے سے لکھنا شروع کیا ہے جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔'' [1]

خطوط غالب اور فورٹ ولیم کالج سے قبل کی داستان اور نثر کی کتابوں پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے ان میں عربی وفارسی کے پرشکوہ الفاظ اور گنجلک انداز بیان اختیار کیا گیا تھا۔

[1] تاریخ ادب اردو، پروفیسر نورالحسن نقوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۶، ص ۲۶۷

مقفّیٰ و مسجع عبارتیں لکھنے کا رجحان عام تھا۔ قصہ چہار درویش کو تحسین ''نوطرز مرصع'' کے نام سے اردو میں منتقل کر چکے تھے، لیکن اس کی زبان مشکل اور فارسی آمیز تھی۔ زبان زیادہ تر مقفّیٰ تھی، اس لیے اس کا سمجھنا دشوار تھا۔

غالب نے مروجہ اسلوب سے ہٹ کر آسان اور عام بول چال کی زبان میں اپنے دوست احباب اور شاگردوں کو خطوط لکھے۔ فرسودہ القاب و آداب کے بجائے بے تکلف انداز اپنایا۔ بے تکلفی، برجستگی ان کے خطوط کے امتیازات میں داخل ہیں۔ ہزار ہزار کوس سے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو کا اسلوب ان کے تمام خطوط میں نمایاں ہے۔

میری مہدی مجروح کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''واہ واہ! سید صاحب! تم بڑی بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے۔'' [1]

''سید صاحب! نہ تم مجرم، نہ میں گنہ گار، تم مجبور، میں ناچار۔'' [2]

''میر مہدی! جیتے رہو۔ آفریں آفریں صد ہزار آفریں۔'' [3]

''جان غالب! تمہارا خط پہنچا، تمہارا خط پہنچا، غزل اصلاح کے بعد پہنچتی ہے وہ ہر اک سے پوچھتا ہوں وہ کہاں ہیں۔'' [4]

''آیئے جناب! میر مہدی صاحب دہلوی! بہت دنوں میں آئے کہاں تھے؟ بارے آپ کا مزاج خوش ہے؟ میر سرفراز حسین صاحب اچھی طرح ہیں؟ مہدی صاحب! خوش ہیں؟'' [5]

''مرزا حاتم علی مہر کے نام لکھتے ہیں: بندہ پرور! فقیر شکوے سے برا نہیں مانتا، مگر شکوے کے فن کو سوائے کوئی نہیں جانتا۔'' [6]

''مرزا علاء الدین احمد خاں علائی کے نام لکھتے ہیں۔ مولانا نسیمی! کیوں خفا ہوتے ہو؟''

---

[1] انتخاب خطوط غالب، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۹۵، ص ۵

[2] انتخاب خطوط غالب، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۹۵، ص ۶

[3] (انتخاب خطوط غالب، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۹۵، ص ۸

[4] انتخاب خطوط غالب، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۹۵، ص ۱۴

[5] انتخاب خطوط غالب، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۹۵، ص ۱۷

[6] انتخاب خطوط غالب، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۹۵، ص ۳۲

ہمیشہ سے اسلاف واخلاف ہوتے چلے آئے ہیں۔ اگر نیز خلیفہ اوّل ہے، تم خلیفہ ثانی ہو، اس کو عمر میں تم پر تقدم زمانی ہے۔ جانشین دونوں، مگر ایک اوّل ہے اور ایک ثانی ہے۔ [1]

قاضی عبدالجلیل جنون کے نام خط میں پیرومرشد فقیر ہمیشہ آپ کی خدمت گزاری میں حاضر اور غیر قاصر رہا ہے، جو حکم ہوتا ہے اس کو بجالاتا ہوں، مگر معدوم کو موجودہ کرنا میری وسع قدرت سے باہر ہے۔ [2]

غالب کے خطوط سے تحریک پاکر سرسید احمد خاں نے اردو زبان وادب کی طرف توجہ دی۔ اگر غالب کے خطوط نہ ہوتے تو سرسید کے مضامین بھی نہ ہوتے۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے خیال میں: ''خاکم بدہن! اگر دیوان غالب نہ ہوتا اور صرف خطوط غالب ہوتے تو بھی غالب غالب ہی رہتے۔''

غالب کے خطوط کی دلکشی کا اصل راز یہ ہے کہ انھوں نے خط کے مروجہ اسلوب والقاب کو خیر باد کہہ سادہ اور عام فہم اسلوب وضع کیا۔ چونکہ غالب کی فطرت میں بغاوت اور اس کے خمیر میں انفرادیت تھی، معاملہ شاعری کا ہو یا مکتوب نگاری کا، غالب نے دونوں میں تقلید اور تتبع کو کسر شان سمجھا۔

اردو نثر میں سادہ اور عام فہم اسلوب کے فروغ میں سرسید اور ان کے رفقا کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں اردو نثر کی ترقی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور یہی دور ہے رفقائے سید کا جس میں نواب الحسن الملک، مولوی چراغ علی، نذیر احمد، شبلی نعمانی، مولانا حالی اور مولوی ذکاءاللہ وغیرہ نے اپنے خون جگر سے اردو زبان وادب کی آبیاری کی۔ ان لوگوں کے انہماک، شغف اور توجہ کے طفیل اردو زبان کی دنیا معانی ومفاہیم، اسلوب، ہیئت اور فن کے اعتبار سے یکسر بدل گئی۔ اس سے پہلے جو ادب تفریح طبع اور وقت گزاری کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، اب سرسید اور رفقائے سرسید کی شعوری کوششوں سے مقصد کے فروغ اور اصلاح کا ذریعہ بن گیا۔ اردو ادب میں بے شمار خامیاں تھیں، جنھیں سرسید نے دور کیا۔ اردو شعر وادب کی اصلاح سرسید کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ یہ سرسید کی کوششوں کا ہی نتیجہ تھا

[1] انتخاب خطوط غالب، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۹۵ء، ص ۴۰

[2] انتخاب خطوط غالب، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۹۵ء، ص ۴۷

کہ دیکھتے ہی دیکھتے اردو ادب کی دنیا بدل گئی۔ اردو نثر میں بقول سرسید لفاظی، عبارت آرائی، جھوٹ اور مبالغہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ سرسید خود نثر نگار تھے، زبان و بیان کی سادگی سے واقف تھے، اس لیے انھوں نے لفظی بازی گری، ضرب الامثال، محاورات اور استعاروں کی شعبدہ بازی کے بجائے آسان اور علمی زبان میں بہت سی کتابیں لکھیں۔ رسالے تصنیف کیے، اخبارات و رسائل میں مضامین لکھے۔ مدعا نگاری پر زور دیا۔ عبارت آرائی کو رد کیا۔ میر امن اور غالب نے سادہ نگاری کی جو روایت قائم کی تھی اسے آگے بڑھایا۔ انھوں نے ادب، مذہب، سیاست، تعلیم، معاشرت، اقتصادیات جیسے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا۔ سادہ مدلل اور واضح انداز میں اظہار خیال کیا اور جدید اردو نثر کی بنیاد ڈالی۔ بقول سید عبداللہ:

> ''سرسید نے نہ صرف اردو زبان و ادب کی حفاظت کی بلکہ اس کو غیر معمولی ترقی دے کر اردو ادب کے نشو و نما میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ اس سلسلے میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے نثر اردو کو اجتماعی مقاصد سے روشناس کیا اور اس کو سہل اور سلیس بنا کر عام اجتماعی زندگی کا ترجمان اور علمی مطالب کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔'' [1]

سرسید احمد خاں (۱۸۱۷-۱۸۹۸)

سرسید احمد خاں کا ایک خاص اسلوب نگارش ہے، جو متانت، سنجیدگی، بے تکلفی اور بلند خیالی سے عبارت ہے، وہ ہر بات کو سیدھے اور سادے انداز میں لکھتے ہیں۔ یہ سادگی شروع سے آخر تک قائم رہتی

---

[1] سرسید اور ان کے نامور رفقا، سید عبداللہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۹۴، ص ۱۲

ہے۔حتی کہ قاری خود بخود متاثر اور گرویدہ ہوتا چلا جاتا ہے،ان کے دلائل و براہین بھی مضبوط اور دلنشین ہوتے ہیں جس سے عبارت میں اور بھی اثر آفرینی پیدا ہو جاتی ہے۔

سرسید کے انتقال کے بعد ان کے رفقائے کار اور ان کے مشن سے عشق کی حد تک لگاؤ رکھنے والے احباب خاموش نہیں بیٹھے بلکہ سرسید کی تحریک کی تکمیل، اغراض ومقاصد کی تشہیر میں تاحین حیات سرگرم عمل رہے اور اپنی مقصدی، افادی، اصلاحی تعمیری اور تشکیلی تحریروں کے ذریعہ اردو زبان وادب کی اصلاح وفروغ کے ساتھ ساتھ اصلاح معاشرہ اور اصلاح سماج میں پیش پیش رہے۔

سرسید کے دوستوں اور ہم نواؤں میں نواب محسن الملک (۱۸۳۷ اٹاوہ-۱۹۰۷ شملہ) تھے جنھوں نے گرچہ کوئی قابل قدر کتاب تصنیف نہیں کی پھر بھی یہ سرسید کی تحریک کے زبردست حامی اور پرجوش مبلغ تھے۔ان کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں متواتر مضامین لکھ کر زبان اردو میں مقالہ نویسی کو فروغ دیا اور اس کا معیار قائم کیا۔

مولوی چراغ علی (۱۸۴۶-۱۸۹۵)

مولوی چراغ علی بھی سرسید کے مشن کے مبلغ اور تحریک کے حامی تھے۔مولوی

صاحب کی اکثر کتابیں انگریزی میں ہیں باوجودیکہ اس زمانے میں انگریزی کی تعلیم عام نہیں تھی۔ مولوی صاحب انگریزی میں دسترس رکھتے تھے۔ آپ کے مضامین انگریزی اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے اور اس پر گراں قدر تعریفی تبصرے بھی کیے جاتے۔ انھیں عبرانی وسریانی زبان سے بھی واقفیت تھی۔ اسی زبان دانی کی وجہ سے ان کے مضامین لسانیاتی تحقیق کے اعتبار سے بڑے محققانہ ہوتے تھے، جن میں تحقیق، تجسس، تفحص، تبحر اور وسعت نظری کی پوری خوبیاں موجود تھیں۔ ان کی اردو کتابیں تعلیقات، اسلام کی دنیوی برکتیں، قدیم قوموں کی تاریخ، بی بی ہاجرہ، ماریہ قطبیہ، تعلیق نیاز نامہ اہم ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد (۱۸۳۶-۱۹۱۲)

ڈپٹی نذیر احمد آپ کا شمار اردو ناول کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے۔ مراۃ العروس (۱۸۶۹)، بنات النعش (۱۸۷۳)، توبۃ النصوح (۱۸۷۷)، ابن الوقت (۱۸۸۸) ان کے مشہور ناول ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کا اصل کارنامہ جو غیر افسانوی نثر سے متعلق ہے، وہ ترجمہ قرآن مجید اور ان کی مشہور فقہی تصنیف کتاب الحقوق والفرائض ہے۔ ان کے ترجمے کا نمایاں وصف یہ ہے کہ یہ خالص اردو میں ہے اور اردو کا پہلا سلیس محاوراتی ترجمہ ہے۔ آپ کی دوسری تصنیف ''الحقوق والفرائض'' تین جلدوں پر مشتمل ہے۔

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴)

علامہ شبلی نعمانی کا دائرہ علم انتہائی وسیع تھا۔ تاریخ، سیرت، منطق، فلسفہ پر آپ کی نظر گہری تھی۔ المامون، الفاروق، سیرت النبی، علم الکلام، شعرالعجم، موازنہ انیس و دبیر، سیرۃ النعمان وغیرہ آپ کی اہم کتابیں ہیں۔ المامون اور الفاروق سیرت وسوانح کا اچھا نمونہ ہیں۔

شعرالعجم فارسی شاعری سے متعلق ہے۔ اس کی چوتھی جلد میں اصول شعر سے بحث کی گئی ہے۔ تنقید کی تاریخ میں یہ کتاب سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ موازنہ انیس و دبیر شبلی کے شعری ذوق اور انیس شناسی کی عمدہ مثال ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی (۱۸۳۷-۱۹۱۴)

مولانا الطاف حسین حالی کا اردو نثر کے فروغ میں بہت بڑا حصہ ہے۔ وہ بلند پایہ نثر نگار تھے۔ حیات سعدی (۱۸۸۲) لکھ کر انھوں نے اردو میں سوانح نگاری کا آغاز کیا۔ یادگارِ غالب مولانا کی دوسری کتاب ہے جسے غالب شناسی کی سمت میں پہلا قدم تصور کیا جانا چاہیے۔ حیات جاوید (۱۹۰۲) سرسید کی ضخیم سوانح ہے جس میں سرسید کی پیدائش سے لے کر وفات کے واقعات، حالات

زندگی اوران کی خدمات جلیلہ کا اعتراف ہے۔حالی نے سرسید کی بہت سی خامیوں کی پردہ پوشی کی کوشش کی ہے اورغلو سے کام لیا ہے اسی وجہ سے شبلی نے اسے مدلل مداحی اور کتاب المناقب سے تعبیر کیا ہے۔آپ کی سب سے اہم تصنیف مقدمہ شعروشاعری ہے، جوآپ کے مجموعہ کلام میں پیش لفظ کے طور پر شامل تھی ،لیکن اس کی معنویت اورافادیت کے پیش نظر اسے ایک الگ تصنیف کا درجہ ملا۔اردو تنقید میں یہ کتاب بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔

مولوی ذکاءاللہ (۱۸۳۲-۱۹۱۰)

مولوی ذکاءاللہ سرسید تحریک کے اہم رکن اورتہذیب الاخلاق کے نمائندہ قلم کار تھے۔آپ کی تصانیف کی کل تعداد ۱۴۳ پہنچتی ہے،جن میں ریاضیات پر ۸۱،تاریخ وجغرافیہ پر کم وبیش ۱۷، باقی ادب، اخلاق،طبیعات، ہیئت اور سیاست سے متعلق ہیں۔سرسید کے رفقا میں ان سے زیادہ کوئی کثیر التصانیف نہیں ہے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ ان کی ذات سے اردو کو بڑا فائدہ پہنچا۔آپ کی تحریر اس قدر سادہ ہے کہ پڑھنے میں اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔

مولانا محمد حسین آزاد (۱۸۳۰-۱۹۱۴)

مولانا محمد حسین آزاد کے سلسلے میں پروفیسر احتشام حسین فرماتے ہیں کہ اردو نثر کو بال و پر عطا کرنے میں ایک بڑی شخصیت مولانا حسین آزاد کی ہے۔ آب حیات ان کا لازوال کارنامہ ہے۔ یہ اردو شاعری کی اوّلین باقاعدہ تاریخ ہے، جس میں ادوار قائم کر کے اردو شاعری کے آغاز وارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کا دوسرا کارنامہ وہ ادبی مضامین ہیں جو ''نیرنگ خیال'' میں شامل ہیں۔ ''دربار اکبری'' اور ''سخن دان فارس'' وغیرہ ان کی اہم تصانیف ہیں۔

وحیدالدین سلیم

وحیدالدین سلیم۔ افادات سلیم کے مصنف مولوی وحیدالدین سلیم حالی کے توسط سے علی گڑھ سے وابستہ ہوئے۔ تہذیب الاخلاق اور انسٹی ٹیوٹ کے گزٹ کے معاون مدیر اور سرسید کے لٹریری اسسٹنٹ رہے۔ سرسید کے فیض صحبت سے علمی و تحقیقی کاموں کا ذوق پیدا ہوا اور متعدد علمی کارنامے انجام دیے۔

مذکورہ ارباب قلم کی کاوشوں سے اردو نثر میں موضوع اور اسلوب دونوں لحاظ سے وسعت پیدا ہوئی اور بیسویں صدی میں فرزندان علی گڑھ کی کوششوں نے افسانوی نثر کے ساتھ ساتھ غیر

افسانوی نثر کے فروغ وارتقاء میں مؤثر کردار ادا کیا۔ آئندہ ابواب میں مختلف اصناف نثر کے حوالے سے ان ہی خدمات کی تفصیل پیش کی جائے گی۔

بابِ دوم

علی گڑھ میں خاکہ نگاری کا ارتقا

(بیسویں صدی کے خاکہ نگاروں کے حوالے سے)

نثر کی دیگر اصناف کی طرح خاکہ بھی اردو کی ایک مقبول صنف ہے اور اس کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ سوانح کی طرح خاکے میں شخصیت کی تخصیص نہیں ہوتی۔ سوانح میں عموماً قابل ذکر شخصیتوں کو ہی موضوع قلم بنایا جاتا ہے۔ سوانح نگار، ان کی زندگی کے نشیب و فراز اور اتار چڑھاؤ کو تفصیلی و اجمالی طور پر ضبط تحریر میں لاتا ہے جب کہ خاکہ نگار کو کسی بھی معمولی یا غیر معمولی انسان کی زندگی میں کوئی ایسی خوبی یا اچھائی کی رمق نظر آ جائے، جو اسے لکھنے کے لیے مجبور کر دے تو خاکہ نگار اسے صفحہ قرطاس پر اتار دیتا ہے۔ خاکے میں افسانہ و غزل کی طرح اشارے و کنائے سے کام لیا جاتا ہے کیونکہ اختصار اس کی بنیادی شرط ہے۔ خاکے میں کسی شخصیت کے نقوش اس طرح ابھارے جاتے ہیں کہ اس کی خوبیاں و خامیاں اجاگر ہو جاتی ہیں اور ایک جیتی جاگتی تصویر قاری کے پیش نظر ہو جاتی ہے۔ خاکے کی دلکشی کا راز یہ ہے کہ جس کا خاکہ لکھا جائے اس کی کمزوریاں قاری کے دل میں نفرت کے بجائے ہمدردی و محبت پیدا کر دیں اور خاکہ پڑھ کر وہ بے ساختہ کہے کہ کاش اس شخص میں یہ کمزوریاں بھی نہ ہوتیں۔ ڈاکٹر عبدالحق نے ''نام دیو مالی'' اور رشید احمد صدیقی نے ''کندن'' پر خاکہ لکھ کر یہ واضح کر دیا ہے کہ خاکے کا موضوع عظیم شخصیتیں ہی نہیں معمولی انسان بھی ہو سکتے ہیں۔ اچھا برا، چھوٹا بڑا، امیر غریب، خوبصورت، قبیح صورت ہر طرح کا انسان خاکے کا موضوع بن سکتا ہے۔ بشرطیکہ خاکہ نگار نے ہر رنگ و روپ میں اس کا گہرائی سے مشاہدہ کیا ہو۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ خاکہ نگار امیجری، پیکر تراشی اور مردہ جسم میں روح ڈالنے کے فن سے واقف ہو۔ عموماً خاکہ نگاروں نے ایسی شخصیتوں پر

خاکہ لکھا ہے، جنہوں نے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ بقول مغنی تبسم، جنہوں نے فنون لطیفہ بالخصوص ادب اور شاعری میں یا پھر کسی اور شعبہ حیات میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں (۱)، خاکہ نگاروں نے ایسے ہی افراد پر طبع آزائی کی ہے۔

اردو ادب میں خاکہ نگاری کا ارتقاء انیسویں صدی کے اواخر میں ہو چکا تھا، لیکن صحیح معنوں میں خاکہ نگاری کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی میں ہوا۔ اردو ادب کے وہ خاکہ نگار جنہوں نے خاکے میں رنگ بھرنے کی کوشش کی، ان میں سرفہرست بابائے اردو مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی ہیں۔ ان کے علاوہ ان ہی کی تحریروں کے فیض یافتہ افراد کی نگاہ توجہ کی بدولت خاکہ کی صنف نے نہ صرف ترقی کی بلکہ علی گڑھ کے بعض فضلا کے خاکے تو دیگر بڑی زبانوں کے خاکوں سے بہتر معلوم ہوتے ہیں۔

ابتدائی دنوں میں خاکہ نگاری کے کوئی اصول وضوابط متعین نہیں تھے۔ بیش تر خاکہ نگار اپنے وضع کردہ اصولوں کی روشنی میں اور بعض نے بغیر کسی اصول وضوابط کی پابندی کے محض زبان کے چٹخارے کے طور پر علمی، ادبی، سیاسی، سماجی شخصیتوں کے خاکے لکھے۔ جب کہ بعض خاکہ نگاروں نے اپنے پیش رووں کی نقالی یا ان سے سبقت لے جانے کی خاطر بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی، جب خاکہ نگاروں کا وافر ذخیرہ اکٹھا ہو گیا، تو ناقدین فن کو اس کی تراش خراش کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کسے صنف ادب میں رکھا جائے اور کسے ادب کے زمرے سے خارج قرار دیا جائے۔ صابرہ سعید نے اس جانب بلیغ اشارہ کیا ہے۔

محمد حسین کا مضمون ''خاکہ نگاری'' کراچی جون 1959، امجد کندیانی کا مضمون خاکہ نگاری (نگار اصناف ادب نمبر)، سید محمد حسین کا مضمون خاکہ نگاری، نیا دور لکھنؤ 1964 اس لحاظ سے قابل ذکر ہیں کہ اس میں پہلی مرتبہ خاکہ نگاری بحیثیت اصناف جائزہ لیتے ہوئے اس کے فنی اوصاف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ (۲)

خاکہ اردو ادب کی قدیم صنف نہیں، سرسید اور ان کے ہم عصروں یا ان کے بعد کے قلم کاروں نے اس جانب توجہ مبذول کی اور اسے بطور صنف برت کر اردو ادب کے دامن کو مالا مال کیا۔ سرسید کو اس صنف کا

۱ اردو میں خاکہ نگاری، ڈاکٹر صابرہ سعید، مکتبہ شعر وحکمت، حیدرآباد، ۱۹۷۸، پیش لفظ مغنی تبسم، ص ۵

۲ اردو میں خاکہ نگاری، ڈاکٹر صابرہ سعید، مکتبہ شعر وحکمت، حیدرآباد، ۱۹۷۸، ص ۷

موجد بھی کہہ سکتے ہیں۔ سرسید کی تعزیتی تحریروں پر خاکے کا اطلاق ہوسکتا ہے کیونکہ انہوں نے ان تحریروں میں دنیا سدھارنے والے کی خوبیوں و خامیوں کو سادہ اور دلنشیں انداز میں یوں رقم کیا ہے، جس سے مرحوم کی خصوصیات اجاگر ہو جاتی ہیں۔

خاکہ نگاری سوانح نگاری کی ہی ایک قسم ہے۔ اس میں بھی کسی کی شخصیت یا سیرت کی تصویریں پیش کی جاتی ہیں۔ سوانح اور خاکے میں ایک بڑا فرق تفصیل اور اجمال کے علاوہ شخصیت کا ہے کیونکہ عموماً سوانح نگار، سوانح کا ہیرو بڑی اور عظیم شخصیتوں کو بناتا ہے۔ ایسی شخصیت جس نے زندگی کے مخصوص حلقے میں کوئی کارہائے نمایاں انجام دیا ہو، جس کے اثرات بلاتفریق مذہب وملت اور ملکی حدود وقیود سے ماورا نسلوں کی تربیت میں اہم رہے ہوں اس کی بہ نسبت خاکہ ایجاز واختصار کا متقاضی ہوتا ہے اور اشاروں و کنایوں میں موضوع کی سیرت وشخصیت کے ایسے نقوش اجاگر کیے جاتے ہیں، جن سے موضوع کی زندگی کے منفی کم، مثبت پہلو شرح وبسط کے ساتھ سامنے آسکیں، گوکہ بہت سے خاکہ نگاروں نے موضوع کی شخصیت کے منفی پہلوؤں کو شان کے ساتھ بیان کیا ہے اور مثبت پہلوؤں کے بیان میں بخل سے کام لیا ہے۔ اس کے علاوہ سوانح اور خاکہ میں حیات وممات کا فرق ہے۔ سوانح کا ہیرو مرحوم ہوتا ہے جب کہ خاکے میں موت وزیست کی حد بندیوں کا عمل دخل نہیں ہوتا جس طرح ایک زندہ انسان کا خاکہ لکھا جاسکتا ہے بالکل اسی طرح ایک مرحوم بھی خاکے کا ہیرو ہوسکتا ہے۔ عام طور پر خاکہ نگار اپنے ذاتی مشاہدے، تعلق، تجربے انسیت یا بغض وعناد کی بنیاد پر ہی صاحب سیرت کے کردار پر خامہ فرسائی کرتا ہے۔

اردو میں باضابطہ خاکہ نگاری کا آغاز مرزا فرحت اللہ بیگ (1884-1947) نے کیا۔ مرزا صاحب کا تعلق براہ راست علی گڑھ سے نہیں تھا، لیکن انہیں جن دو اشخاص کی خاکہ نگاری کی بدولت شہرت عام اور بقائے دوام نصیب ہوا، ان کا سرسید احمد خاں سے براہ راست تعلق ہے۔ سرسید کے رفیق ڈپٹی نذیر احمد کا خاکہ انہوں نے ''مولوی نذیر احمد کی کہانی - کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' کے عنوان سے لکھا، جسے مولوی عبدالحق نے جولائی 1927 میں ''رسالہ اردو'' میں اہتمام سے شائع کیا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کا دوسرا مقبول خاکہ ''ایک وصیت کی تعمیل'' ہے، جس میں مولوی وحیدالدین سلیم کی سیرت وشخصیت کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ سلیم

صاحب کا شمار سرسید کے فکری ہمنواؤں میں ہوتا ہے۔ مرزا صاحب نے سلیم صاحب کی زندگی کے روشن واقعات اور گمنام پہلوؤں کو سلیقے سے پیش کیا ہے۔ خاکے کا وہ گوشہ، جس سے خاکے کا حسن دوچند ہوتا ہے، وہ ہے مولانا کا علم سے خاص شغف۔ چونکہ مولانا نے انتہائی کسمپرسی اور تنگ دستی کے حالات میں پرورش پائی، لیکن غربت کو انہوں نے اپنی ترقی کی راہ کا کانٹا نہ بننے دیا، وہ تاعمر حصول علم میں ذوق وشوق سے مشغول رہے۔ ان کی علم دوستی اور انتقال پر مرزا فرحت اللہ بیگ یوں رقم طراز ہیں: ''ایک غریب لڑکا جس کے پاس پڑھنے کو کتابیں اور پیٹ بھر کھانے کو روٹی نہ تھی، وہ اپنی ہمت، شوق اور علم وفضل کے زور سے ایسا ہوا کہ آج اس کی موت پر ایک حقیقی طبقے کو رنج وافسوس ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو علم وادب کا ایک ستون گر گیا۔ ان کی زندگی صاف بتاتی ہے کہ شوق اور محنت عجیب چیزیں ہیں، جسے ہم کمال کہتے ہیں، وہ انہیں دونوں کا خالہ زاد ہے۔'' اس طرح دیکھا جائے تو اردو کے پہلے خاکہ نگار کا تعلق علی گڑھ سے ہے اور جو شخصیتیں خاکے کا موضوع بنیں، ان کا تعلق بھی علی گڑھ سے ہی ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے ہم عصروں میں آغا حیدر حسن، مولوی عبدالحق اور رشید احمد صدیقی اردو کے اہم خاکہ نگار تھے اور ان تینوں کا تعلق علی گڑھ سے ہی رہا ہے۔ آغا حیدر حسن (5 راگست 1892 تا 5 رنومبر 1976 حیدرآباد) کا پہلا مجموعہ ''پس پردہ'' 1926 میں علی گڑھ سے اور دوسرا مجموعہ ''ندرت زبان'' 1996 میں حیدرآباد سے شائع ہوا۔ ان دونوں مجموعوں میں کچھ ایسے مشاہیر کے خاکے شامل ہیں، جو نہ صرف اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں بلکہ اپنے ہنر، کمال، فکر وفن اور سیاسی بصیرت سے کام لیتے ہوئے نمایاں مقام حاصل کرتے ہیں۔

سروجنی نائیڈو، سید حسن، حیات اللہ انصاری، حکیم مومن خاں مومن، قادر حسین خاں اور ددّا حسینی پر خاکے ان دونوں مجموعوں میں شامل ہیں۔ آغا حیدر حسن اردو کے عظیم خاکہ نگار ہیں، یوں تو ان کے ماقبل بھی کئی لوگوں نے خاکے لکھے ہیں، لیکن آغا حسن کے خاکوں میں انفرادیت کا وہ رنگ نمایاں ہے، جس کی بدولت وہ ادبی حلقوں میں نہ صرف مقبول ہیں بلکہ ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ زبان و بیان کے اعتبار سے موصوف کی تحریریں وضاحت وصراحت کے ساتھ ساتھ قطعیت کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ آغا صاحب کے خاکوں میں جگہ جگہ

اجتماعی عنصر کارفرما نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب آغا حسن کے خاکوں میں اجتماعی رنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آغا حیدر حسن کے بعض خاکے اجتماعی خاکہ نگاری کے نمونے ہیں مثلاً سروجنی نائیڈو کے خاکے میں انہوں نے اقبال سہیل، ڈاکٹر انصاری، عبدالرحمٰن سندھی اور راجہ محمود آباد کی شخصیت کا تعارف بھی مختصراً اور دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔'' [1]

زبان و بیان کے اعتبار سے یہ خاکے تازگی اور شگفتگی لیے ہوئے ہیں اور فن کے معیار پر بھی کھرے اترتے ہیں البتہ کچھ خاکے موضوع کے خدوخال تک محدود نظر آتے ہیں۔ بعض ناقدین فن کے خیال میں یہ خاکے صرف چہرے مہرے اور ناک نقشے یعنی سراپا نگاری تک ہی محدود ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ صاحب قلم نے شخصیت کے تمام اوصاف کو چہرے مہرے تک ہی محدود رکھا ہے۔ خاکے میں سراپا نگاری کے علاوہ سیرت و شخصیت کی عمدہ تصویر کشی بھی کی جاتی ہے اور یہی خاکے کی جان بھی ہوتی ہے۔ بعض خاکوں میں آغا صاحب سیرت و شخصیت کے حوالوں سے موضوع کی کچھ ایسی خوبیاں بیان کرتے ہیں، جن سے موضوع کی صورت و سیرت کا نقش قاری کے ذہن پر نقش ہو جاتا ہے۔ آغا صاحب نے سروجنی نائیڈو کا جو خاکہ لکھا ہے، اس تعلق سے ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب یوں رقم طراز ہیں:

''یہ خاکہ بیگماتی زبان میں ہے اور اس میں بے تکلفی کا انداز نمایاں ہے، غالباً اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ سروجنی نائیڈو آغا صاحب کی اہلیہ بدرالنساء بیگم کی قریبی دوست تھیں۔ مسز نائیڈو کی سیرت و شخصیت کا پورا نقش اس میں خوبصورتی کے ساتھ ابھر آیا ہے اور اسے اردو کے چند اہم خاکوں کی فہرست میں رکھا جا سکتا ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ آغا صاحب اپنے موضوع کی خارجی شخصیت یعنی وضع قطع، حلیہ اور ناک نقشہ بیان کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی ان کے خاکوں پر یہ بات صادق نہیں آتی۔ واقعہ نگاری کے وسیلے سے اپنے موضوع کی اندرونی شخصیت کو نمایاں کرتے ہوئے وہ اخلاقی اقدار اور صفات کا بھی ذکر کر دیتے ہیں تاکہ موضوع کی صورت اور

[1] دانش گاہ علی گڑھ میں ادب، مرتب پروفیسر خورشید احمد، یونیورسٹی پریس علی گڑھ، ۲۰۰۵، ص ۲۴

سیرت دونوں کا واضح نقش سامنے آجائے۔'' [1]

اسی طرح بعض واقعے یا کسی واقعے کے حوالے سے آغا صاحب بڑی پتے کی بات کہہ جاتے ہیں، جس سے ان کے وسیع مشاہدے اور گہرے تجربے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اگر قاری کی رسائی جملے کی تہہ اور واقعے کے پس منظر تک نہ ہو اور وہ زبان کی باریکی اور بیان کے رمز سے آگاہ نہ ہو تو بسا اوقات بعض جملے اور بعض واقعات بے تکے معلوم ہوتے ہیں، جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ کیونکہ عموماً کوئی بھی خاکہ نگار شخصیت کے مثبت و منفی پہلوؤں پر گہرے مشاہدے کے بعد ہی قلم اٹھاتا ہے۔ مثلاً قادر حسین خاں (لکچرر معاشیات نظام کالج) کے خاکے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''خاں صاحب تھے بڈھے کنوارے، بڈھا کنوارا ہوتا ہے، بڑا کڑوا، لیکن اس کو سمجھ کر برتاؤ کرو تو اس سے زیادہ کوئی میٹھا نہیں، وہ اپنا کلیجہ نکال کر دے سکتا ہے، جو شادی شدہ کے لیے ناممکن ہے، اس کی جان و ایمان تو بیوی بچے گھر بار ہوتا ہے اور مجرد کا محبوب مشغلہ اس کا کام اور وہ جو اس کے جذبات و ذہنیت کو سمجھ گئے ہوں۔'' [2]

علی گڑھ کے خاکہ نگاروں میں نمایاں نام بابائے اردو مولوی عبدالحق کا ہے۔ مولوی صاحب کی ذات محتاج تعارف نہیں، ان کا قلم انتہائی زرخیز اور گہربار تھا۔ اردو کے کلاسیکی سرمائے کو انھوں نے منظر عام پر لانے کی کوشش کی۔ بہت سی گمنام کتابیں، بوسیدہ مسودے، جن پر زمانے کی دھول گردنے بے اعتنائی کی پرتیں ڈال دی انھیں مولوی صاحب نے مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا۔ شوخی و ظرافت ان کے مزاج میں رچی بسی تھی۔ مولوی صاحب کے تحریر کردہ خاکے اس طرح کی مثالوں سے مملو ہیں۔ خاکہ نگاری میں جو شہرت و مقبولیت آپ کے حصے میں آئی وہ فارغین علی گڑھ میں رشید احمد صدیقی کے علاوہ شاید ہی کسی اور کے حصے میں آئی ہو۔

مولوی عبدالحق کے خاکوں کا مجموعہ ''چند ہم عصر'' پہلی بار 1937 میں شائع ہوا۔ اس میں 14 خاکے

---

[1] دانش گاہ علی گڑھ میں ادب، مرتب پروفیسر خورشید احمد، یونیورسٹی پریس، علی گڑھ، ۲۰۰۵، ص ۱۲۴

[2] دانش گاہ علی گڑھ میں ادب، مرتب پروفیسر خورشید احمد، یونیورسٹی پریس، علی گڑھ، ۲۰۰۵، ص ۱۲۴

شامل تھے۔اس کے متعدد ایڈیشن مختلف اداروں نے اہتمام سے شائع کیے۔''چند ہم عصر'' میں ادباء،شعراء، علمائے کرام،اکابرین ملت کے خاکوں کے متوازی ایک عام شخصیت نام دیو مالی کا خاکہ بھی شامل ہے۔مولوی صاحب کی خاکہ نگاری کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے غیر اہم شخصیتوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔اس مجموعے کے تمام خاکوں کی بہ نسبت سب سے زیادہ مقبولیت ''نام دیو مالی'' کے حصے میں آئی۔ چند ہم عصر کی شناخت ہی دیو مالی کی حیثیت سے ہوتی ہے۔مولوی صاحب کا نام آتے ہی زبان پر بے ساختہ نام دیو مالی کا نام آجاتا ہے۔کوئی بھی آدمی محض ذات پات، برادری،حسب ونسب، مال ودولت، رتبہ وعہدہ، رنگت کی بنیاد پر بڑا نہیں ہوتا، انسان اخلاق،شرافت، محنت، عزت، کردار اور ایمانداری کی بنیاد پر محترم قرار پاتا ہے۔ ایمانداری دیانت داری اور عرق ریزی کا تعلق تمام تر شعبہ ہائے زندگی سے ہے۔ نام دیو مالی کی محنت، ایمانداری،شرافت باغیچے کے پھولوں اور پودوں سے اولاد جیسی محبت اور ان کی دیکھ ریکھ اور تراش خراش سے مولوی صاحب بہت زیادہ متاثر ہوئے۔نام دیو جفاکش،محنتی اور فرض شناس مالی تھا اسے اپنے پیشے سے لگاؤ تھا اور خدمت خلق سے اسے تسکین ملتی تھی۔مولوی صاحب نے ان خاکوں میں نہایت دیانت داری اور صاف گوئی سے کام لیا ہے۔کسی میں خوبیاں دیکھیں تو کھلے دل سے اس کا اعتراف کیا اور کہیں خامیاں دیکھیں تو اس پر بڑی بے باکی سے انگلیاں رکھ دیں۔

مولوی صاحب کو شخصیت سے زیادہ اقدار عزیز ہیں، اسی وجہ سے وہ اپنے موضوع کی شخصیت میں اقدار وصفات کے متلاشی نظر آتے ہیں۔یہ رویہ اور یہ وصف ان کے تعمیری اور اصلاحی نقطہ نظر کا غماز ہے، چونکہ مولوی صاحب نے سرسید کی آنکھیں دیکھی تھیں۔سرسید کی رفاقت کے طفیل ہی وہ ہر شئے اور ہر فرد میں اصلاحی، اخلاقی،تعمیری اور افادی پہلوؤں کو ہمیشہ نظر میں رکھتے تھے۔مولانا کی یہ تعمیری سوچ بھی سرسید کی رہین منت ہے،مولانا نے شخصیتوں کو انسان کے روپ میں اور ان کے مخصوص عہد اور حالات کے تناظر میں دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔مولوی صاحب کی تحریروں کا نمایاں وصف ان کا تجزیاتی اسلوب اور لطیف اشارے ہیں۔یہی امتیازات ان کے پیش کردہ مرقعوں میں ایک نئی روح پھونکنے کے ساتھ شگفتگی اور برجستگی پیدا کرتے ہیں۔

مولوی صاحب نے اپنے بعض خاکوں میں سوانحی رنگ کو بھی جگہ دی ہے۔ لیکن سوانحی حالات اور تاریخی ترتیب کی طوالت سے گریز کیا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے خاکے مختصر لیکن جامع ہو گئے۔ مولوی صاحب اپنے خاکوں میں ایجاز و اختصار کے باوجود شخصیت کے روشن پہلو نظر انداز نہیں کرتے، یہی ان کا خاص اسلوب ہے۔ مولانا انسان کے اندرون میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں، جو کہ کامیاب مرقع نگاری کے لیے ضروری ہے۔ وہ شخصیتوں کے حالات اور چھوٹے چھوٹے واقعات کے بیان سے خاکوں میں رنگ بھرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی کبھی مولوی صاحب شخصیتوں کی زندگی سے تعلق رکھنے والے بڑے واقعات سے صرف نظر کرتے ہوئے مختصر واقعے کو جگہ دیتے ہیں۔ مولانا کے نزدیک واقعات کی عظمت طوالت نہیں بلکہ وہ خوبی ہے، جو دوسروں کو متاثر کرتی ہے۔ مولوی سید علی بلگرامی، مولانا حالی، سر سید احمد خاں، مولانا محمد علی جوہر، مولوی وحید الدین سلیم، میرن صاحب، نام دیو مالی اور نور خان پر لکھے گئے مولوی صاحب کے مرقعے اس فن کے عمدہ نمونے ہیں۔ جہاں شخصیتیں جامد و ساکت نہیں بلکہ فعال متحرک اور تندرست و توانا نظر آتی ہیں۔ مولانا محمد علی کے خاکے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''مولانا محمد علی عجیب و غریب شخص ہوئے ہیں، وہ مختلف متضاد اور غیر معمولی اوصاف کا مجموعہ تھے۔ اگر انہیں ایک آتش فشاں یا گلیشیر سے تشبیہ دی جائے تو زیادہ مبالغہ نہ ہوگا۔ ان دونوں میں عظمت و شان ہے، لیکن دونوں میں خطرہ وہ تباہی بھی موجود ہے۔ وہ آزادی کا دلدادہ اور جبر و استبداد کا پکا دشمن تھا، اگر کبھی اس کے ہاتھ میں اقتدار آتا تو وہ بہت بڑا جابر و مستبد ہوتا۔ وہ محبت و مروت کا پتلا تھا اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتا تھا، لیکن بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولہ ہو جاتا تھا کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی۔ دوست اس کے جاں نثار اور فدائی تھے، لیکن اس طرح بچتے، جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے۔'' [1]

مولوی محمد علی جوہر کی گلیشیر سے تشبیہ انتہائی بلیغ ہے۔ مولانا کو گلیشیر سے تشبیہ دے کر مولوی صاحب نے ان کی شخصیت کی مکمل تصویر پیش کر دی ہے اور سرور صاحب کے بقول یہ تشبیہ نہایت موزوں ہے۔ مولوی

[1] چند ہم عصر، مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، ہند، نئی دہلی، ۱۹۷۵، ص ۷۵

صاحب کا اسلوب انتہائی توانا اور مستحکم ہے۔ اسلوب نگارش سب سے منفرد اور نمایاں ہے۔ بقول ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب:

''مولوی صاحب کے دلکش اسلوب نگارش نے بھی ''چند ہم عصر'' کے مرقعوں میں حسن اور تازگی پیدا کردی ہے۔'' [1]

اردو ادب نے آج تک جو خاکہ نگار پیدا کیے ہیں ان میں رشید احمد صدیقی کا قد بہت بلند ہے اور شاید آئندہ بھی ایک طویل مدت تک کوئی ان کا ہم سر پیدا نہ ہو سکے۔ فکر کی گہرائی، اسلوب کی دلکشی اور تجربے کی وسعت نے انہیں وہ بلند مقام عطا کیا، جو کم فنکاروں کو نصیب ہوتا ہے۔ انہوں نے نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے تک اپنے قلم سے اردو ادب کی خدمت کی۔ ان کے اوقات کا کثیر حصہ اپنے پائیں باغ میں رنگ برنگے پھول کھلانے میں صرف ہوتا تھا یا پھر مضمون نگاری میں۔ خاکہ نگاری میں بھی انہوں نے وہ مقبولیت وشہرت حاصل کی کہ جس کا خواب ہر ذی علم اور صاحب قلم دیکھا کرتے ہیں۔

رشید صاحب کا دائرۂ کار اور دائرۂ علم بسیط تھا۔ ان کا قلم زرخیز بھی تھا اور گہربار بھی۔ اردو کی دیگر اصناف میں بھی انھوں نے طبع آزمائی کی اور ہر طرف اپنی صلاحیت اور علم کی بدولت ممتاز ومنفرد نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کے قلم کا خاص جوہر خاکہ نگاری میں نظر آتا ہے۔

علی گڑھ کے خاکہ نگاروں میں رشید احمد صدیقی ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ (آپ کی پیدائش مڑیاہوں، ضلع جونپور میں 24 ردسمبر 1894 کو ہوئی اور انتقال 15 رجنوری 1977 کو علی گڑھ میں ہوا۔) آپ علی گڑھ کے ساختہ پرداختہ تھے۔ علی گڑھ آپ کے رگ وپے میں رچا بسا تھا۔ آپ کی تحریروں میں علی گڑھ کا تہذیبی رکھ رکھاؤ، وہاں کی قدریں، وہاں کے امتیازات کے نقوش واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ظرافت سے آپ کو خاص لگاؤ تھا، اس لیے بیشتر خاکوں میں ظرافت موج تہہ نشیں کی طرح کارفرما ہے۔ آپ کا نثری اسلوب علی گڑھ کا نمائندہ اسلوب ہے۔ آپ علی گڑھ کے شیدائی تھے، علی گڑھ سے فراق آپ کے بس سے باہر تھا، علی گڑھ کی قدریں آپ کی شخصیت میں حلول کر گئی تھیں۔ اسی وجہ سے آپ کی تحریروں میں مادر درسگاہ کی قدریں

[1] دانش گاہ علی گڑھ میں ادب، ص ۱۲۶

پوری طرح جلوہ گر ہیں۔

آپ علی گڑھ کے سچے شیدائی تھے، اسی وجہ سے علی گڑھ کبھی آپ سے جدا نہ ہو سکا۔ آپ کے خیال میں علی گڑھ سے وابستگی شرافت کی دلیل ہے۔ آپ کا یہ قول علی گڑھ کی تہذیبی قدروں کے حوالے سے بہت مشہور ہے کہ جب میں کسی شریف انسان کو کسی بس اسٹینڈ، ریلوے اسٹیشن یا کسی عوامی جگہ پر دیکھتا ہوں اور ان سے ہم کلام ہونے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق علی گڑھ سے ہے، یا رہا ہے تو تعجب نہیں ہوتا کیونکہ علی گڑھ سے وابستگی شرافت کی دلیل ہے لیکن اگر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا رشتہ علی گڑھ سے کبھی نہیں رہا، تو افسوس ہوتا ہے کہ کاش علی گڑھ میں اس کی تربیت ہوئی ہوتی تو اس کی شرافت میں مزید اضافہ ہوتا۔ رشید صاحب نے خاکہ نگاری کی روایت کو نہ صرف آب و تاب اور توانائی عطا کی بلکہ اپنی شوخی قلم سے ایسی مقبولیت عطا کی کہ جس کی پیروی کی خواہش ہر دل میں پیدا ہونے لگی۔ بہتوں نے ان کے اسلوب کی نقالی کی، لیکن وہ ان کی گرد پا تک نہیں پہنچ سکے۔ رشید صاحب نے خاکہ نگاری کی صنف کو اپنے نوک قلم سے گہربار کر دیا۔ رشید صاب کے اسلوب کا ایک نمایاں وصف شوخی، ظرافت اور طنز کے ساتھ ساتھ ہمدردی، مروّت، خلوص، قربت و اپنائیت ہے۔ رشید صاحب نے وکیل صاحب کا جو خاکہ لکھا ہے وہ مرقع نگاری کے اعتبار سے بے مثال، اسلوب نگارش کے اعتبار سے منتہائے کمال اور شہرت و مقبولیت کے اعتبار سے لازوال ہے۔ رشید صاحب سادہ اور عام فہم زبان کا استعمال کرتے ہیں، جس میں مرصع کاری نہیں بلکہ سادگی و معصومیت کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ انداز بیان میں بھی ہمدردی، اپنائیت کا عنصر حاوی نظر آتا ہے۔ صابرہ سعید لکھتی ہیں:

> ''رشید صاحب کا اسلوب بہترین، شگفتہ، زبان آرائشوں سے مملو ملتی ہے۔ ہر قسم کے بیانات اس خوبصورتی اور مہارت سے پیش کرتے ہیں جیسے ایک معمار سوچے سمجھے نقشے پر عمارت تعمیر کر رہا ہو۔
>
> انداز بیان میں گہری شرافت اور قلم مشفق ہے ان کا اپنا ایک خاص رنگ ہے۔'' [1]

عبدالقادر سروری ان کے اسلوب کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

> ''رشید صاحب کی تحریر ایک حسین دوشیزہ معلوم ہوتی ہے۔ وہ ایک مخصوص انداز کے مالک ہیں۔

---

[1] اردو میں خاکہ نگاری، ڈاکٹر صابرہ سعید، مکتبہ شعر و حکمت، ۱۹۷۸، ص ۲۰۸

بلند خیالی کے ساتھ ظرافت کی لطافتیں مل کر الفاظ اور جملوں کو ایک پر شباب عورت سے زیادہ دلآویز بنا دیتے ہیں۔''[1]

رشید صاحب اپنی تحریروں میں جتنے شوخ، چنچل، بے تکلف اور مزاح پسند نظر آتے ہیں، وہ شخصی اور فطری اعتبار سے اتنے ہی سنجیدہ اور خاموش طبع واقع ہوئے تھے۔ اس بات کو ایک واقعے سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ رشید صاحب کی شوخ اور طنز و مزاح سے بھرپور تحریریں پڑھ کر ایک صاحب کے دل میں ان سے ملنے کی تڑپ پیدا ہوئی، وہ ان سے ملنے کے اشتیاق میں شعبہ اردو آ پہنچے، چپراسی نے رشید صاحب کو اطلاع دی کہ ایک صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آپ نے کہا اندر بھیج دو، جناب والا تشریف لے گئے تو دیکھا کہ رشید صاحب اخبار پڑھنے میں محو ہیں۔ مہمان نے بہت دیر تک انتظار کیا، جب ان سے برداشت نہ ہوا تو انہوں نے کہا کہ میں آپ سے ملنے آیا ہوں۔ رشید صاحب نے برجستہ جواب دیا، ملنے کے لیے آئے ہیں تو مل لیجئے۔

رشید صاحب نے مضامین رشید (1941) اور خنداں (1940) میں چند خاکے بھی شامل کر دیے تھے، لیکن ان کا باضابطہ پہلا مجموعہ ''گنجہائے گراں مایہ'' (1942) اور دوسرا مجموعہ ''ہم نفسان رفتہ'' 1958 میں منظر عام پر آیا۔ دونوں مجموعوں میں رشید صاحب نے اپنے معاصرین اور اکابرین کے ساتھ ساتھ چند غیر اہم شخصیتوں کے بھی نہایت عمدہ خاکے پیش کیے۔ انہوں نے فنی اصولوں کو سلیقے سے برتتے ہوئے طویل اور مختصر (دونوں طرح کے) خاکے لکھے ہیں۔ ذاکر صاحب رشید صاحب کی پسندیدہ شخصیت ہیں، جن کا طویل خاکہ انہوں نے 1944 میں کتابی صورت میں شائع کیا۔ کچھ ترمیم اور حذف اضافہ کے بعد ''ہمارے ذاکر صاحب'' کے عنوان سے یہ 1973 میں دوسری بار شائع ہوا۔ رشید صاحب نے غیروں کے ساتھ ساتھ اپنوں کو بھی اپنے خاکے کا موضوع بنایا۔ اپنے بیٹے نیازی رشید کا طویل خاکہ انہوں نے ''شیخ نیازی'' کے عنوان سے 1958 میں شائع کیا۔ ''گنجہائے گراں مایہ'' کی پہلی طباعت میں 13 خاکے شامل تھے، مگر اس کی دوسری اور تیسری اشاعت میں اس میں مزید چند خاکوں کا اضافہ کیا گیا۔ مہر الٰہی اور لطیف الزماں خاں نے مختلف رسائل و جرائد میں بکھرے ہوئے رشید صاحب کے 15 خاکے یکجا کر کے ''گنجہائے گراں مایہ'' حصہ دوم کے نام سے 1991

[1] دانش گاہ علی گڑھ میں ادب، ص ۱۲۷

میں مکتبہ دانیال کراچی سے شائع کرایا۔ اس طرح رشید صاحب کے تقریباً 4 درجن خاکے مجموعے کی صورت میں شائع ہو کر ناقدین علم وفن سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ رشید صاحب نے خاکہ نگاری کے فن کو معیار و وقار عطا کیا ہے۔ روایت کہنہ کی پاسداری اور تہذیبی اقدار کے رکھ رکھاؤ سے انہیں خاصی دلچسپی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے خاکے کے ہیرو کو بحیثیت انسان ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے طنز و مزاح اور شوخی و ظرافت کے ذریعے خاکوں میں رنگینی، حسن، دل آویزی اور کشش پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ بقول ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب ''لطیف قسم کے طنز اور مزاحیہ رنگ سے ان کے خاکوں میں بڑا حسن پیدا ہو گیا ہے۔(۸) قول محال، ضرب الامثال کے علاوہ مصروں اور اشعار کا برمحل استعمال بھی ان کے خاکوں میں جا بجا دیکھنے کو ملتا ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں:

''مولانا اقبال سہیل (اقبال احمد خاں ایم اے، ایل ایل بی علیگ) سے میری ملاقات 1915 میں ہوئی۔ اس زمانے میں مولانا شاعری کرتے تھے، یونین کے الیکشن لڑاتے تھے اور معجون کھاتے تھے۔ اب مقدمے لڑتے ہیں اور بچے پیدا کرتے ہیں، جس کی ابتداء ایسی ہو، اس کا انجام یہ کیوں نہ ہوا!''

نثار احمد فاروقی نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ:

> ''جب ہم اردو خاکہ نگاری کے مختصر سرمایے کی طرف مڑ کر دیکھتے ہیں تو ''چند ہم عصر'' کے بعد ''گنجہائے گراں مایہ'' سے اچھی کوئی کتاب اس پورے دور میں نظر نہیں آتی۔'' [۱]

علی گڑھ کے خاکہ نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے، جنہوں نے اپنے زور قلم سے خاکہ نگاری کے فن کو شہرت و مقبولیت عطا کی۔ اگر تمام خاکہ نگاروں کی فہرست تیار کی جائے تو یہ فہرست خاصی طویل ہو سکتی ہے۔ لیکن درج ذیل خاکہ نگار اپنے فن اسلوب اور لب و لہجے میں جدت و ندرت اور شخصیتوں کے انتخاب کے معاملے میں سرفہرست نظر آتے ہیں۔

خواجہ غلام السیّدین، شاہد احمد دہلوی، جلیل قدوائی، سید وحید الدین فقیر، عبدالماجد دریا آبادی، سید اعجاز حسین، عبدالشکور، غلام احمد فرقت کاکوروی، محمد معین الدین دردائی، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، سید

---

[۱] دید و دریافت۔ نثار احمد فاروقی، ترقی اردو، ہند، دہلی، ۱۹۶۴، ص ۴۸

صباح الدین عبدالرحمٰن اور خلیل الرحمٰن اعظمی۔ان ادیبوں نے خاکہ نگاری کی روایت کو پروان چڑھایا ہے۔

خواجہ غلام السیّدین (پیدائش 16/اکتوبر 1904، وفات 19/دسمبر 1971) کے سترہ (17) خاکوں کا مجموعہ ''آندھی میں چراغ'' 1962 میں شائع ہوا تھا اور 1964 میں ہی انہیں اس مجموعے کی بدولت 22 ہندوستانی زبانوں کے سب سے بڑے ادارے ساہتیہ اکادمی کی جانب سے 5000 روپے کا انعام ملا تھا۔اب فروغ اردو کے لیے کام کرنے والے ادارے NCPUL نے اس کتاب کو انتہائی اہتمام کے ساتھ جاذب نظر سرورق کے ساتھ خوبصورت انداز میں شائع کر کے اس میں ایک نئی روح پھونکنے کی کوشش کی ہے۔اس مجموعے میں بابائے قوم مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، ذاکر صاحب، دانائے راز سر اقبال، سر راس مسعود اور خواجہ غلام الثقلین جیسی نابغۂ روزگار اور عبقری شخصیات کے خاکے شامل ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے پوتے شاہد احمد دہلوی (22/مئی 1906 - 28/مئی 1967) کے سترہ (17) خاکوں کا مجموعہ ''گنجینۂ گوہر'' 1962 میں شائع ہوا تھا۔رسالہ ''نقوش'' میں شخصیات کالم کے لیے بھی انہوں نے ''دلی کا ایک دور'' کے تحت 12 خاکے لکھے تھے۔ان کے خاکوں کا تیسرا مجموعہ ''بزم خوش نفساں'' کراچی سے شائع ہوا۔شاہد احمد دہلوی کے خاکوں کے تینوں مجموعے بے حد مقبول ہوئے۔انہوں نے شخصیات کے انتخاب میں احتیاط سے کام لیا ہے اور عموماً انہی شخصیات کو اپنی کتاب میں جگہ دی ہے، جو کسی نہ کسی اعتبار سے اپنی منفرد شناخت رکھتی ہیں۔ان کے خاکوں کے نمایاں اوصاف سراپا نگاری، واقعہ نگاری، جدت طرازی، بے ساختگی، برجستگی اور بے تکلفی ہیں۔واقعہ طرازی کے وقت وہ خود کو ہمیشہ پس پردہ رکھتے ہیں اور کسی ایسے لہجے کا استعمال نہیں کرتے جس سے ان کی شخصیت کی مداخلت کا احساس ہو۔ان کے اسلوب کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ موضوع کی شخصیت کے خدوخال کو شرح وبسط کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب ان کی خاکہ نگاری کا وصف یوں رقم کرتے ہیں:

> ''سراپا نگاری، واقعہ طرازی اور بے تکلفی کا انداز شاہد احمد دہلوی کے خاکوں کے نمایاں اوصاف ہیں۔وہ اپنی شخصیت کو ہمیشہ پس پردہ رکھتے ہیں۔'' [1]

---

[1] دانش گاہ علی گڑھ میں ادب، ص ۱۲۹

شاہد احمد دہلوی نے جن اہم شخصیتوں کو اپنے خاکوں کا موضوع بنایا ہے ان میں عظیم بیگ چغتائی، خواجہ حسن نظامی، بشیر الدین احمد، ڈپٹی نذیر احمد اور جمیل جالبی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ شاہد احمد دہلوی کو دلی کی ٹکسالی زبان اور محاوروں کے استعمال پر قدرت ہے، جس کا اظہار جگہ جگہ ان کے خاکوں میں ہوا ہے۔ میراجی کی شخصیت پر انہوں نے بے باکانہ لکھا ہے، لکھتے ہیں: ''میراجی بڑے گندے آدمی تھے، وہ ان میں سے تھے، جو کہتے ہیں ''یا نہلائے دائی یا نہلائیں چار بھائی، انہیں کبھی کسی نے نہاتے نہیں دیکھا۔''

جلیل قدوائی (16/مارچ 1904 - یکم/جنوری 1996) کے خاکوں کا پہلا مجموعہ ''تنقیدیں اور خاکے'' 1952 میں اور دوسرا مجموعہ ''چند اکابر چند معاصر'' 1977 میں شائع ہوا۔ اسی طرح سید وحید الدین فقیر (وفات 20/جولائی 1968 کراچی) کے تاثراتی خاکوں کا مجموعہ ''انجمن'' کے نام سے منظر عام پر آیا تھا۔ ان خاکوں میں تاثراتی لب ولہجہ اور رنگ حاوی ہے۔ ذاتی مشاہدوں اور تجربوں کی بنیاد پر انہوں نے جو خاکے تحریر کیے ہیں، وہ بلاشبہ شخصیت کی سیرت کے تمام گوشوں کو شرح وبسط یوں بیان کرتے ہیں، جن سے شخصیت کی زندگی کی داخلی پرتیں بے نقاب ہو جاتی ہیں۔

علامہ اقبال کی شخصیت اور شاعری پر انہوں نے جو کتاب ''روزگار فقیر'' کے نام سے لکھی تھی اس میں بھی طویل خاکے کا انداز نمایاں ہے۔ عموماً خاکے میں کسی انسان کی سیرت وشخصیت کے ان ہی گوشوں کو ایجاز و اختصار کے ساتھ سمیٹنے کی کوشش کی جاتی ہے، جن سے شخصیت کی خوبیاں واضح ہو جائیں۔ اجمال اور اختصار خاکے کی بنیادی شرط ہے، لیکن طویل خاکہ نگاری بھی اردو میں رائج ہے، ''روزگار کا فقیر'' کو اسی زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔

عبدالماجد دریابادی کی شخصیت کی کئی جہتیں ہیں۔ ایک طرف تو عربی کے انشا پرداز ہیں۔ (دینی مدارس میں ان کی کتاب معلّم الانشا اوّل، دوم نصاب میں شامل ہے) تو دوسری طرف اردو کے ادیب وصحافی بھی ہیں۔ انہوں نے اردو میں صحافت کے عمدہ معیار اور اصول مرتب کیے ہیں۔ انہوں نے بعض ادبی شخصیتوں کے خاکے بھی لکھے ہیں، ان کے خاکے فنی معیار پر کھرے اترتے ہیں۔

مولانا کی پیدائش 12/مارچ 1892 اور انتقال 6/جنوری 1977 میں ہوا۔ مولانا کی زندگی حرکت و

عمل، جدوجہد مسلسل اور تصنیف وتالیف سے عبارت ہے۔

مولانا دریابادی نے علامہ شبلی، مہدی افادی، اکبرالہ آبادی وغیرہ ادبی شخصیتوں کے خاکے لکھے تھے۔ یہ تمام خاکے علمی وادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے اور شوق سے پڑھے گئے، لیکن مولانا دریابادی کو مولانا محمد علی جوہر پر لکھے گئے طویل خاکے کی بدولت شہرت ملی۔ مولانا محمد علی سے متعلق ان کا خاکہ اردو میں سوانحی خاکے کی منفرد مثال ہے اور غالباً یہی اردو کا سب سے طویل خاکہ بھی ہے۔ عبدالماجد دریابادی کی خاکہ نگاری پر صابرہ سعید یوں رقم طراز ہیں:

''خاکہ نگاری کے میدان میں ان کا منفرد کارنامہ ''محمد علی'' 1954 میں شائع ہوا۔ بعض نقادوں نے اسے طویل خاکہ قرار دیا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ شخصی خاکہ کی تمام خصوصیات اس میں پائی جاتی ہیں۔ اس کا کوئی عیب ہے تو یہی طوالت ہے۔ جس کی وجہ سے تاثر کی وحدت باقی نہیں رہ سکی۔'' [1]

رئیس الاحرار مولانا محمد علی کی ذات محتاج تعارف نہیں ''تحریک خلافت'' کے روح رواں اور میدان صحافت کا روشن ستارہ تو مولانا تھے ہی، اردو کے اچھے شاعر بھی تھے۔ مولانا کی ذات گوناگوں صفات کی مرجع تھی۔ مولانا دریابادی محمد علی جوہر کے متعلق یوں رقم طرز ہیں ''اللہ نے عجیب جامع شخصیت بنائی تھی، تاریخی، ادبی، مذہبی، شعری، سیاسی، تعلیمی ہر موضوع پر یکساں درک تھا۔ نہایت ہی آزاد دماغ حافظہ اور ذہانت دونوں بے مثل، ہنسنے ہنسانے والے غضب کے اور رونے رُلانے والا آدمی بھی ایسا کم دیکھنے میں آیا۔ مولانا محمد علی کی بہت سی تصویریں کھینچی گئی ہیں، لیکن صحیح ترین مرقع یہی ہے۔

اردو ادب میں اعجاز حسین کی شہرت وشناخت بنیادی طور پر ادبی مؤرخ اور نقاد کی حیثیت سے ہے لیکن وہ خاکہ نگار بھی ہیں۔ ان کی کتاب ''تاریخ ادب اردو'' علمی اور ادبی حلقوں میں کافی مقبول ہے۔ ''ادب کے شہزادے'' ان کے خاکوں کا مجموعہ ہے جو 1954 میں شائع ہوا، اس میں 44 شعراء کے مختصر خاکے ہیں۔ انہوں نے خاکوں میں حد درجہ ایجاز واختصار سے کام لیا ہے، جس کی وجہ سے تشنگی کا احساس باقی رہتا ہے۔ ڈاکٹر صابرہ سعید کا خیال ہے کہ:

[1] اردو میں خاکہ نگاری، ڈاکٹر صابرہ سعید، ص ۱۶۷

''ان میں خاکہ نگاری کے اکثر لوازم موجود ہیں، لیکن ہر چند تشنگی کی حد تک مختصر ہے۔ اعجاز حسین صاحب نے علم نفسیات سے ناواقفیت کے اعتراف کے ساتھ شخصیتوں کے نفسیاتی تجزیے پیش کیے ہیں اور اس تجزیے کی روشنی میں ہر ایک کے کلام پر تبصرہ کیا ہے۔ خاکہ نگاری کی صنف میں ایسا مطالعہ نئی چیز ضرور ہے، لیکن اس میں کامیابی کے لیے علم نفسیات سے واقفیت کے ساتھ شخصیت کے گہرے مطالعے اور مشاہدے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان دونوں باتوں کی کمی ان خاکوں میں محسوس ہوتی ہے۔'' [1]

غلام احمد فرقت کاکوروی (پیدائش 1914 - وفات 13 رجنوری 1973) کا شمار اردو کے اچھے مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ لیکن انھوں نے چند اچھے خاکے بھی لکھے ہیں۔ ان کے خاکوں کے تین مجموعے صید و ہدف، مداوا اور ناروا منظر عام پر آچکے ہیں، جنہیں ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی بھی ملی۔ ان کے تمام خاکوں میں سب سے مقبول خاکہ حسرت موہانی کا ہے۔ اس خاکے میں حسرت موہانی کی ایسی جیتی جاگتی تصویر لفظوں کے سہارے کھینچ دی ہے کہ مولانا کا حلیہ، وضع قطع، لباس، گفتگو کا انداز تمام چیزیں نظروں کے سامنے پھر گئی ہیں۔ مصنف نے اس میں مرقع نگاری کا ایسا کمال دکھایا ہے کہ آج تک اہل قلم کو اس پر رشک آتا ہے۔ اس میں مولانا کا ڈیل ڈول، حلیہ، حرکات وسکنات، عادات واطوار اس ہنرمندی کے ساتھ دکھائی گئی ہیں کہ مولانا نظروں کے سامنے آگے آکھڑے ہوتے ہیں۔ خوبیوں کے ساتھ ساتھ غلام فرقت کاکوروی نے ان کی کمزوریاں بھی بے کم وکاست بیان کردی ہیں۔

عبدالشکور (پیدائش 3 رجولائی 1898 بریلی - وفات 18 رمارچ 1970) نے بعض عمدہ خاکے لکھے ہیں، گوکہ انہیں خاکہ نگار کی حیثیت سے زیادہ شہرت نہیں ملی کیونکہ وہ خودنمود ونمائش اور شہرت کے خواہشمند نہیں تھے اور نہ ہی چھپنے چھپانے کے خواہاں تھے۔ خاکہ نگار اپنے ذوق طبع اور مذاق سلیم کا رنگ خاکوں میں بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی چیزیں جب صاحب قلم کو اکساتی اور ابھارتی ہیں تو وہ اپنے رنگ جمال اور ذوق خیال کا عکس اپنی تحریروں میں منعکس کرتا ہے۔ عبدالشکور کا ''یاران میکدہ'' کے نام سے مزاحیہ خاکوں کا مجموعہ

[1] اردو میں خاکہ نگاری، ڈاکٹر صابرہ سعید، ص ۱۷۴-۱۷۳

اشاعت پذیر ہوکر داد او تحسین حاصل کر رہا ہے۔ان کے خاکوں میں طنز ومزاح کے ساتھ ساتھ شوخی وظرافت کا رنگ بھی نمایاں ہے۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی شناخت اردو ادب میں مؤرخ کی حیثیت سے مسلم ہے،لیکن انہوں نے بعض مرحوم شخصیتوں کے عمدہ خاکے بھی لکھے ہیں۔تاریخی وادبی اعتبار سے ان کے خاکوں کا مجموعہ ''بزم رفتگاں'' ایک مستحکم شناخت رکھتا ہے۔وہ شخصی حقائق اور واقعاتی حوالوں سے اپنے خاکے میں جان ڈال دیتے ہیں۔انھوں نے مرحوم شخصیتوں کو اپنے خاکے کا موضوع بنایا ہے۔بزم رفتگاں کے نام سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔

معین الدین وردائی نے بھی اپنے بعض خاکوں کی وجہ سے خاکہ نگاروں کی فہرست میں اپنا نام درج کرالیا ہے۔گوکہ ان کے تمام خاکے اسلوب اور فن کے اعتبار سے کھرے نہیں اترتے،تاہم ان کے کچھ خاکے بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں۔چونکہ ان کے خاکوں میں فن کی کمزوریاں راہ پا گئی ہیں،جس کی وجہ سے ان کی شبیہ پختہ خاکہ نگار کے طور پر نہیں بن پائی۔ڈاکٹر صابرہ سعید ان کی کجی کی طرف یوں اشارہ کرتی ہیں ''ادارہ فروغ اردو زبان نے ان کے خاکوں کا ایک مجموعہ ''جلوے'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ان خاکوں میں وہ معروضیت نہیں ہے، جو کہ خاکے کے وقار کو بڑھاتی ہے۔مصنف نے شخصیتوں کی خوبیوں اور کمزوریوں کی تصویر کشی نہیں کی ہے بلکہ نکتہ چینی کی ہے، لہجے پر قابو نہیں رہ سکا ہے۔

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی علی گڑھ کے ان مایہ ناز فرزندوں میں سے تھے،جن کی علمی وادبی خدمات تشنگان علم کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔انھوں نے بعض شخصیتوں پر خاکے بھی لکھے ہیں،گوکہ خاکہ نگار کی حیثیت سے انھیں شہرت ومقبولیت نہ مل سکی۔ان کے خاتوں میں تاثراتی رنگ نمایاں ہے۔ناقدین فن ان کے اسلوب وفن کی پختگی کے صرف قائل ہی نہیں بلکہ مداح بھی ہیں۔رسالہ ''نقوش'' لاہور(1956) میں خلیل صاحب نے علی گڑھ کی بعض سرکردہ شخصیات کا خاکہ لکھا ہے۔ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب آپ کے خاکوں کے ان پہلوؤں کی طرف یوں نشاندہی کرتے ہیں'' آپ نے رسالہ نقوش(1956) کے شخصیات نمبر میں علی گڑھ کی چند شخصیتوں کے جو خاکے تحریر کیے ہیں،ان میں بعض خاکے مرقع نگاری کا عمدہ نمونہ ہیں۔'' [1]

[1] دانش گاہ علی گڑھ میں ادب،ص ۱۳۰

درج ذیل شخصیات کو اعظمی صاحب نے اپنے خاکے کا موضوع بنایا ہے۔ آل احمد سرور، اختر انصاری، اسلوب احمد انصاری، اکرام اللہ خاں ندوی، پنڈت حبیب الرحمٰن شاستری، حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، حبیب اللہ خاں، خواجہ منظور حسین، ڈاکٹر ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی، سلطان حیدر جوش، شیخ عبداللہ، ضیاء احمد بدایونی، ظفر عمر، عبدالعزیز میمن، عبدالعلیم، پروفیسر عشرت حسین، قاضی عبدالغفار، محمد حسن، محمد عزیر، محمد مقتدیٰ خاں شیروانی، مختارالدین احمد آرزو، مسعود حسین خاں، مسعود علی ذوقی، معین احسن جذبی، منشی نجم الدین اور منیب الرحمٰن۔

مذکورہ بالا شخصیتیں علمی و ادبی حلقوں میں نہ صرف اپنی مستحکم شناخت رکھتی ہیں بلکہ سب اپنے فن کے امام تصور کیے جاتے ہیں۔ خلیل صاحب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے کسی بھی شخصیت کو اس کے مقام و مدارج سے نہ تو بہت اونچا کر کے دکھانے کی کوشش کی ہے اور نہ اس کے رتبے کو اپنی بے جا علمیت کی شیخی سے پست کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کے بعض خاکے مرقع نگاری کے عمدہ نمونے ہیں۔

عصمت چغتائی (۱۹۱۵-۱۹۹۱) کو گرچہ افسانہ نگار کی حیثیت سے شہرت ملی، لیکن انہوں نے بعض عمدہ خاکے بھی لکھے ہیں۔ عصمت نے ''مجاز'' کے بعد اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی کا خاکہ ''دوزخی'' کے عنوان سے لکھا۔ عنوان سے ظاہر ہے کہ عظیم بیگ کی کوئی قابل پرستش مورتی نہیں بنائی گئی، بلکہ ان کی کمزوریوں کو واضح کیا گیا ہے۔ بچپن سے ہی ان کی صحت خراب تھی اور آخر تک ایسی ہی رہی، وہ مرزا پھوپھا کہلاتے تھے، اس کا نفسیاتی ردعمل ہوا۔ انھوں نے یہ جتانے کے لیے کہ میں کمزور نہیں ہوں، طرح طرح کی حرکتیں کیں اور خاندان میں پھوٹ ڈلوائی۔ عصمت نے ان کے کسی عیب پر پردہ نہیں ڈالا اور سب کچھ بے کم و کاست بیان کر دیا۔ ایسا لگتا ہے کہ عصمت خاکہ نگاری کے رمز سے آشنا ہیں کیونکہ ''دوزخی'' میں عصمت کا فن اور اسلوب پختگی لیے ہوئے ہیں اور شخصی مرقع نگاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے بقول: ''دوزخی بے لاگ حقیقت نگاری اور شخصی مرقع کشی کی نادر مثال ہے۔''

اسی طرح حسن عسکری کا خیال ہے کہ:

''دوزخی پورے ترقی پسند ادبی سرمائے میں ایک لازوال تخلیق کی حیثیت رکھتا ہے۔''[1]

---

[1] اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، خلیل الرحمٰن اعظمی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۴، ص ۲۳۹

دوزخی کے متعلق ڈاکٹر صابرہ سعید کا خیال ہے:

''دوزخی کا شمار اردو کے چند منفرد خاکوں میں ہوتا ہے۔ان خاکوں میں عصمت چغتائی نے اپنے خیالات و تاثرات کا اظہار بڑی بے باکی سے کیا ہے۔کردار کے تجزیے میں ان کا قلم آلہ جراحی بن جاتا ہے۔دوزخی کی کامیابی کا ذمہ دار بھی یہی اوصاف ہیں۔'' [1]

سعادت حسن منٹو(1955-1912) کے شخصی خاکوں کے تین مجموعے ''گنجے فرشتے'' 1992 میں، لاؤڈ اسپیکر 1955 میں اور فلمی شخصیتیں 1956 میں شائع ہوئے۔منٹو کے خاکوں میں طنز کا پہلو نمایاں ہے۔ منٹو کا بے لاگ تبصرہ اور بے باک تجزیہ بہتوں کی نگاہ میں خوبی نہیں کجی ہے۔منٹو کے لفظوں میں ''میں ایسی دنیا پر، ایسے مہذب ملک پر، ایسے مہذب سماج پر ہزار بار لعنت بھیجتا ہوں، جہاں یہ اصول رائج ہوں کہ مرنے کے بعد ہر شخص کا کردار اور تشخص لانڈری میں بھیج دیا جائے، جہاں سے وہ دھل دھلا کر آئے اور رحمتہ اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکا دیا جائے۔

منٹو کا کمال ہے کہ انہوں نے خاکوں میں انشائیے کا رنگ بھر دیا ہے، جس کی وجہ سے ان کے تحریر کردہ خاکے پر لطف ہو گئے ہیں، جو قاری کے حس مزاح کو گدگداتے ہیں۔ڈاکٹر صابرہ سعید کا خیال ہے کہ ''منٹو نے شخصی خاکے کو انشائیے کی حدود سے نکال کر افسانے کے قریب پہنچا دیا۔ان کے خاکے کے کردار افسانوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔تجسس، تحیر خیزی اور ڈرامائی مواقع کا استعمال منٹو کے افسانوں کی خصوصیت ہے۔ان کے خاکوں میں بھی یہ عناصر نمایاں ہیں۔منٹو نے ادبی، فلمی اور سیاسی دنیا کی مشہور شخصیتوں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔جانب داری اور رعایت سے وہ گریز کرتے ہیں۔نظر اتنی باریک اور گہری ہے کہ کوئی بات اور زندگی کا کوئی پہلو ان سے پوشیدہ نہیں رہتا اور قلم اتنا بے باک ہے کہ جو دیکھتے ہیں اسے لکھنے سے نہیں چوکتے۔'گنجے فرشتے' کے دیباچے میں منٹو لکھتے ہیں:

''میرے اصلاح خانے میں کوئی لگونگر پیدا کرنے والی مشین نہیں۔میں بناؤ سنگھار کرنا نہیں جانتا۔ آغا حشر کی بھینگی آنکھ مجھ سے سیدھی نہیں ہو سکی۔اس کے منہ سے گالیوں کے بجائے میں پھول نہیں

[1] اردو ادب میں خاکہ نگاری، ڈاکٹر صابرہ سعید، ص ۱۲۰

جھڑا سکا۔ میرا جی کی ذلالت پر مجھ سے استری نہ ہو سکی۔ اور نہ میں اپنے دوست شیام کو مجبور کر سکا کہ وہ برخود غلط عورتوں کو سالیاں نہ کہے۔ اس کتاب میں جو فرشتہ بھی آیا ہے، اس کا مونڈن ہوا ہے۔ اور یہ رسم میں نے بڑے سلیقے سے ادا کی ہے۔ ان شخصیتوں کی تصویریں انہوں نے ایک ایک نئے زاویے سے کھینچی ہیں۔ وہ ہر شخصیت کو افسانوی کردار کی طرح آہستہ آہستہ ابھارتے ہیں۔ منٹو کا یہ منفرد انداز اور کامیاب تجربہ خاکے کے لیے نئی چیز ہے اور اس صنف میں ان کی فن کاری نئے امکانات کی نشاندہی کرتی ہے۔'' [1]

علی گڑھ کے موجودہ دور کے خاکہ نگاروں کے ذکر جمیل کے بغیر یہ باب نامکمل رہے گا کیونکہ عہد حاضر میں علی گڑھ کے بہت سے ایسے خاکہ نگار ہیں، جو اس صنف کو اپنے قلم کی روشنائی سے توانائی اور تابندگی بخش رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ بزم رفتگاں کی زینت بن چکے ہیں، تو کچھ قید حیات کی پابندی جھیل رہے ہیں اس شعر کے مصداق:

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

سید حامد، حمیدہ اختر حسین، کبیر احمد جائسی اور نور الحسن نقوی مرحوم اسی سلسلۃ الذہب کی اہم کڑی ہیں، جو عصر حاضر میں خاکہ نگار کی حیثیت سے ممتاز و مفتخر مقام پر فائز ہیں۔

سید حامد (پیدائش 7 رجنوری 1920) اردو اور فارسی جدید کلاسیکی ادب کے رمز شناس اور نکتہ داں ہیں۔ حامد صاحب کی مرصع تحریریں، شگفتہ اور رواں اسلوب عوام و خواص میں انتہائی مقبول ہیں۔ ''نگار خانۂ رقصاں'' آپ کی مشہور تصنیف ہے۔ حامد صاحب نے مشاہیر علم و ادب کے علاوہ سماجی رہنماؤں اور ملی کارکنوں کے بعض عمدہ خاکے بھی لکھے ہیں۔ آپ نے مدر ٹریسا (مشمولہ ''قلم اور قدم'' مضامین کا مجموعہ 1995)، مسز اندرا گاندھی (مشمولہ ''کرب آگہی'' مضامین کا مجموعہ تاج کمپنی دہلی 1987)، بدر الدین طیب جی (مشمولہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ اپریل 1996) اور خواجہ منظور حسین (مشمولہ نقد و نظر خواجہ منظور حسین نمبر 1985) پر جو خاکے لکھے ہیں وہ مرقع نگاری، شخصیت نگاری اور تصویر کشی کے عمدہ نمونے ہیں۔ یوں تو آپ

[1] اردو ادب میں خاکہ نگاری ڈاکٹر، صابرہ سعید، ص ۱۷۰

کے تمام خاکے بہتر ہیں، لیکن جس خاکے کی بدولت بطور خاکہ نگار آپ کو شہرت ملی وہ ہے متحرک سیاسی شخصیت، خاتون آہن محترمہ اندرا گاندھی کا خاکہ۔ بقول ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب:

''مذکورہ شخصیات پر آپ نے جو خاکے لکھے ہیں وہ مرقع نگاری کا عمدہ نمونہ کہے جا سکتے ہیں۔ بالخصوص مسز اندرا گاندھی سے متعلق انہوں نے جو خاکہ لکھا ہے، اسے ہم اردو کے چند نمائندہ خاکوں کی فہرست میں نمایاں طور پر شامل کر سکتے ہیں۔'' [1]

حمیدہ اختر حسین کے خاکوں کے مجموعے ''نایاب ہیں ہم'' (مکتبہ دانیال کراچی اشاعت سوم کراچی) اور ''چہرے مہرے'' (مکتبہ دانیال کراچی طبع اوّل 2003) کے نام سے شائع ہوئے۔ اوّل الذکر مجموعہ سات خاکوں پر مشتمل ہے۔ اس میں دو خاکے انہوں نے اپنی والدہ اور شوہر کی شخصیت پر لکھے ہیں۔ اس مجموعے کا سب سے اہم خاکہ مولوی عبدالحق کی شخصیت پر مبنی ہے، جو ''ہمارے مولوی صاحب'' کے عنوان سے ہے۔ زیر نظر خاکے میں مولوی صاحب کی ایسی تصویر کشی کی گئی ہے، جس سے اردو داں طبقہ نا آشنا ہے۔ مولوی صاحب کی بے تکلف شبیہ سے سبھی لوگ تو واقف ہیں، لیکن شوخ طبیعت اور چنچل طبیعت، چلبلے پن اور ان کی بچکانہ عادتوں سے کم ہی لوگ آگاہ ہیں۔ اس خاکے میں بہت سی باتیں صاحب قلم کی موشگافی اور بوقلمونی کا نتیجہ ہیں۔ ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب کی رائے اس خاکے سے متعلق یوں ہے:

''حمیدہ اختر حسین کا سب سے اہم خاکہ مولوی عبدالحق کے سلسلے میں ''ہمارے مولوی صاحب'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں خاص بات یہ ہے کہ مولوی صاحب کو جن حیثیتوں سے ہم جانتے ہیں، اس سے بہت مختلف بلکہ متضاد قسم کی تصویر ان کے اس خاکے میں پیش کی گئی ہے۔ جسے بغور دیکھنے کے بعد یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ بابائے اردو ایک کھلنڈرے اور خاصے بے تکلف قسم کے انسان تھے، جو موقع و محل کا لحاظ کیے بغیر بعض دفعہ بالکل بچوں جیسی حرکت پر اتر آتے تھے۔ ظاہر ہے اس میں بہت سی باتیں زیب داستاں کے لیے شامل کر دی گئی ہیں۔ تاہم یہ داستان بڑی ہی پر لطف ہے اور ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ [2]

---

[1] دانش گاہ علی گڑھ میں ادب، ص ۱۳۲ [2] دانش گاہ علی گڑھ میں ادب، ص ۱۳۳-۱۳۲

''چہرے مہرے'' میں صائمہ، جمیل جالبی، پاشی اور ڈاکٹر نیوس کے خاکے شامل ہیں۔ یہ تمام خاکے فنی چابکدستی کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ شخصیت کی تصویر کشی کے اعتبار سے ''چہرے مہرے'' کے تمام خاکے قابل ذکر ہیں۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ خاکے بہتر ہیں، حمیدہ کو عمدہ نثر لکھنے میں کمال حاصل ہے۔

پروفیسر کبیر احمد جائسی (14 رنومبر 1934) کے خاکوں کا مجموعہ ''ڈھونڈو کے انہیں'' ادارۂ قرطاس، کراچی سے 2002 میں شائع ہوا تھا۔ اس میں 12 خاکے شامل ہیں۔ زیر نظر مجموعے میں علمی، ادبی شخصیتوں کے علاوہ عالم دین، شعراء و ادباء شامل ہیں۔ مولوی چراغ علی، نواب محمد اسحاق خاں، پنڈت حبیب الرحمٰن شاستری، خلیل الرحمٰن اعظمی، نسیم قریشی، پروفیسر مشیر الحق، مولانا تقی امینی، ڈاکٹر ممتاز علی خاں، معین احسن جذبی اور سرور صاحب کے علاوہ موجودہ شخصیات میں نذیر احمد اور مسعود حسین خاں صاحب کے خاکے بھی اس میں موجود ہیں۔ خاکہ نگار نے ایجاز و اختصار کے بجائے طوالت کا سہارا لیا ہے، جس کی وجہ سے بعض مرتبہ قاری اس وہم میں مبتلا ہوسکتا ہے کہ وہ خاکہ کے بجائے سوانح کی دنیا کی سیر کر رہا ہے۔ موصوف کے خاکوں میں شخصیت کی زندگی کے بہت سے غیر ضروری گوشے جگہ پا گئے ہیں، لیکن بعض مقامات پر ایسا ناگزیر بھی ہے۔ بے جا طوالت، جزئیات نگاری، شخصیت کی زندگی کے اکثر و بیشتر گوشے کی وضاحت سے ان کے خاکوں پر سوانحی انداز اور تحقیقی رنگ غالب ہے، لیکن شخصیات سے متعلق جو بیش بہا معلومات ان خاکوں میں جمع ہوگئی ہیں، اس لحاظ سے ان کی اہمیت و افادیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ خاکہ نگار کا کمال یہ ہے کہ وہ زندہ شخصیتوں کا احترام اور لحاظ رکھتے ہوئے عقیدت سے مغلوب نظر نہیں آتے اور نہ ہی مردہ شخصیتوں کو ماورائی مخلوق تصور کرتے ہیں کہ جن کی شخصیت کمال و خوبی کا مجموعہ ہو۔ ڈاکٹر شہاب الدین کا خیال ہے کہ ''مرحوم شخصیتوں پر قلم اٹھاتے ہوئے عقیدت سے مغلوب ہونے کا اندیشہ رہتا ہے اور زندہ شخصیات پر لکھتے ہوئے ان کا لحاظ اور احترام غالب آجاتا ہے، لیکن خاکہ نگار نے سلامت روی کے ساتھ یہ خارزار بھی طے کرلیا ہے۔'' [1] مذکورہ شخصیات کی نادر و نایاب تصاویر کی بدولت کتاب کی کشش، جاذبیت اور اہمیت میں چار چاند لگ گئے ہیں۔

[1] دانش گاہ علی گڑھ میں ادب، ص ۱۳۳

پروفیسر نورالحسن نقوی (پیدائش 2 رمئی 1933) کے 15 خاکوں کا مجموعہ تصویریں اجالوں کی 1999 میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس میں مولوی عبدالحق، حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، ذاکر صاحب، سرور صاحب، پروفیسر علی محمد خسرو، سید حامد، کرنل بشیر حسین زیدی، ڈاکٹر اطہر پرویز، محمد نسیم فاروقی وغیرہ کے قلمی مرقعے نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیے گئے ہیں اور ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی نے اس پر ایک عمدہ پیش لفظ بھی تحریر کیا ہے۔ نور صاحب زبان کی باریکی، سلاست اور روانی کی خوبی سے آگاہ ہیں، اس لیے وہ نہایت شستہ رواں نثر لکھتے ہیں۔ مذکورہ شخصیتوں کے خاکوں میں زبان و بیان کی تمام خوبیاں در آئی ہیں۔ آبشار کے بہاؤ جیسی روانی، نغمگی، موسیقیت آپ کی نثر کے امتیازات ہیں۔ شخصیت کی خوبیوں کے اظہار میں کشادہ ظرفی اور سخاوت اور نقائص کے بیان میں بخل اور بے اعتنائی آپ کا طرۂ امتیاز ہے۔ شخصیت کی اچھائیوں کو آپ نے وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ آپ کے تمام خاکے اسلوب وفن کے اعتبار سے پختہ ہیں۔

''شنیدہ و دیدہ'' پروفیسر اختر الواسع کا 25 شخصی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں شامل بہت سی شخصیتوں سے مصنف کا ذاتی تعلق رہا، لیکن انہوں نے ان سب کو اپنی ذات کے حوالے سے نہیں بلکہ ان کی خدمات اور خوبیوں کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ یہ وہ شخصیتیں ہیں، جن کے افکار و نظریات نے مصنف کے لوح دل پر زندگی کی رفعتوں کو نقش کیا ہے۔

شنیدہ و دیدہ میں خاکے کا افسانوی رنگ نہیں ہے اور نہ ہی شوخی و ظرافت کا حسین بانکپن ہے۔ طنز و مزاح کا پہلو بھی عنقا ہے۔ ان سب کے باوجود اس پر خاکے کا اطلاق ہوسکتا ہے کیونکہ اس میں خاکے کا رنگ و آہنگ شامل ہے اور اس کا پیرایہ بیان خاکے کے مماثل ہے۔ ان شخصی مضامین کا محرک ہندوستانی تہذیب کی نمائندہ شخصیتوں کے وہ روشن کارنامے ہیں، جو ظلم و جبر، بدعقیدگی، جہالت و ناخواندگی کی شب تاریک میں بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم لے جانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ بقول مصنف:

> ''زیر نظر کتاب ہند اسلامی تہذیب کی نمائندہ ان شخصیات کے بارے میں ہے جنہوں نے انیسویں اور بیسویں صدی میں ہندوستان اور ہندوستانی مسلمانوں کی علمی و فکری تہذیبی اور علمی تاریک پر بہت گہرے نقش قائم کیے ہیں اور جن سے تحریک و تعمیر کے ایسے سلسلے جاری ہوئے ہیں، جو آج بھی

ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی آسودگی اور فکری آبیاری کر رہے ہیں۔'' [1]

مضامین میں گو کہ عقیدت کا پہلو غالب ہے، لیکن مبالغہ نہیں ہے۔ بقول عبدالقادر شمس:

''عقیدت و احترام میں ڈوب کر لکھے جانے کے باوجود ان میں مبالغہ آرائی محسوس نہیں ہوتی، بلکہ اس کی حیثیت دستاویزی ہے اور تاریخی اعتبار سے بھی اس کتاب کو استناد کا مرجع و مآخذ کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ [2]

مذکورہ کتاب میں شخصیات پر مضامین مصنف کے اپنے مزاج اور طبیعت کے آئینہ دار ہیں۔ ان کا اسلوب نہ گنجلک ہے اور نہ ہی پیچیدہ، نہایت رواں دواں اور سشتہ نثر ہے۔ قاری کو ترسیلی دشواریوں اور دقتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جو کہنا چاہتے ہیں وضاحت، صراحت اور قطعیت کے ساتھ کہہ دیتے ہیں۔ بی اماں کے انتقال سے متعلق لکھتے ہیں:

''لیکن قضا و قدر پر کسی کا قابو نہیں، وہ نحیف و نزار اور ضعیف خاتون، جس کو حکومت انگلستان کا کوئی قانون زیر نہ کر سکتا تھا، قدرت کے قانون کے ذریعہ 13-12 رنومبر کی درمیانی شب 1924 کو ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئیں۔ [3]

ڈاکٹر مختار انصاری کی وفات سے متعلق لکھتے ہیں:

''ہر خاص و عام کے ساتھ وصل خواہی کے اسی جذبے نے انہیں صلح کل کا مبلغ، اس راہ کا سرگرم مجاہد اور آخر کو اس منزل تک پہنچنے کی کوشش کرنے والوں کا قافلہ سالار بنا دیا تھا۔ آخر کار اسی سمت سفر کرتے کرتے وہ اس جگہ چلے گئے، جہاں جانے والے واپس نہیں آتے۔ صرف ان کی یاد باقی رہ جاتی ہے۔'' [4]

سیدین صاحب کے نظریہ تعلیم سے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

---

[1] شنیدہ و دیدہ، پروفیسر اختر الواسع، رضا لائبریری، رام پور، یوپی، 2007، ص ۱۶

[2] امنگ، روزنامہ راشٹریہ سہارا، 15 رجون 2008، ص ۲

[3] شنیدہ و دیدہ، بی اماں: مادرانہ شفقت کا آہنی پہلو، ص ۷۴ [4] شنیدہ و دیدہ، مرگ مجنوں پہ عقل گم ہے دیر، ص ۸۰

''سیدین صاحب کا تعلیم کا تصور بہت وسیع جامع اور ہمہ گیر ہے جو انسانی شخصیت کے ہر پہلو، معاشرتی زندگی کے ہر شعبے اور تہذیب کے ہر مظہر کا احاطہ کرتا ہے۔ تعلیم ان کے نزدیک محض علم یا معلومات کے حصول کا ذریعہ نہیں ہے جو انسان کو زندگی گزارنے کے وسائل فراہم کرتی ہے، بلکہ ایسی جامع انسانی شخصیت کی تشکیل کا وسیلہ ہے، جس میں اعلیٰ وارفع انسانی وتہذیبی قدروں کا شعور خون کی طرح رواں دواں ہو، جس کا ضمیر روشن ہو اور جس مین تمام تر اعلیٰ اخلاقی اقدار مکمل وضاحت وترتیب وتوازن کے ساتھ جلوہ ریز ہوں۔'' [1]

سیدین صاحب کے نزدیک گہری اقدار شناسی، شرافت عام انسانی محبت وسعت نگاہی، فراخی قلب، بے تعصبی، رواداری، عدل پسندی، اخلاف کا احترام، ہمدردی اور ہم احساسی، خداترسی، عفوودرگزر، صلہ رحمی اور تالیف قلب ایسی صفات ہیں، جن سے ایک اچھے انسان کا اخلاقی شناس نامہ ترتیب پاتا ہے۔

دانش گاہ علی گڑھ کے خاکہ نگاروں کے تعلق سے رسالہ ''فکرونظر'' کے ان چار خصوصی شماروں کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جو ''ناموران علی گڑھ'' کے عنوان سے پروفیسر نورالحق نقوی اور پروفیسر شہریار کی ادارت میں شائع ہوئے تھے۔ جن میں مشاہیر علی گڑھ کی حیات وخدمات پر زیادہ تر یہیں کے ارباب اہل علم نے مضامین لکھے تھے اور اس کے بعض مضامین خاکہ نگاری کا ہی نمونہ کہے جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ علی گڑھ کے مشہور اولڈ بوائے شان الحق حقی (پیدائش 15/ستمبر 1917 انتقال 11/اکتوبر 2005) نے بھی 24 شخصیات کے خاکوں پر مشتمل ایک مجموعہ ''نگارخانہ'' کے نام سے اشاعت کے لیے اپنی وفات سے کچھ پہلے تیار کیا تھا۔

علی گڑھ کے خاکہ نگاروں کی انفرادیت ہر جگہ نظر آتی ہے۔ موضوعات اور شخصیات کی یکسانیت کے باوجود ایک کا خاکہ کسی دوسرے کی نقل معلوم نہیں ہوتا۔ زبان وبیان کے علاوہ شخصیت کی زندگی کے واقعات اور گمنام گوشوں کے اظہار میں بھی ان کے خاکے ایک دوسرے سے یکسر منفرد مختلف نظر آتے ہیں۔ زبان اور اسلوب بھی ایک دوسرے کا چربہ نہیں معلوم ہوتے۔ ہر خاکہ نگار ایک نئے اسلوب کا موجد اور تشبیہات و

[1] شنیدہ ودویدہ، پروفیسر اختر الواسع، رضا لائبریری، رام پور، یوپی، خواجہ غلام السیدین اسلامی آفاقیت کے نقیب، ص ۱۹۸

استعارات کا خالق نظر آتا ہے، یہی علی گڑھ کا امتیاز ہے۔ جس کی وجہ سے علی گڑھ کے فارغ التحصیل پوری دنیا میں اپنی نظیر آپ کے مصداق ہیں۔ مولانا محمد علی پر مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی اور عبدالماجد دریابادی نے خاکے لکھے لیکن یہ تینوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اور شخصیت نگاری کے لحاظ سے بھی۔ اسی طرح علی گڑھ کے خاکہ نگاروں نے طویل، مختصر، سوانحی، تعارفی، تاثراتی، اجتماعی، مزاحیہ اور مدحیہ ہر قسم کی خاکہ نگاری کے قابل قدر نمونے پیش کیے۔ ان معروضات کی روشنی میں یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ علی گڑھ کے ہی قلم کاروں نے خاکہ نگاری کو بھی سمت و رفتار اور معیار و اعتبار عطا کیا۔

بابِ سوم

علی گڑھ میں خودنوشت نگاری کا ارتقا

(بیسویں صدی کے خودنوشت نگاروں کے حوالے سے)

غیر افسانوی نثر کی دیگر اصناف کی طرح خودنوشت بھی قدیم نثری بیانیہ ہے۔ دنیا کی بیشتر علمی و ادبی زبانوں میں خودنوشت کی ایک مستحکم روایت ہے۔ عربی اور انگلش کے زیر اثر یہ صنف اردو میں آئی۔ خودنوشت کا مقصد دوسروں کو اپنے تجربات و مشاہدات میں شریک کرنا، اپنی نجی اور ذاتی زندگی سے دوسروں کو متعارف کرانا ہے۔ زندگی کے محض چند پہلوؤں کا اظہار بھی خودنوشت کے مقاصد میں شامل ہے۔ یہ فن جتنا آسان ہے اتنا ہی مشکل بھی، کیونکہ تعلّی کا اظہار، رفعتوں کا بیان انسان کو اچھا لگتا ہے جب کہ اپنی خامیوں کا اعتراف کمزوریوں کا اقبال انسانی طبیعت پر گراں گر ہوتا ہے۔ خودستائی انسانی سرشت میں داخل ہے اور یہی مقام خودنوشت نگار کے لیے ایک بڑے امتحان کا ہوتا ہے۔ اس لیے خودنوشت کو دو دھاری تلوار پر چلنے سے تعبیر کیا جاتا ہے اس میں ''نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن'' کی کیفیت ہوتی ہے۔ کیونکہ کوئی انسان اپنے زخموں پر نمک پاشی نہیں کرنا چاہتا۔ چونکہ اپنی کمزوریوں کا برملا اعتراف، اپنی خامیوں کا علی الاعلان اقرار زخموں پر نمک چھڑکنے کے مشابہ ہے۔ تعلّی سے خودنوشت کا فن مجروح ہوتا ہے جب کہ سچائی کا اعتراف خودنوشت کے حسن کو دوبالا کرتا ہے۔ علی گڑھ کے قلم کاروں نے خودنوشت کی صنف میں نہ صرف طبع آزمائی کی بلکہ اپنے مطالعے، مشاہدے، تجربے اور جودتِ طبع کے ذریعہ اس صنف کو لائق اعتبار بنا دیا۔ فنی، ہیئتی اور موضوعاتی سطح پر یہ خودنوشتیں کسی کی تتبع نہیں، بلکہ ان کی جدت طبع کی آئینہ دار اور حسن و قبح کا امتزاج معلوم ہوتی ہیں۔ اس کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نظم نگار اختر الایمان کی خودنوشت ''اس آباد خرابے میں'' موصوف کی شخصیت کی

خوبی وخامی کا حسین امتزاج ہے۔خودنوشت میں انہوں نے نہ اپنی ذات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے اور نہ ہی اپنی خامیوں کی پردہ پوشی کی ہے، ان کی جیسی زندگی تھی، انہوں نے جیسے زندگی کے ایام گزارے تھے، انہیں زندگی نے جن پڑاؤ اور جن موڑ پر لا کھڑا کیا تھا، اس کا برملا اظہار اس میں موجود ہے۔ یہی خوبی انہیں دیگر خودنوشت نگاروں سے ممتاز وممیّز کرتی ہے۔اسی طرح ''آشفتہ بیانی میری'' رشید احمد صدیقی کی خودنوشت بھی اردو کی نمایاں خودنوشت میں شمار ہوتی ہے، کیونکہ انہوں نے کذب وافترا سے گریز کرتے ہوئے حقیقت نگاری اور سچائی کا دامن تھاما ہے، جس کی وجہ سے ان کی خودنوشت معتبر صفات کی حامل ہوگئی ہے۔اس خود نوشت میں علی گڑھ کا روشن ماضی پوری طرح سانس لیتا نظر آتا ہے۔

''اعمال نامہ'' میں سر رضا علی کی زندگی کھلی کتاب نظر آتی ہے۔ واقعات کے بیان اور خوبیوں کے اظہار میں موصوف نے دیانت داری اور انصاف سے کام لیا ہے۔ رضا علی انگریزی زبان سے گہری واقفیت رکھتے ہیں اور انگریزی خودنوشت کے فن سے بھی واقف ہیں، اس لیے انہوں نے شعوری طور پر فنی محاسن کا خیال رکھا ہے۔تاریخی اعتبار سے بھی ان کی خودنوشت اہمیت کی حامل ہے۔

''آپ بیتی'' مولانا عبدالماجد دریابادی کی خودنوشت بھی اردو کی نمایاں خودنوشتوں میں شمار کی جاتی ہے۔انہوں نے خوبیوں کے اظہار اور خامی کے بیان میں انصاف سے کام لیا ہے۔نئی وسعتوں کی تلاش وجستجو اور نئے افق کی تمنا ان کی خودنوشت کا نصب العین ہے۔

''برگ گل'' کے مصنف پروفیسر مقبول احمد بنیادی طور پر عربی کے عالم ہیں لیکن وہ دنیا کی بیشتر زبانوں سے واقفیت رکھتے ہیں۔ان کی زندگی میں ٹھہراؤ نہیں اضطرار ہے۔اس دشت کی سیاحی میں انہوں نے عمر عزیز کا بیشتر حصہ گزارا ہے، اس لیے جغرافیائی کیفیت ان کی خودنوشت میں پیدا ہوگئی ہے۔مولانا حالی نے مطالعہ کائنات کو شاعر کے لیے لازمی قرار دیا ہے، کیونکہ سفر سے انسان کے مشاہدات وتجربات میں وسعت اور فکر میں گہرائی آتی ہے۔ایک خودنوشت نگار کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کائنات کی پہنائیوں میں گم ہوکر فطرت کے حسین نظاروں کو قریب سے دیکھے، کیونکہ غور وفکر اور مطالعاتی عمق تخلیق وتصنیف کو پرمغز بناتی ہیں۔ان اوصاف سے مقبول صاحب کی خودنوشت مزین ہے۔

آل احمد سرور کی خودنوشت ''خواب باقی ہیں'' امیدوں حسرتوں کے برآنے کا اظہار ہے۔ انھوں نے اپنی علمی فتوحات کا بیان قدرے تفصیل سے کیا ہے۔ ان کی پوری زندگی حصول علم اور مقبولیت سے عبارت ہے۔ اس کے باوجود انسان کی بہت سی خواہشیں، تمنائیں اور آرزوئیں پوری نہیں ہو پاتیں، ''کیونکہ بہت سے خواب ہیں پامال لیکن خواب باقی ہیں'' خودنوشت میں سرور صاحب کی دل آویز شخصیت اپنی تمامتر جلوہ سامانیوں کے ساتھ روشن ہے۔ خودنوشت کے مطالعے کے بعد قاری نہ صرف سرور صاحب کی علمی بصیرت کا قائل ہوتا ہے بلکہ ان کی ذہانت کا بھی معترف ہو جاتا ہے، کیونکہ انہوں نے اپنی زندگی کے واقعات بھی اسی جزئیات نگاری کے ساتھ پیش کیے ہیں جس باریکی اور دقتِ نظر کے ساتھ انھوں نے زندگی کو دیکھا ہے۔

اس کے علاوہ میں کیا میری حیات کیا، یادوں کی دنیا، یادوں کی بارات، گھومتی ندی، گرد راہ، گفتنی ناگفتنی، یادایام، ورود مسعود وغیرہ ایسی خودنوشت ہیں، جن میں زندگی کی تلخی اور شیرینی تمام تر سچائیوں کے ساتھ روشن ہے اور جو خودنوشت کے فن اور معیار پر کھری اترتی ہیں۔ علی گڑھ کے خودنوشت سوانح نگاروں کی فہرست کافی طویل ہوسکتی ہے، لیکن یہاں پر فن واسلوب کے اعتبار سے نمائندہ خودنوشتوں کا ہی ذکر کیا جائے گا۔

خودنوشت کی ہنوز کوئی جامع و مانع تعریف نہیں کی گئی ہے، اس کے باوجود علمائے ادب نے اس کی تعریف بیان کی ہے۔ ڈاکٹر وہاج الدین علوی کے خیال میں خودنوشت کا مفہوم:

> ''کسی شخص کی زندگی کا اس کے قلم کے ذریعہ نقشہ کھینچا جانا ہے۔'' نقشہ اور منظر نگاری شعوری طور پر کی جاتی ہے اور فنکارانہ انداز میں ہوتی ہے۔ اس لیے خودنوشت، سوانح نگاری ایک ادبی اور تخلیقی فن قرار پاتا ہے۔ جس کے ڈانڈے تاریخ نفسیات اور عمرانیات سے ملتے ہیں۔ [1]

علمائے مغرب نے اس جانب خصوصی توجہ مبذول کی۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں خودنوشت کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے:

> ''خودنوشت، سوانح نگاری کا سوانح نگار سے ہی بہت قریبی تعلق رہا ہے یا یہ کہ خودنوشت سوانح نگاری سوانحی ادب کی ایک خاص شکل ہے۔ یہ خودنوشت ایک شخص کے حالات زندگی پر مشتمل ہوتی ہے جو اس نے خود قلم بند کیے ہوں اس لیے یہ پوری نہیں ہوتی۔ [2]

---

۱ اردو خودنوشت فن و تجزیہ، ڈاکٹر وہاج الدین علوی، لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی، ۱۹۸۹، ص ۳۱

۲ انسائیکلوپیڈیا برٹانکا ہیلن ہمنگ وے بٹن پبلشر جلد دوم شکاگو ۷۴-۱۹۷۳، ص ۱۰۰۹

رائے پسکال کا خیال ہے:

''خودنوشت سوانح میں زندگی کے کسی حصے کو ان حقیقی حالات کے تحت دہرایا جاتا ہے جن میں ان واقعات نے جنم لیا...خودنوشت نگار کی ذات ہی اس کا محور ہوتی ہے حالانکہ خارجی دنیا بھی اس میں نظر آتی ہے۔ اس میں روزمرہ کے کاروبار اور اس کے ماحول کی وہ جھلک نظر آتی ہے جس میں مصنف کی شخصیت کی تشکیل ہوتی ہے۔'' [1]

خودنوشت اور سوانح میں کچھ نکات قدرے مشترک ہیں، وہ یہ کہ دونوں انسانی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ جس میں انسان کے مشاہدے، مطالعے اور تجربے کا عمل دخل ہوتا ہے لیکن اس اشتراک کے باوجود دونوں میں بہت سے انفرادی پہلو ہیں۔ وہ یہ کہ خودنوشت سوانح میں انسان اپنے حالات اور واقعات زندگی خود قلم بند کرتا ہے برعکس اس کے سوانح میں سوانح نگار دوسروں کی زندگی کے واقعات از حیات تا ممات ضبط تحریر میں لاتا ہے۔ خودنوشت مکمل زندگی کا احاطہ نہیں کرتی جبکہ سوانح پوری بسیط زندگی پر محیط ہوتی ہے۔ خودنوشت صداقت کی متقاضی ہوتی ہے اس لیے خودنوشت سوانح کے لیے ضروری ہے کہ اس میں صداقت کا عنصر ہو، تعلّی سے گریز ہو، محاسن و معائب کا بیان ہو، زندگی سے متعلق جو واقعات ہیں ان کا بیان بے کم و کاست کیا جائے، علمی برتری، ثقافتی، تہذیبی، نفسیاتی پہلوؤں کے بیان میں نہ بخل سے کام لیا جائے اور نہ خودستائی سے کیونکہ خودنوشت کا مقصد دوسروں کو اپنی زندگی کے نہاں خانوں سے متعارف کرانے کے ساتھ ساتھ اپنے تجربات و مشاہدات میں شریک کرنا بھی ہوتا ہے لہٰذا خودنوشت نگار کی یہ کوشش ضرور ہونی چاہئے کہ وہ فحش واقعات نہ بیان کرے کیونکہ اس سے شخصیت مجروح ہوتی ہے اور وقار پر بھی حرف آتا ہے۔ ہمارے مشرقی معاشرے میں برائی، بدکاری اور فحش واقعات کا بیان معیوب سمجھا جاتا ہے اور مذہب بھی ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔

''خودنوشت کا انداز جداگانہ ہوتا ہے۔ اس کا قلم اپنے جذبات و احساسات اور مشاہدات کو لوگوں تک پہنچانے میں بے باک اور آزاد ہوتا ہے۔ وہ خود اپنی ذات کا محور ہوتا ہے۔ خود ہی نظر ہے اور خود ہی آئینہ

K-7224

[1] رائے پسکال، آٹو بائیوگرافی ٹرتھ اینڈ ڈیزائن پیج برادرز نارویچ لمیٹڈ، لندن، ۱۹۶۰، ص ۹

اوراس آئینے میں اپنی ذات کے تجربوں، مشاہدوں اوران سے پیدا ہونے والی نفسیاتی کیفیات کا ناظر بھی ہے۔خودنوشت کا مصنف خوداپنے قلم سے واقعات کوتحریر کرتا ہے اس لیے وہ خوداپنی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتا ہےاورقلم کے ذریعے دوسروں کواپنے تجربوں میں شریک کرتا ہےاوراپنی کہانی سناتا ہے۔(۳)

خودنوشت بنیادی طور پرآپ بیتی ہے کیونکہ خودنوشت نگاراپنی خودنوشت میں اپنے زندگی کے احوال و کوائف بیان کرتا ہے، ان ہی حادثات وواقعات کوقلم بند کرتا ہے جواس کے دل پر بیتے ہوں، اس لحاظ سے طفیل احمد کی تعریف مناسب معلوم ہوتی ہے:

> ''مختصر لفظوں میں آپ بیتی کسی انسان کی زندگی کے تجربات، مشاہدات، محسوسات ونظریات کی مربوط داستان ہوتی ہے، جواس نے سچائی کے ساتھ بے کم وکاست قلم بند کردی ہو، جس کو پڑھ کراس کی زندگی کے نشیب وفراز معلوم ہوں، اس کے نہاں خانوں سے پردے اٹھ جائیں اور ہم اس کو خارجی زندگی کی روشنی میں پرکھ سکیں۔'' [۱]

اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو ادب اور اردو کی ادبی کائنات کوعلی گڑھ نے خوب مالا مال کیا ہے۔ خودنوشت میں بھی علی گڑھ کا مقام نمایاں ہے۔سر رضا علی کی ''اعمال نامہ''، رشید احمد صدیقی کی ''آشفتہ بیانی میری''، یوسف حسین خاں کی ''یادوں کی دنیا''، خواجہ غلام السیدین کی ''مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں'' اورآل احمد سرور کی ''خواب باقی ہیں'' اس طرح کی زائداز پچاس معیاری خودنوشتیں علی گڑھ کی ہی پیداوار ہیں۔ یہ خود نوشتیں استاد، ادیب، پارسا، شاعر، عالم دین، سیاستداں، انجینئر، فلم ساز، حکومت وقت کے باغی اور انقلابی وغیرہ سبھی طرح کے قلم کاروں کی ہیں۔اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ ایسی گوناگوں شخصیات کی تحریروں اور تجربات کا قابل فخر اجتماع علی گڑھ کے علاوہ شاید ہی کسی دوسرے دانش کدۂ علمی کے حصے میں آیا ہو۔

ان خودنوشت نگاروں میں سرسید احمد خاں اوران کے نامور رفقائے کارکو دیکھنے والے، ان کے ساتھ کام کرنے والے، سعادت حاصل کرنے والے، علی گڑھ تحریک کے مدوجزر کو دیکھنے اور سمجھنے والے اورینٹل کالج کی پہلی نسل سے وابستہ شیخ عبداللہ اور میر ولایت حسین بھی ہیں۔1920 سے لے کر حصول آزادی تک

[۱] اردو خودنوشت فن وتجزیہ، ڈاکٹر وہاج الدین علوی، لبرٹی آرٹ پریس، دریا گنج، نئی دہلی، ۱۹۸۹، ص ۳۳-۳۲

اور اس کے بعد بھی ہر عہد کی شخصیات ہیں۔ دنیا کے مختلف ملکوں میں پھیلے علیگ کن کن شعبوں میں کیا کیا خدمات انجام دے رہے ہیں، یہ خودنوشتیں سر سید احمد خاں کے دور سے لے کر حال تک کے حالات وحوادث کی ایک مسلسل داستان پیش کرتی ہیں۔

خودنوشتیں اپنے عہد کی غماز ہوتی ہیں اور اپنے دامن میں ہر طرح کے تغیر وتبدل کو سمیٹے رہتی ہیں۔ ان گزرے ہوئے سو سالوں میں علی گڑھ نے ملک وقوم کو کیا دیا اور علی گڑھ کی دنیا میں کیا کیا تغیرات وقوع پذیر ہوئے، علی گڑھ ہماری امیدوں پر کہاں تک کھرا اترا، موجودہ مسائل اور آئندہ کے اندیشے، زندگی اور زمانے کی تبدیلیوں سے علی گڑھ کتنا متاثر ہوا، علی گڑھ کی پروردہ شخصیات کے کارناموں کے علاوہ اور بہت کچھ ان خود نوشتوں میں موجود ہے جو دستاویزی حیثیت کی حامل ہیں۔ بقول مہر الٰہی ندیم:

''یہ خودنوشتیں ماضی کی دستاویزات بھی ہیں، حال کی پہچان بھی اور مستقبل کی بشارت بھی۔''[1]

''اس آباد خرابے میں'' (اشاعت دوم ۱۹۹۶ء) اردو اکادمی، دہلی نامور شاعر اختر الایمان کی مقبول ترین خودنوشت ہے۔ یہ خودنوشت خود شناسی و دیگراں شناسی کے مرحلے سے بہت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ گزری ہے۔ اس خودنوشت کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے اس میں کہیں بھی کسی بھی لمحے کے سچ کو چھپانے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ اپنی زندگی کے اندھیرے واجالوں کو واضح طور پر روشن کر دیا ہے، یہی خوبی اور یہی سچائی اس آباد خرابے کو مقبولیت وشہرت عطا کرتی ہے۔ اختر الایمان کی خودنوشت کو پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ درد کے کتنے مراحل، کرب کے کتنے پڑاؤ اور آہ وفغاں کی کتنی پر پیچ منزلوں سے گزرے تھے۔ ان کے والد حافظ فتح محمد جو قدرے رنگین اور شوخ مزاج تھے، ان کا جمیلہ نامی ایک لڑکی سے اچھا خاصا شغف تھا، اختر الایمان نے اس واقعے کو خود لکھا ہے:

''میرے والد امامت کا پیشہ کرتے تھے، انہوں نے مذہبی تعلیم حاصل کی تھی، بہت اچھے قاری تھے، انہیں دیہات پسند تھے، امامت کے علاوہ مسجد کے صحن میں مکتب کھولتے تھے، جہاں دیہات کے ہر عمر کے لڑکے لڑکیاں پڑھنے آتے تھے، کمباسی میں جمیلہ نام کی ایک لڑکی ان کے پاس پڑھنے آتی تھی،

[1] دانش گاہ علی گڑھ میں ادب، مرتب پروفیسر خورشید احمد، ۲۰۰۵، ص ۱۱۶

گورا رنگ، لانبا قد، چھریرا بدن، دلآویز ناک نقشہ، ابا اس میں بڑی دلچسپی لیتے تھے، کچھ دن بعد جمیلہ نے آنا بند کر دیا اور ابا نے یہ گاؤں چھوڑ دیا۔'' [1]

اختر الایمان کی خودنوشت ''اس آباد خرابے میں'' کی روشنی میں بہت سے معزز و عالی مقام تخلیق کار و قلم کار بہت ہی پست حیثیت نظر آتے ہیں، یہ کتاب ان کی شخصی تنزلی، فکری پس ماندگی اور ذہنی ناعاقبت اندیشی کو پیش کرتی ہے۔ مثلاً ن م راشد کے بارے میں جو انہوں نے لکھا ہے اسے پڑھ کر ان کی عظمتوں کی فلک شگاف عمارت پل بھر میں زمیں بوس ہوتی نظر آتی ہے اور احساس ہوتا ہے کہ جو لوگ بہت سرو قد نظر آتے ہیں وہ اپنی ذات میں کس حد تک کوتاہ قد ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں اختر الایمان ایک واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں جس سے ن م راشد کی سطحیت کا اندازہ ہوتا ہے:

''واقعہ یوں ہے ریڈیو پر نشر ہونے والے پروگرام میں ان سے کہیں کچھ غلطی سرزد ہو گئی تھی جس کے لیے اسٹیشن ڈائریکٹر نے انہیں 30 روپے جرمانہ ادا کرنے کو کہا، اقتباس ملاحظہ ہو ''میں نے کہا تیس نہیں پندرہ، پندرہ، کیوں انہوں نے پوچھا، میں نے کہا ن م راشد اس شعبے کے صدر ہیں، انہوں نے کیوں نظر انداز کیا۔ ترجمہ انہیں پڑھنا چاہئے تھا آدھی ذمہ داری ان کی ہے، میں نے یہ بات ایسے ہی مذاق میں کہی تھی مگر راشد نے اس بات کا برا مانا۔ اگلے روز جو میں دفتر پہنچا، میری میز پر نوٹس رکھا تھا، تمہیں فوری طور پر برطرف کیا جاتا ہے۔'' [2]

اختر الایمان کی اس خودنوشت سے شاعروں کی شاہد بازی اور ان کی طوائف پرستی کا بھی حال معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانے کے کرسٹن بسٹن روڈ کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے بسمل شاہ جہان پوری، نخشب اور صابر دہلوی کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ لوگ اس کوچے کا چکر لگایا کرتے تھے۔ اس طرح کے اور بہت سارے دلچسپ واقعات ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختر الایمان نے اپنی زندگی کی کسی بھی سچائی سے کبھی چشم پوشی نہیں کی اور اپنی شخصیت کو مجروح ہونے سے بچایا بھی نہیں۔

[1] اس آباد خرابے میں، اختر الایمان، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۶، ص ۱۴-۱۳

[2] اس آباد خرابے میں، اختر الایمان، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۶، ص ۱۰۳

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ خودنوشتیں اپنے عہد کی آئینہ دار ہوتی ہیں، اختر الایمان کی خودنوشت بھی ان کے دور کے حالات وکوائف، سماجی، معاشرتی، ادبی تحریکات، رویے اور رجحانات کا پتہ دیتی ہے۔ اختر الایمان نے اپنی خودنوشت میں جہاں سماجی، معاشرتی اشارے کیے ہیں وہیں اس وقت کی ادبی تحریکات، رویے اور رجحانات کا ذکر کرتے ہوئے ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کے تعلق سے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ خاص طور سے پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

''اس آباد خرابے میں'' کے حوالے سے اخیر میں یہ کہنا غیر مناسب نہیں ہے کہ اس خودنوشت میں اختر الایمان کی شعوری کوششیں کارفرما نہیں ہیں بلکہ ان کے حافظے نے جہاں تک ان کا ساتھ دیا اسی کے سہارے وہ واقعات ترتیب دیتے گئے۔ ان کے لوح حافظہ پر جو بھی واقعہ ابھرتا گیا انہوں نے بلا کم وکاست نمک مرچ مصالحے کے بغیر قرطاس کے حوالے کر دیا اور اس کے اوپر کوئی روغن یا غازہ ملنے کی کوشش نہیں کی۔

اختر الایمان کی نثر میں بے انتہا سادگی اور ایک خاص طرح کی روانی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے اگر چہ اس میں کسی بھی طرح کی ترتیب کا خیال نہیں رکھا، یہی وجہ ہے کہ بہت سے واقعات کو انہوں نے مکرر رقم کر دیا ہے، وہ اس طرح کہ انہوں نے کوئی منصوبہ بند خودنوشت نہیں لکھی بلکہ اپنی شخصیت اور اپنے زمانے کے حوالے سے رائج روایات کو درج کیا ہے اور یہ روایات عام طور سے خودنوشتوں میں کمیاب ہیں۔ اس خود نوشت سے اختر الایمان کے باطنی نشیب وفراز اور زندگی کی تگ ودو کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

یہ بات بھی پہلے ہی عرض کی جا چکی ہے کہ اختر الایمان کی شہرت نظم نگاری کی رہین منت ہے، لیکن وہ نثر پر اپنی توجہ مرتکز کرتے تو ممکن ہے انہیں اور بھی زیادہ ادبی شہرت حاصل ہوتی۔ اختر الایمان کو نظم نگاری کی وجہ سے شہرت تو ملی لیکن اگر وہ نظم کی بجائے نثر پر اپنی توجہ مرتکز کرتے تو زیادہ کامیاب رہتے کہ ان کی نثر میں ندی کی سی سبک خرامی ہے اور سمندر کا سا سکون ہے۔ نثر پر زیادہ زور اس لیے کہ ایسی نثر جس میں سچائی ہو، صداقت ہو لکھنے والے کمیاب ہیں۔

سر رضا علی خاں: اعمال نامہ (۱۹۴۳)

اردو کی خودنوشتوں میں ''اعمال نامہ'' کو ان معنوں میں اعتبار و افتخار حاصل ہے کہ اس کے مصنف سر رضا علی انگریزی ادب اور خودنوشت کے فن سے واقف ہیں۔ خودنوشت لکھنا گویا دو دھاری تلوار پر چلنا ہے، جس پر چلنے والے کے لیے نہ ادھر خیر ہے، نہ ادھر، بعض لوگوں نے خودنوشت کو پل صراط پر چلنے سے بھی تعبیر کیا ہے، کیونکہ خودنوشت نگار اپنی خوبی و خامی، محاسن و معائب سے پوری طرح آگاہ ہوتا ہے۔ ایسے میں اگر وہ اپنی خامیوں کی پردہ پوشی کرتے ہوئے صرف اپنی اچھائیوں کا ذکر کرے تو یہ تعلّی ہوگی۔ اگر محض خامی بیان کرے تو اس کی شخصیت مذاق اور تماشہ بن جائے گی، ایسے میں حسن و قبح کے بیان میں صدق وصفا کا دامن تھامے رہنا یقیناً صبر آزما کام ہے۔ دیانت داری سے کام لینا خودنوشت نگار کے لیے پل صراط پر چلنے کے مترادف ہے۔ مصنف کے بقول:

> ''حقیقت نگاری بڑا مشکل ہے، بالخصوص جب انسان اپنی کہانی خود لکھنے بیٹھے۔ میری تمام کوشش یہ رہی ہے کہ انصاف سے کام لوں، کسی تصویر کا رنگ نہ پھیکا پڑے نہ زیادہ گہرا ہونے پائے... اپنی زندگی کو یا اپنے حالات کو لکھنے پر کوئی شخص مجبور نہیں ہے، البتہ ہر شخص کو اپنی کہانی لکھتے وقت دو باتوں کا خیال رکھنا چاہئے یہ کہ سچے واقعات پورے طور سے بیان کر دیے جائیں، اخفائے حق نہ کیا جائے، نہ کوئی بات ادھوری چھوڑی جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انگریزی کی مشہور مثل ہے کہ خواہش تخیل کی ماں ہے، اسے اپنے اوپر صادق نہ ہونے دیں۔ اگر خواہش نے تخیل پر غلبہ حاصل کر لیا اور لکھنے والے نے واقعات کی صورت مسخ کرنی شروع کر دی، تو آپ بیتی اعمال نامہ ہونے کے بجائے ناول یا افسانہ ہو جائے گی۔ میرے نزدیک اپنی لکھی ہوئی سوانح حیات کی سب سے بڑی صفت یہ ہونی چاہئے کہ ایک مرتبہ کراماً کاتبین بھی سامنے آکر بہ آواز بلند پڑھ لیں تو لکھنے والے کو آنکھ نیچی نہ کرنی پڑے۔ اسی مناسبت سے اس کتاب کا نام ''اعمال نامہ'' رکھا ہے۔'' [1]

---

[1] اعمال نامہ، سر رضا علی، طبع اوّل دسمبر ۱۹۴۳، ہندوستانی پبلشرز، دہلی، دیباچہ ص ۲

خودنوشت کی تعریف مصنف نے جو بیان کی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خودنوشت کے فن سے نہ صرف آگاہ ہیں بلکہ وہ خودنوشت کے حسن و قبح سے بھی بخوبی آشنا ہیں گو کہ ان کی خودنوشت میں ان کی شخصیت کا احوال کم اور اس عہد کی تاریخ زیادہ بیان کی گئی ہے۔ سیاسی پارٹیوں اور مسلم تحریکات سے مصنف کو بہت زیادہ لگاؤ تھا لیکن ساتھ ہی وہ ادب کا دلدادہ بھی تھا۔ موصوف کی سیاسی بصیرت اور ادبی ذوق کا حسین امتزاج ہے اعمال نامہ اور یہی اس خودنوشت کی انفرادیت ہے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ خود نوشت ادبی ہے یا سیاسی۔ لیکن پوری خودنوشت کا مطالعہ کرنے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خودنوشت کا محور سیاسی زندگی ہے۔

خودنوشت میں مصنف نے اپنی پیدائش اور خاندان کے احوال و کوائف کا بیان تو کیا ہی ہے ساتھ ہی اپنی علمی دلچسپی اور تعلیمی سفر کا بیان بھی دلچسپ انداز میں کیا ہے اور عربی کی ناقص تعلیم اور طرز تعلیم پر اعتراض بھی کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ کسی زبان کی تعلیم صرف و نحو سے شروع کرنا اور میزان منشعب رٹوانا طالب علم کے دماغی توازن میں خلل ڈالتا ہے، اس طریقے سے تنگ آکر انہوں نے عربی کی تعلیم چھوڑ دی۔

''اعمال نامہ'' صرف خودنوشت ہی نہیں بلکہ ماضی کی یادوں کا حسین گلدستہ بھی ہے، جس میں علی گڑھ کی علمی، ادبی شخصیتوں کا خوبصورت تذکرہ ہے، یادوں کے اس حسین گلدستے کے خوبصورت پھول ہیں نواب محسن الملک، وقار الملک، ماریسن، سجاد حیدر یلدرم، ولایت علی بمبوق، نصیر الدین حیدر، نواب علی قدوائی، برکت علی، محمود الحسن۔ یہ وہ گلفام چہرے ہیں جن کا رشتہ کسی نہ کسی طور علی گڑھ سے رہا ہے۔

اعمال نامہ کے مکالمے سے مصنف کی تنقیدی بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے رضا علی اشعار کے حسن و قبح سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ لفظوں کی حرکیات اور شاعری کے زمر سے بھی آگاہ ہیں۔ خودنوشت میں انھوں نے اردو ہندی نزاع پر بھی رائے زنی کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود کہیں بھی خودنوشت کو ادبیت سے محروم نہیں ہونے دیا۔ رسم الخط کا مسئلہ ہو یا اردو شاعری کے مزاج کا معاملہ، انیس و دبیر کا موازنہ ہو یا محمد حسین آزاد کی مومن کے ساتھ زیادتی، انہوں نے اپنی رائے کو مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔ اعمال نامہ میں مصنف نے ایرانی شاعری پر جو بھرپور تبصرہ کیا ہے، وہ اردو کی کلاسیکی شاعری پر بھی ایک حد تک صادق

آتا ہے:

''ایرانی شاعری نے جو درجہ کمال حاصل کیا، غالباً اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ جذبات کے غیر فطری ہونے کے باعث شاعروں کی تمام تر توجہ اس پر ہوتی تھی کہ کلام کے زور، بندشوں کی چستی، مضمون آفرینی، نادر تشبیہوں اور دلآویز استعاروں سے الفاظ میں اثر پیدا کریں، جو اس حقیقت پر پردہ ڈال سکے کہ مرد کا عاشق مرد ہے۔ بالفاظ دیگر محبوب کی عمر کا وہ زمانہ منتخب کیا گیا ہے جب امرد ہونے کے باعث اس کی صورت وشکل عورت سے ملتی جلتی ہے۔'' [1]

''اعمال نامہ'' واقعات اور معلومات کے حساب سے ہندوستان کی گذشتہ 50 سال کی تاریخ پر محیط ہے اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ خودنوشت سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اعتبار سے تاریخ کا تسلسل ہے کیونکہ اس میں ایک عہد سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ خودنوشت اسلوب اور بیان کے لحاظ سے نہ صرف منفرد نظر آتی ہے بلکہ آئندہ آنے والوں کے لیے نشان راہ کا کام بھی کرتی ہے۔

خودنوشت میں کہیں ڈرامائی عنصر کی جھلک نظر آتی ہے تو کہیں انشا پردازی کا گمان ہونے لگتا ہے، لیکن وہ کسی کی تتبع نہیں معلوم ہوتی بلکہ اس میں مصنف کا شعوری عمل دخل کارفرما نظر آتا ہے:

''ابھی ابھی میرے کانوں میں ایک آواز آئی، میں ادھر متوجہ ہوا، دو نورانی صورتیں تھیں، مگر صاف نظر نہ آتی تھیں، آواز بھی عجیب وغریب ہونے کے باوجود آواز سے میرے کان نا آشنا تھے، میں نے ہمہ تن گوش ہو کے سنا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کراماً کاتبین کہہ رہے ہیں۔'' [2]

اس اقتباس کی روشنی میں یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے کہیں کہیں استعاراتی اور شعری اسلوب بیان کو بھی اپنایا ہے۔ ورنہ پوری خودنوشت عام بول چال اور روزمرہ کی زبان میں تحریر کی گئی ہے۔ محاورات، ضرب الامثال اور کہاوتوں کے خوبصورت استعمال کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خودنوشت بہترین ادبی تخلیق ہے۔ رضا علی اپنی شخصیت کے بیان، احوال وکوائف کے اظہار میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ ان

[1] اعمال نامہ، سر رضا علی، طبع اوّل دسمبر ۱۹۴۳، ہندوستانی پبلشرز، دہلی، دیباچہ ص ۳۹۱

[2] اعمال نامہ، سر رضا علی، طبع اوّل دسمبر ۱۹۴۳، ہندوستانی پبلشرز، دہلی، دیباچہ ص ۳۳۹

کی خودنوشت پڑھنے کے بعد قاری تاریخی حالات و واقعات سے نہ صرف واقف ہوتا ہے بلکہ تاریخی شعور کا بھی حامل ہو جاتا ہے اور یہی ایک منفرد، مفتخر اور ممتاز خودنوشت کی نمایاں خوبی ہے۔ فنی نقطہ نظر اور اسلوب بیان کے اعتبار سے یہ خودنوشت ایک مکمل خودنوشت ہے۔

حکیم احمد شجاع: خوں بہا

''خوں بہا'' حکیم احمد شجاع کی خودنوشت ہے۔ انہوں نے کتاب کو تاثراتی تصورات اور پچھلے پچاس برس کے عنوان سے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان اوراق میں حکیم شجاع نے خاص طور پر اپنے محسنوں اور کرم فرماؤں کا ذکر کیا ہے، جس کا اظہار انہوں نے تعارف میں اس طرح کیا ہے:

> ''چونکہ میں نے اس مجموعے کو ایک ڈائری کہا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے میں بہت اجمال کے ساتھ وہ حالات و واقعات بیان کر دوں، جن کے سیل رواں کے ساتھ ساتھ اپنی عمر کے گزرے ہوئے زمانے میں بہتا چلا آیا ہے۔ ان حالات کے بیان سے یہ مقصود نہیں کہ میں کسی ذاتی اہمیت یا شخصی فوقیت کے اظہار کے لیے بہانہ تلاش کروں، مدعا فقط یہ ہے کہ اس سلسلے میں ان نامور بزرگوں کا ذکر ہو جائے، جن کے فیض صحبت سے ازلی مناسبت کو اکتساب دانش کی سعادت میسر آئی۔''[1]

دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کے ابتدائی صفحات ان شخصیتوں کے نذرانہ عقیدت کے لیے مختص ہیں جن سے مصنف نے اکتساب فیض کیا۔ ایک آشفتہ سر کا خراج عقیدت ہے ان شخصیتوں کے لیے جنہوں نے ان کی تعمیر و اصلاح میں خصوصی دلچسپی لی۔ مصنف کی نگاہ میں یہی خودنوشت کی غرض و غایت اور مطمح نظر ہے گویا اس طرح سے انہوں نے اپنی شخصیت کو مرکوز و مرتکز نہیں ہونے دیا اور نہ ہی اپنی مدح سرائی کی۔ خودنوشت کی یہی اہم خوبی تسلیم کی جاتی ہے جس کا تصور اردو کی دیگر خودنوشتوں میں خال خال ہی نظر آتا ہے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ خودنوشتیں اپنے عہد کے حالات، سیاسی، سماجی کیفیات اور تہذیب و ثقافت کا آئینہ دار

[1] خوں بہا، حکیم شجاع، تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۴۳ء، ص ۱۰

ہوتی ہیں۔مگر اس خودنوشت میں مذکورہ باتوں کی جانب اشارے کم ملتے ہیں۔اس طرح سے یہ خودنوشت یک رخی ہوگئی ہے۔مصنف نے ان شخصیتوں کا ذکر تفصیل سے کیا ہے جن کی صحبت سعید سے علم وفن کا گنجینہ، تہذیب ومعرفت کا خزینہ حاصل کیا۔ان مجلسوں اور محفلوں کا ذکر بھی اجمالاً کیا، جہاں سے ان کے افکار وخیالات میں تازگی وبالیدگی آئی۔ڈاکٹر محمد اقبال، سر عبدالقادر، خواجہ رحیم بخش، مفتی عبداللہ ٹونکی، خلیفہ نظام الدین اور سید محمد شاہ وکیل وغیرہ وہ اشخاص تھے، جن کی نشست احمد شجاع کے گھر پر ہوا کرتی تھی۔انہوں نے تحریر کیا ہے کہ اقبال نے اپنا مشہور زمانہ شعر:

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

ان کے گھر پر ایک مشاعرے میں پڑھا تھا۔انہوں نے اپنے بزرگوں، محسنوں، کرم فرماؤں کا ذکر تو والہانہ انداز میں کیا ہے لیکن بلاوجہ کی عقیدت مندی سے گریز کیا ہے۔حقائق وواقعات کے بیان میں کذب و افترا سے کوسوں دور رہے اور نہ ہی خودستائی اور خودنمائی کو جگہ دی ہے۔یہی سبب ہے کہ ڈاکٹر صبیحہ انور نے ان کی خودنوشت کو منکسر المزاجی اور سادگی کا نمونہ قرار دیا ہے۔اور الطاف فاطمہ کے خیال میں:

''بلاشبہ ان کی خودنوشت میں سادگی اور صداقت ہے، اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اس میں عجز و انکساری کی فضا چھائی ہوئی ہے۔دراصل یہ مصنف کی کسر نفسی، خلوص اور صاف گوئی ہے جسے لوگوں نے انکسار محض پر محمول کیا ہے۔'' [1]

معلومات اور تجربے ومشاہدے کے حوالے سے ''خوں بہا'' بہت حد تک خودنوشت کی تعریف پر کھری اترتی ہے کیونکہ خودنوشت کا مقصد بھی یہی ہے کہ قاری کو مشاہدات وتجربات کی صحیح جانکاری دی جائے نہ کہ تعلّی سے کام لیتے ہوئے اسے گمراہ کیا جائے۔

خودنوشت کی ایک بڑی شرط یہ بھی ہے کہ اس میں تاریخ کی عکاسی کے ساتھ ساتھ اس کا تسلسل بھی ہو۔اس خودنوشت سے بہت سی تاریخی معلومات حاصل ہوتی ہیں اور اس عہد اور معاشرت کو سمجھنے کے لیے یہ

[1] اردو میں سوانح نگاری کا ارتقا، الطاف فاطمہ، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۷۸، ص ۳۲۴

کتاب بہت حد تک ممد و معاون ہے۔

''خوں بہا'' ایک ایسے ادیب و شاعر کی داستان زیست ہے جو زندگی کے حقائق اور عصری تقاضوں کو سمجھتا ہے اور جس نے ملک کے سیاسی، سماجی، ثقافتی اور ملی حالات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے اور جو صاحب حال کے ساتھ ساتھ صاحب قال بھی ہے۔

زبان، اسلوب اور نقطہ نظر کے لحاظ سے ''خوں بہا'' کا شمار اردو کی عمدہ خودنوشتوں میں کیا جا سکتا ہے کیونکہ حکیم احمد شجاع نے اس میں سادہ، رواں دواں انداز بیان کے ساتھ ساتھ شعوری طور پر بیانیہ انداز اور سنجیدہ اسلوب کو اپنایا ہے۔ خوبی بہا میں زبان و بیان کی شگفتگی اور برجستگی تو ملتی ہے لیکن شعریت، نغمگی اور موسیقیت نہیں ملتی اور نہ ہی تشبیہات و استعارات سے زبان کو بوجھل کیا ہے۔ یہی خوبی ہے اور انفرادیت بھی جس کی وجہ سے دیگر خودنوشتوں میں خوں بہا کو امتیاز حاصل ہے۔ البتہ کہیں کہیں منظر نگاری کے ساتھ ساتھ تخلیقی نثر کے عمدہ نمونے بھی ملتے ہیں، جس کی تازگی اور آب و تاب قاری کی نگاہوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ بحیثیت مجموعی خوں بہا حکیم احمد شجاع کی زندگی کے چند ابواب پر مشتمل ایک ایسی تصنیف ہے، جس میں خالص ادبی زبان و اسلوب برتا گیا ہے۔

یادِ ایام: نواب سعید احمد خاں چھتاری (۱۹۴۹)

نواب سعید احمد خاں مشرقی تہذیب و اقدار کے دلدادہ و امین ہیں۔ لیکن سیاسی نظریات اور انتظامی معاملات میں ارباب فرنگ کے مقلد اور موئید نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مذہبی امور اور ملت کے مسائل سے کبھی روگردانی نہیں کی۔ وہ مذہبی معاملات و مسائل میں خصوصی شغف لیتے اور پیش پیش رہتے، اسی وجہ سے ان کی خودنوشت مذکورہ امور کے لیے دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔ نواب چھتاری نہ ادیب تھے، نہ شاعر بلکہ مدبر اور سنجیدہ قسم کے فرماں روا تھے۔ اس لیے ان کی خودنوشت میں ادبیت یا شعریت کی تلاش جویائے ادب کو محروم کرے گی۔ انہوں نے غلام ہندوستان میں اہل ثروت، جاہ و حشمت اور با اقتدار خاندان میں آنکھ کھولی۔ نواب چھتاری نے خودنوشت کا آغاز پیدائش اور بچپن کے واقعات سے کیا ہے:

''میں 11 رجنوری 1889ء کو باغپت ضلع میرٹھ میں پیدا ہوا۔ اسی سال میرے دادا نواب محمود علی خاں نے ہجرت کا ارادہ کرلیا تھا اور بمبئی میں جہاز کا انتظام کر رہے تھے، جہاں میرے پیدا ہونے کا تار پہنچا، میں اپنے ماموں راؤ خورشید علی خاں کے گھر پیدا ہوا اور سات برس کی عمر تک ان ہی کے سایۂ شفقت میں پرورش پائی۔ ماموں کو مجھ سے بڑی محبت تھی، جس کو انہوں نے آخر دم تک نبھایا۔''[1]

نواب چھتاری نے جگہ جگہ اپنے والدین کے مذہب سے لگاؤ اور مشرقی اقدار سے لگاؤ کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ یہ بھی عجب اتفاق ہے کہ ان کے دادا مغربی طرز فکر کو ناپسند کرتے تھے، اسی وجہ سے انھوں نے اپنے پوتے کی تعلیم و تربیت مشرقی انداز میں کی، لیکن شعور پختہ اور بالیدہ ہونے کے بعد نواب چھتاری اہل مغرب کے طرفدار اور حمایتی ہو گئے۔ نواب چھتاری کا گھرانہ مشرقی تہذیب کا نمونہ تھا، اسی وجہ سے نواب صاحب نے 9 برس کی عمر میں قرآن پاک حفظ کرلیا۔ عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم انہوں نے اپنے گھر پر ہی حاصل کی۔ ''کورٹ آف وارڈس'' نے انہیں مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ بھجوا دیا، جبکہ ان کے چچا اور اہل خانہ انہیں علی گڑھ بھیجنے کے لیے تیار نہ تھے، لیکن غاصب ملک کے حکم سے روگردانی مصلحت کے خلاف تھی، اس لیے بادل نخواستہ نواب چھتاری کو علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لینا پڑا۔ جدائی کے وقت اہل خانہ نے نواب صاحب کو پرنم آنکھوں سے جدا کیا، اہل خانہ سے دوری ان کے دل پر شاق گزر رہی تھی اور انگریزوں سے نفرت، اس زمانے میں ہر ہندوستانی کے دل میں تھی۔ اسی وجہ سے اس وقت ہر انسان مغربی تہذیب و کلچر سے قرابت کو کفر پر محمول کرتا تھا۔ دسمبر 1919 میں ان کی ریاست واگزار ہوئی اور وہ باقاعدہ اپنی جائیداد کے وارث و مالک ہو گئے۔ اس دور کی اپنی پسند اور دلچسپی کا اظہار انہوں نے جس انداز میں کیا ہے اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ بھی دیگر نوجوانوں کی طرح مست رہنے کے عادی تھے۔ بٹیر بازی، مرغ بازی اور ایسی ہی دوسری فضول بازیاں ان کی پسند میں شامل تھیں۔ اس طرح نواب چھتاری نوابین اودھ کے مماثل نظر آتے ہیں کیونکہ ان نوابوں کی فطرت میں یہ دلچسپیاں داخل تھیں۔

اس خودنوشت سے نواب چھتاری کی سیاسی سرگرمی اور تحریکی مزاج سے بھی آشنائی ہوتی ہے اور یہ بھی

---

[1] یاد ایام، نواب سعید احمد خاں چھتاری، حصہ اول، مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ، ۱۹۴۹ء، ص ۱

معلوم ہوتا ہے کہ وہ سیاسی محرکات کے سبب دو بار گورنر ہوئے، ہوم ممبر رہے، فائینس ممبر ہوئے اور زمیندار پارٹی کے رکن رکین رہے۔ انہوں نے اپنے عہد کی سرکردہ شخصیات کا تذکرہ جس انداز میں کیا ہے، اس سے اس عہد کی سیاست اور ملکی حالت کا نہ صرف اندازہ ہوتا ہے بلکہ اس عہد کی تصویر بھی نگاہوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ ان دنوں تحریک ترک موالات کا تذکرہ زوروں پر تھا، نواب چھتاری نے اس تحریک کے نفع ونقصان پر معروضی اور مدلل انداز میں سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

نواب چھتاری نے اپنی خودنوشت میں، خودنوشت سے مختلف زبان استعمال کی ہے۔ تحریر میں منطقی ربط بھی نظر نہیں آتا اور نہ ہی اتصال وارتباط کی کیفیت ہے۔ اس کے باوجود نواب صاحب صراحت، وضاحت اور قطعیت کے فن سے آگاہ ہیں اور اپنی تحریر کو مذکورہ صفات کا حامل بنانے کی پوری کوشش کی ہے، یہی ان کا انداز بھی ہے اور اسلوب بھی، زبان سادہ اور عام فہم استعمال کرتے ہیں اور کسی بھی طرح کی انشاء پردازی سے گریز کرتے ہیں۔ پوری خودنوشت میں نواب صاحب نے بیانیہ اسلوب کو برتا ہے اور جامع سادہ اور وضاحتی اسلوب سے ہی کام لیا ہے۔

اختصار کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیاسی خودنوشتوں میں نواب صاحب کی خودنوشت ایک خاص اہمیت کی حامل ہے کیونکہ سیاسی واقعات اور فرنگیوں کی حکمت عملی کی تفہیم کے لیے یہ خودنوشت دستاویزی حیثیت رکھتی ہے، لیکن فن کے اعتبار سے پختہ نہیں کہی جا سکتی۔ کیونکہ اسلوب بیان کے اعتبار سے عامیانہ سادگی اس میں راہ پا گئی ہے جو اسے فنی اعتبار سے کمزور کرتی ہے۔

یادوں کی دنیا: یوسف حسین خاں (۱۹۶۷)

ڈاکٹر یوسف حسین خاں بحیثیت مؤرخ اور ادیب اردو دنیا میں پہچانے جاتے ہیں۔ اردو غزل، اقبال اور اردو شاعری سے ان کا خاص شغف رہا ہے۔ انہیں فنون لطیفہ سے لگاؤ تھا اور تاریخ نگاری سے دلچسپی، اس لیے وہ ادب کے مکالمے میں تاریخی اقدار کو ملحوظ نظر رکھتے تھے۔ ''یادوں کی دنیا'' سے ان کی تحریر اور شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور یہ کتاب اس دور کی ادبی تحریکی سرگرمیوں کو بھی سامنے لاتی ہے۔ ایک جگہ انہوں نے

لکھا ہے:

''آپ بیتی زندگی کی تاریخ ہے، حافظے کو کھنگالنے سے جو تصویر سامنے آتی ہے اس میں ایک طرح کی طلسمی کیفیت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے، بشرطیکہ کہانی کہنے والا اپنے فن کے آداب برتنا جانتا ہو۔ خیالی نقوش جب صفحۂ قرطاس پر اتارے جاتے ہیں تو جذبہ کی رنگ آمیزی کسی نہ کسی صورت میں راہ پا جاتی ہے اور خیالی پیکروں میں ایسی تحلیل ہو جاتی ہے کہ اسے ان سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ بلاشبہ تخلیقی مسرت میں اس سے اضافہ ہوتا ہے تاہم ادیب کے ہاتھ سے صداقت اور حقیقت کا دامن کبھی نہیں چھوٹنا چاہئے۔''[1]

یہ تعریف جہاں خودنوشت کے عناصر اور اجزاء پر روشنی ڈالتی ہے اور اس کے حدود اور دائرۂ کار کا احاطہ کرتی ہے وہیں اس بات کی طرف اشارہ بھی کرتی ہے کہ خودنوشت ایک ادبی اور تخلیقی صنف ہے جو صداقت پر مبنی ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یوسف حسین خودنوشت کی خوبی و خامی کے ساتھ ساتھ حدود مطالبات اور امکانات سے واقف تھے اور انہیں یہ احساس و ادراک بھی تھا کہ خودنوشت بھی دیگر اصناف کی طرح مصنف کو فرحت و انبساط اور نشاط روح عطا کرتی ہے، اس لیے ان کی خودنوشت پر کسی بھی طرح کی رائے زنی سے قبل یہ بات بھی ذہن نشیں کر لینی چاہئے کہ وہ خودنوشت کے اصول وضوابط، فن اسلوب اور لوازمات حسن سے واقف اور آگاہ ہیں۔

خودنوشت کا ابتدائی حصہ مغل شہنشاہوں کی تاریخ، ملکی سیاست ان کے سیاسی شعور پر مبنی ہے اور اس مملکت کی حدود اور جغرافیائی اثرات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ اس کے بعد اپنی پیدائش، حسب ونسب اور آباؤ اجداد کا تذکرہ کیا ہے۔ جس سے ان کے خاندانی احوال بھی معلوم ہوتے ہیں۔

1920ء میں جامعہ ملیہ کا قیام عمل میں آیا تو ڈاکٹر ذاکر حسین نے انہیں یہاں داخل کر دیا، اس بیان کے ساتھ ہی خودنوشت میں ایک موڑ آتا ہے اور خودنوشت ذاتی و خاندانی حالات کے زمرے سے نکل کر ہندوستان کی وسیع گنگا جمنی تہذیب کی مظہر ہو جاتی ہے۔ یوسف حسین خاں کی وسعت نظر کا اندازہ اس بات

[1] یادوں کی دنیا، یوسف حسین خاں، مطبوعہ معارف پریس، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۶۷، ص دیباچہ

سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اقوام عالم کی تاریخ وثقافت کا مطالعہ باریکی سے کیا تھا، اسی وجہ سے وہ آفاقی نظر کے حامل ہو گئے۔ اس کا عکس جابجا خودنوشت میں نظر آتا ہے۔ موصوف نے جامعہ ملیہ، حیدرآباد اور فرانس کا ذکر دلچسپی سے ''یادوں کی دنیا'' میں کیا ہے۔ وہ جامعہ ملیہ کے قیام اور اس کے مقاصد کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

''29/جنوری 1920 کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کا اعلان ایم اے او کالج کی جامع مسجد میں ہوا۔ مولانا محمود حسن کے ہاتھوں سے اس کے تاسیس کی رسم ادا ہوئی۔'' [1]

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے خودنوشت کو اپنی ذات وشخصیت تک ہی محدود نہیں رکھا، بلکہ اس وقت کے سیاسی حالات، ادبی انجمنوں اور تحریکوں کا ذکر بھی قدرے تفصیل سے کیا ہے۔ ان تحریکوں میں اینی بیسنٹ، ہوم رول کی تحریک، تحریک خلافت، ترک موالات کی تحریک اور شدھی اور سنگٹھن کی تحریکیں شامل ہیں۔ ان تحریکوں پر بڑے عالمانہ انداز میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ خودنوشت میں فرانسیسی ادب کے حوالے سے بھی گفتگو کی گئی ہے، جس میں وکٹر ہیوگو اور پرومت کا مطالعہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ پروست کے شاہکار ''کھوئے ہوئے زمانے کی گفتگو'' پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں ادیب بھی ہیں اور تاریخ داں بھی، اس لیے ان کی خودنوشت ادبیت کے ساتھ ساتھ تاریخی عناصر بھی اپنے جلو میں سمیٹے ہوئے ہے۔ جب وہ کسی شہر کی تاریخ اور کسی حکومت کے عروج وزوال کا نقشہ کھینچتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ کوئی مؤرخ حالات کے نشیب وفراز پر بے لاگ تبصرہ کر رہا ہے۔ یہی تاریخی شعور ان کی خودنوشت کو انفرادیت عطا کرتا ہے۔ ان کی خودنوشت کا اسلوب ایک اچھے ادیب اور تاریخ داں کا اسلوب ہے۔ ان کا ابتدائی زمانہ روہیل کھنڈ میں گزرا، اس لیے جگہ جگہ علاقائی بولی کا اثر صاف جھلکتا ہے۔

مجموعی طور پر ''یادوں کی دنیا'' ایک ایسی خودنوشت ہے، جسے ہم اردو کی اچھی خودنوشتوں میں شمار کر سکتے ہیں۔ اس خودنوشت میں ادب، تاریخ، عمرانیات اور نفسیات کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ یوسف حسین خاں کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے واقعات، حالات، تاریخ اور جمالیاتی عناصر کو خوبصورتی کے ساتھ ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔

---

[1] یادوں کی دنیا، مطبوعہ معارف پریس، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۶۷، ص ۸۶

شاہ راہ پاکستان: چودھری خلیق الزماں (۱۹۶۷)

''شاہراہ پاکستان'' ایک ایسے شخص کی خودنوشت ہے جو تقسیم ہند کے کرب سے دوچار ہوا ہے۔ جس نے بے گھری اور دربدری کے عذاب کو جھیلا ہے، جس نے گھر خاندان کو ٹوٹتے اور بکھرتے دیکھا ہے۔ بھائی، بہن کے بچھڑنے سے، ماں باپ کی محبت، شفقت، اپنائیت، خلوص مہر و وفا کو اپنی آنکھوں سے تقسیم ہوتے دیکھا ہے۔ پہلے یہ خودنوشت انگریزی میں "Pathway of Pakistan" کے نام اور کچھ وقفے کے بعد اردو میں ''شاہراہ پاکستان'' کے نام سے کچھ ترمیم و تحریف اور حذف و اضافے کے ساتھ ۱۹۶۷ء میں کراچی سے شائع ہوئی۔ یہ ایک صحافی کی خودنوشت ہے۔ جسے رپوٹنگ میں کمال حاصل ہے، اس لیے اس میں رپورٹنگ کا عکس نظر آتا ہے۔

چودھری خلیق الزماں کی رپورٹنگ میں ادب کی چاشنی بھی ہے اور زبان و بیان کی دل آویزی بھی ہے۔ اس بنا پر ''شاہراہ پاکستان'' رپورتاژ کی اچھی مثال قرار دی جاسکتی ہے۔ خودنوشت میں تقسیم کے درد کے بیان میں کہیں کہیں مصنف کی شخصیت بھی جھلک اٹھتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس میں افسانے کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

''شاہراہ پاکستان'' میں خلیق الزماں نے خاندانی احوال، تعلیم، علی گڑھ کے علمی و ادبی ماحول اور لکھنؤ کی تہذیبی و معاشرتی فضا کے بارے میں قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ علاوہ ازیں، خودنوشت میں اس زمانے کے سیاسی نشیب و فراز اور سیاسی کشمکش کا بیان بھی ملتا ہے۔ خودنوشت میں انھوں نے اپنی زندگی کے سیاسی پہلوؤں کا بھی ذکر کیا ہے جس کی وجہ سے اس خودنوشت کا شمار سیاسی نوعیت کی خودنوشتوں میں کیا جاسکتا ہے۔

> ''میں چودہ برس تک اپنے قلم اور زبان کو سیکڑوں الزام لگانے والوں کے ساتھ اعتراضات سن کر میں ہندوستانی مسلمانوں کو چھوڑ کر پاکستان آ گیا۔ صبر کے ساتھ سنتا رہا اور ایک بھی بات ان واقعات کے متعلق جو میرے ہندوستان کے چلے آنے کا باعث ہوئے نہیں نکلا۔ مگر اب بہتر (۷۲) برس کے سن میں جب میرے پاؤں کے نیچے میری قبر ہے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ میں ان واقعات کو بلا کم

وکاست خدا کو حاضر و ناظر جان کر لکھ جاؤں۔

اپنی خودنوشت سوانح حیات لکھنے کے لیے، اپنے بھائیوں، عزیزوں اور دوستوں کے اصرار کے علاوہ اس لیے بھی تیار ہو گیا کہ میں اپنے پیچھے ایک صحیح اور مکمل یادداشت متحدہ ہند میں مسلمانوں کی سیاسی پالیسیوں، تحریکات، اشخاص اور حالات کا مسلمانوں کی آئندہ کی نسلوں کے لیے چھوڑ جاؤں، کیونکہ... مسلمانوں کے حالات کسی وقت کیسے ہی رہے ہوں انھوں نے اپنی تاریخ کے سلسلے میں غیر جانب داری اور انصاف کو کبھی قربان نہیں ہونے دیا۔'' [1]

چودھری خلیق الزماں نے اس کتاب میں وہ تمام تاریخی حقائق، تقسیم کی وجوہات، تقسیم کے پس پردہ کارفرما تمام عوامل اور اسباب و علل کو قدرے تفصیل کے ساتھ جمع کر دیا، جو شاید کہیں اور نہ مل سکیں۔ اس میں صرف مصنف کی شخصیت کے نشیب و فراز ہی نہیں بلکہ تاریخ کے وسیع تناظر میں ایک ایسے فرد کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے جس نے تقسیم کا درد اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس لیے اس کتاب میں اس عہد کے ان حالات کی کربناکیوں کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ کتاب میں مصنف نے سادہ زبان اور عام فہم اسلوب کو برتا ہے۔ اس میں مصنف کی خود احتسابی کا پہلو نمایاں ہے۔ خاص مقصد کے تحت تصنیف کی گئی اس خودنوشت میں از آغاز تا اختتام اخباری رپورٹنگ کا رنگ نمایاں ہے۔

آشفتہ بیانی میری: رشید احمد صدیقی (۱۹۷۲)

رشید احمد صدیقی کی شناخت دنیائے اردو ادب میں کئی جہتوں سے ہے۔ وہ بیک وقت مزاح نگار، خودنوشت نگار اور خاکہ نگار بھی ہیں۔ رشید احمد صدیقی کی آپ بیتی ''آشفتہ بیانی میری'' ان کے طرز تحریر، ان کی جودت طبع اور ندرت اسلوب کی آئینہ دار ہے۔

رشید احمد صدیقی نے اپنی خودنوشت کو صرف اپنے خیالات کا اعلان نامہ نہیں بنایا، بلکہ اس کو مسلم یونیورسٹی سے جذباتی لگاؤ کے اظہار کا ذریعہ بھی بنایا ہے۔ اس خودنوشت کے تقریباً تین چوتھائی اوراق مسلم

[1] شاہراہِ پاکستان، چودھری خلیق الزماں، انجمن اسلامیہ، پاکستان، ۱۹۶۷، ص ۱۱۰-۱۰۹

یونیورسٹی کے واقعات پر مشتمل ہیں۔ رشید صاحب کو علی گڑھ سے جو عشق ہے وہ بے سبب نہیں۔ کیونکہ جس طرح انہوں نے علی گڑھ کی تعلیمی فضا اور ماحول کو اپنے ہاتھوں سے سنوارا ہے تو اسی طرح علی گڑھ نے بھی ان کی شخصیت کو خوب نکھارا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

''اس میں شک نہیں کہ اپنی سیرت کی تعمیل یا تشکیل کے لیے بہت کچھ خام مواد اپنے گھر اور اسکول سے لایا تھا، لیکن اس کو تب و تاب، رنگ و آہنگ، لمس و لذت اور صورت و معانی علی گڑھ نے دیے۔'' [1]

اس کے علاوہ انہوں نے اپنے بچپن کے دور کے شریف شیعہ خاندانوں کا حال و احوال تحریر کیا ہے اور جونپور کے بزرگوں کے انداز شفقت، انداز تکلم اور ان کی شعر گوئی و شعر خوانی کی تعریف کی ہے۔ جونپور کے ادبی ماحول تاریخی عمارتوں اور ان کے محل وقوع کے بارے میں اپنے منفرد اسلوب میں یوں رقم طراز ہیں:

''جونپور تاریخی شہر ہے، وہاں شاہان مشرقی کے آثار اب تک موجود ہیں، کئی مسجدیں ہیں، مزارات اور مقبرے، ایک عالیشان قلعہ، عیدگاہ پل پختہ سرائے اور کتنے سارے کھنڈر شاہی زمانے کے دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں... شعر و ادب کی باتیں کرتے اور بیٹھے بیٹھے دریا کی سیر کرتے اور کبھی کبھی دور و نزدیک بکھری ہوئی مسمار عمارتوں اور کھنڈروں کی یاد میں تھوڑی دیر کے لیے گم ہو جاتے۔'' [2]

مذکورہ اقتباس کی روشنی میں رشید احمد صدیقی کی قوت مشاہدہ، منظر نگاری اور مرقع سازی کا اندازہ بحسن و خوبی لگایا جا سکتا ہے۔ رشید صاحب نے ''آشفتہ بیانی میری'' میں اپنی ابتدائی تعلیم اور اس کے تعلق سے عمداً روشنی نہیں ڈالی، پھر بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جونپور کے بورڈنگ ہاؤس میں رہا کرتے تھے، جہاں عموماً جونیئر طلبا سینئروں کی نگرانی میں رہتے تھے، اگر کسی طالب علم کے والدین یا رشتے دار آ جاتے تو دوسرے طلبا ان کا ادب و احترام اسی طرح کرتے جیسا کہ خود اپنے بزرگوں کا کیا جاتا ہے۔

سرسید کے بارے میں ان کی رائے کسی غلو پر مبنی نہیں ہے بلکہ صداقت کی آئینہ دار ہے۔ وہ اکثر اپنے انتہائی قریبی دوستوں اور مخلصوں پر قلم اٹھاتے ہوئے صداقت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے بارے میں ان کی یہ رائے ملاحظہ ہو:

---

[1] آشفتہ بیانی میری، رشید احمد صدیقی، کوہ نور پریس، دہلی، ۱۹۷۲، ص ۱۵-۱۴ [2] آشفتہ بیانی میری، رشید احمد صدیقی، کوہ نور پریس، دہلی، ۱۹۷۲، ص ۲۱

''میں ذاکر صاحب کو نہ ولی سمجھتا ہوں نہ فرشتہ، نہ امام شریعت نہ پیر طریقت لیکن اتنا ضرور محسوس کرتا ہوں کہ بحیثیت مجموعی وہ فرزندان علی گڑھ میں بہت اونچے درجے پر فائز ہیں، بہت اونچے درجے پر۔'' [1]

یہ تو طے ہے کہ رشید احمد صاحب نے طنز وظرافت کے محرکات میں وہاں کی مسجد، بورڈنگ ہاؤس، کھیل کے میدان، یونین، اولڈ بوائز سے گفتگو اساتذہ سے مختلف مواقع پر فکری لین دین سبھی کچھ شامل کیا ہے اور علی گڑھ کے حالات وکوائف کو اعلیٰ ظرافت نگاری میں معاون بنایا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہر مصنف کا اپنا منفرد انداز واسلوب ہوتا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس مخصوص انداز واسلوب میں کئی طرح کے رنگ ہوتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی کی خودنوشت بھی ان کی دوسری تخلیقات سے مختلف ہے، حالانکہ وہ ایسے صاحب طرز ہیں کہ ان کے اسلوب کو ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے لیکن خودنوشت کے موضوع نے ان کو بھی مجبور کر دیا کہ وہ اپنے مخصوص انداز میں حقیقت نگاری کو زیادہ واضح کریں۔ ان کے اسلوب میں سنجیدگی اور جودت طبع کا حسین امتزاج ہے، جسے قاری ہر ہر سطر پر محسوس کرتا ہے۔ بقول آل احمد سرور:

''مگر اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ صرف خوان مسرت نہیں سامان بصیرت بھی ہے۔ یہ ہنسی کا پٹارہ نہیں ہے، تبسم کا خزانہ ہے۔ رشید صاحب ہنسی ہنسی میں نہ صرف بہت کچھ کہہ جاتے ہیں بلکہ سوچنے کے لیے بھی کچھ چھوڑ جاتے ہیں، وہ رعایت لفظی سے بڑا کام لیتے ہیں۔ ان کے فقروں میں صوتی حسن بھی ہے اور موسیقی بھی، وہ ایک پڑھے لکھے انسان کے نشیب وفراز پر ایک لطیف تبصرہ ہیں۔ ان میں کتنے ہی افسانوں کی کمزوریوں کا حسن اور کتنے ہی معمولی آدمیوں کی بڑی اور قابل قدر باتیں محفوظ ہوگئی ہیں۔ وہ قصے بھی سناتے ہیں اور قول محال سے بھی کام لیتے ہیں۔ جاندار اور خیال انگیز تشبیہات کے چمن بھی آراستہ کرتے ہیں اور اپنے تخیل کی مدد سے گزرتے ہوئے لمحات کو ایک ابدی روشنی اور ایک صدا بہار رنگینی بخش دیتے ہیں۔'' [2]

---

[1] آشفتہ بیانی میری، رشید احمد صدیقی، ۱۹۷۲ء، ص ۵۷

[2] آشفتہ بیانی میری، رشید احمد صدیقی، ۱۹۷۲ء، ص ۳۷

رشید صاحب کے اسلوب کا اہم جوہر یا یوں کہا جائے کہ ان کی خصوصیت طنز و مزاح ہے جس کی شگفتگی اور تیکھا پن پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ ان کی یہ خصوصیت ہر طرح کی تحریر میں نمایاں ہے۔ خاکے ہوں خطوط یا ادبی تحریریں ان کی بذلہ سنجی اور برمحل جملے وفقرے مضمون میں جان پیدا کر دیتے ہیں۔ رشید صاحب کے طنز و مزاح پر نامور ناقدوں اور ادیبوں نے اپنی رائے کو مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر ''آشفتہ بیانی میری'' کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

''رشید احمد صدیقی کے طنز و مزاح میں تمدنی تنقید کے بھرپور عناصر موجود ہیں۔ وہ ہیئت اجتماعی کی ناہمواری، اس کے عدم توازن اور لغویات کی اصلاح چاہتے ہیں اور ان کو اکثر جگہ انہوں نے اپنے مزاح کا موضوع بنایا ہے۔ مزاح کے لیے ماحول اور زندگی کے منفی پہلو پس منظر کا کام دیتے ہیں...'' [1]

رشید احمد صدیقی کی خودنوشت، سوانح حیات اور فنی تقاضوں کو کس حد تک پورا کرتی ہے، اس سوال کا جواب اگرچہ بہت صاف نظر آتا ہے لیکن رشید صاحب کے اشارتی انداز نے اسے بہت پیچیدہ بنا دیا ہے، تاہم خودنوشت کو ابتدا تا انتہا پڑھ جانے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سارے عناصر اور معلومات جو ایک مکمل خود نوشت میں ہونے چاہئیں ان کا فقدان ہے مثلاً پیدائش اور بچپن کا حال، والدین کی شفقتوں اور ان کے مزاج نیز سیرت کا بیان، ذہنی کیفیات ونفسیات کا ذکر، دوستوں کے تذکرے وغیرہ ان سب کا بیان یا تو سرے سے ہے ہی نہیں اور اگر ہوا بھی ہے تو نہایت ہی اختصار کے ساتھ۔ ادبی خودنوشت ہونے کے سبب ''آشفتہ بیانی میری'' سے جہاں بعض اہم ادبی رجحانات اور میلانات کا پتہ چلتا ہے، وہیں علی گڑھ کالج، یونیورسٹی اور یونین کے علاوہ کھلاڑیوں کی داستان کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر وہاج الدین علوی نے رشید صاحب کی خودنوشت کا بڑا ہی بھرپور تجزیہ پیش کیا ہے۔ ان ہی کے جملوں میں ''رشید صاحب کی خودنوشت سوانح حیات یک رخی اور ناتمام ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کی کتابی زندگی کا دیباچہ ہے اور مزید اوراق کتاب ابھی تصنیف ہونا باقی ہے۔ ان کے اسلوب کی ندرت شگفتگی اور اشارتی انداز ان کی دوسری تحریروں کی طرح خود نوشت کا زیور ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہ خودنوشت ایک مکمل تصنیف ہوتی تو اردو کے سوانحی ادب میں

[1] اردو ادب میں طنز و مزاح، ڈاکٹر سیدہ جعفر، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۷۸، ص ۲۵۷

اسلوب اور ادبی معلومات کی بنا پر ایک مزید اضافہ ہوتا۔''

مذکورہ بالا سطور کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب میں رشید صاحب کے سوانحی حالات سے زیادہ علی گڑھ کی تہذیبی زندگی کی تاریخ شامل ہے۔

یادوں کی برات: جوش ملیح آبادی (۱۹۷۳)

شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کی خودنوشت ''یادوں کی برات'' اردو ادب میں کئی معنوں میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ جوش ملیح آبادی کی یہ خودنوشت زبان و بیان کے اعتبار سے نثر شیریں کی عمدہ ترین مثال قرار دی جا سکتی ہے۔ جب کہ تہذیب و کلچر کے اعتبار سے اس میں قدیم لکھنؤ سانس لیتا نظر آتا ہے، کیونکہ پوری خودنوشت میں مایوسی، ناکامی، محرومی کی جگہ کیف و نشاط کے ساتھ وصال کی رونقیں اور محفل کی جگمگاہٹیں نظر آتی ہیں اور کبھی کبھی شام اودھ کی دلفریبیاں اور نیرنگیاں بھی قاری کو اپنے حصار میں لے لیتی ہیں۔ اس خود نوشت سے قاری کی توجہ، دلچسپی اور انہماک کا سبب یہ بھی ہے کہ یہ ایک ایسے ادیب کی زندگی کو پیش کرتی ہے، جن کی شاعری اور نثر انقلابی موضوعات سے مملو ہے۔ تقریباً 600 صفحات پر مشتمل اس خودنوشت کے مطالعے سے بڑے دلچسپ حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔ اگر ایک طرف اسلوب و ادا اور فنی پیش کش کے مسائل سے سابقہ پڑتا ہے، تو دوسری طرف حقائق اور واردات کی صداقت کے تعین میں بھی دشواری پیش آتی ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہو سکتی ہے کہ پوری کتاب میں تذبذب اور تضادات کی بہتات ہے۔

خودنوشت کے مطالعے سے جو کیفیت واضح طور پر ابھر کر آتی ہے، وہ ہے جوش کا اشرافی کردار، جس کا بیان وہ بڑے فخر و مباہات کے انداز میں کرتے ہیں۔ اپنے خاندانی جاہ و حشمت و عظمت کا اظہار جس شان و شوکت کے ساتھ کرتے ہیں اس سے جوش کی اشتراکیت کا نعرہ زیب داستاں معلوم ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ حقیقت میں انھیں غریبوں کی مسیحائی سے واسطہ نہیں بلکہ خاندانی عظمتوں کا اظہار زیادہ عزیز ہے۔ جس سے ان کا نظریہ، افکار دونوں مشکوک نظر آتے ہیں کیونکہ وہ جس نظریے کے حامل اور جس طرز زندگی کے قائل ہیں، وہاں عظمتوں کا بیان قابل فخر نہیں، بلکہ مفلوک الحالوں کی پریشانی اور دکھ سے اپنائیت کا اظہار زیادہ ضروری

ہے۔ چونکہ جوش کی شاعری کا زیادہ تر حصہ ترقی پسند نظریات کی تبلیغ وحمایت سے عبارت ہے اور جوش تمام عمر اس نظریے سے منحرف بھی نہیں ہو سکے۔

1970 میں جوش کراچی میں مقیم تھے۔ لوگ ہجرت وتقسیم کے کرب کو فراموش نہیں کر پائے تھے۔ حالات بھی کچھ بہتر نہیں تھے۔ سیاسی ابتری سے عوام پریشان تھے۔ جوش ان پریشانیوں سے کبیدہ خاطر تو تھے، لیکن وہ حال کی کربناکی سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے ماضی کے خواب وخیال میں آسودگی چاہتے ہیں اور اس تصور میں اپنی حویلی کی اندرونی وبیرونی فضا کا ذکر کرتے ہوئے مغل دور کے نواب زادوں کے رنگ میں ڈوبے نظر آتے ہیں:

''لونڈیاں، باندیاں، مامائیں، اصیلیں مغلانیاں، انائیں، دائیاں، کھلانیاں، استانیاں، پنکھوں کی ڈوریاں کھینچنے اور راتوں کو کہانیاں سنانے والیاں چاروں طرف دوڑتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ اس کے علاوہ شریف گھرانے کی غریب عورتیں چند اچھے دن گزارنے کے لیے مہمان آتیں اور جب چلی جاتیں تو نئی مہمان عورتیں ان کی جگہ آ کر پر کر لیتی تھیں۔'' [1]

جوش ہمیشہ مرد آزاد کی طرح حسین وادیوں اور رنگین فضاؤں اور مست خیالوں میں غلطاں وپیچاں نظر آتے ہیں۔ جہاں زندگی مکمل طور پر جوش ومستی، نغمہ وموسیقی اور کیف ونشاط میں شرابور ہو چکی ہے۔ اپنے شباب کے حسین اور یادگار ایام کو یاد کرتے ہوئے تصورات اور خواب وخیال کی دنیا میں کھو جاتے ہیں:

''خدا خدا کر کے اب پچھلے پہر کوئی 14 برس کی پانچویں طوائف مجرے کے واسطے آئی۔ العظمۃ للہ، اس کا چمپئی رنگ گویا سرکو ہسار آغاز بہار کی صبح طلوع ہو رہی ہے اور اس کے شربتی رخساروں کی شوخی و کاغذی جلد کے نیچے سے یوں صباحت پھوٹ رہی ہے گویان غرفے کے رنگین شیشے سے چاندنی چھن چھن کر آ رہی ہے۔'' [2]

جوش کی شخصیت کا ایک اور پہلو جس کا تعلق، ان کی خود پرستی اور نرگسیت سے ہے، جس نے آگے

---

[1] یادوں کی برات، جوش ملیح آبادی، آئینہ ادب، لکھنؤ، ۱۹۷۳، لکھنؤ، ص ۸۱

[2] یادوں کی برات، جوش ملیح آبادی، آئینہ ادب، لکھنؤ، ۱۹۷۳، ص ۸۲-۸۱

چل کر اس وقار و تمکنت کو جنم دیا، جس نے انہیں ٹھہر کر استقلال کے ساتھ جینے کے مہلت و مواقع نہیں دیے، اس وجہ سے انہیں نہ اپنا ملک راس آتا ہے اور نہ ہی اپنی پرکشش شخصیت اور جاذب نظر جسامت اسی وجہ سے وہ اپنے خوبصورت وجیہ چہرے کے آگے کسی کو لائق اعتنا نہیں سمجھتے اور وہ اس طرح اپنی ذات پر ہی فریفتہ ہو جاتے ہیں:

''میں آئینے کے سامنے جا کر اپنا منھ دیکھنے لگا، گالوں پر سرخی کے ہلورے، آنکھوں میں گلابی ڈورے، چھریرا بدن، پتلی کمر، گھنیرے بال، پتلے پتلے ہونٹ، لانبی لانبی پلکیں...اف میں کس قدر حسین ہوں، زندگی میں پہلی بار اس کا پتہ چلا، اللہ بھلا کرے صبح کی رنگینی کا، جس نے مجھ پر میرا پوشیدہ جمال واضح کر دیا۔'' [1]

جوش کی آپ بیتی کو پڑھتے ہوئے ایک چیز جو بار بار کھٹکتی ہے، جس کا تعلق خودنوشت کے فن سے ہے۔ جوشؔ ''یادوں کی برات'' میں اپنے واقعات کے سہارے عموماً ایسی کہانیاں اور غیر ضروری طور پر دوسرے اشخاص کی زندگی کے واقعات کچھ اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ ان کی زندگی پس پردہ معلوم ہونے لگتی ہے، کیونکہ خودنوشت میں اپنی ذات کا اظہار اور احوال اوّلیت رکھتا ہے۔ البتہ ضمناً ایسے واقعات بھی آ جاتے ہیں جس کا براہ راست تعلق موصوف کی ذات سے نہیں ہوتا لیکن انہیں بھی بیان کرنا ہوتا ہے، جس سے کسی واقعے کی تفہیم، کسی مقصد کی تعبیر، کسی مبہم نکات کی تشریح مقصود ہو اور جن سے کوئی تاریک پہلو روشن ہوتا ہو۔ جوش نے اس فنی روایت سے اس قدر بے توجہی برتی کہ خود ان کی سیرت و شخصیت کہیں کہیں ضمنی محسوس ہونے لگی۔

''یادوں کی برات'' میں جوش اپنے معاشقے کا ذکر بڑی دلچسپی سے کرتے ہیں اور ہر ایک عشق کے بیان میں سچائی کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہیں۔ جوش نے اپنی زندگی میں 18 معاشقے کیے، جن میں تمام کے تمام کامیاب رہے، یعنی انہیں فراق کی مرگ آسا اذیتیں نہیں بلکہ ہمیشہ گل رخوں کا وصال ہی نصیب ہوا اور کسی معرکہ عشق میں ناکامی کا منھ نہیں دیکھنا پڑا۔ جوش نے اپنے معاشقوں کا بیان بڑے دلربا انداز میں کیا ہے۔ خودنوشت کا مقصد تخریبی امور کا تذکرہ یا بے حیائی و اخلاقی پستی کا بیان ہرگز نہیں، لیکن

[1] یادوں کی بارات، جوش ملیح آبادی، آئینہ ادب، لکھنؤ، ۱۹۷۳، ص ۳۴

T-7224

جوش نے یادوں کی برات میں مخرب اخلاق عشق ومحبت کا اظہار کیا ہے۔ امرد پرستی یا ہم جنسوں سے معاشقہ مشرقی معاشرے میں کبھی بھی عزووقار کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا، لیکن جوش نے کمال بے حیائی اور ڈھٹائی کے ساتھ ہم جنس معشوق کا ذکر کیا ہے، جس سے کتاب کی افادیت مجروح ہوئی ہے۔ اس کے باوجود جوش کی لفظی بازی گری، زبان وبیان کی سحر انگیزی شروع سے آخر تک قاری کو اپنی گرفت میں لیے رہتی ہے۔ یہی اس خود نوشت کا امتیازی وصف ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جوش نے کوثر وتسنیم سے دھلی ہوئی نہایت شیریں اور مرصع زبان کا استعمال کیا ہے۔ نثر میں روانی، جادوانی، ترنم، موسیقیت اور پانی کے جھرنوں جیسا بہاؤ ہے۔ زبان و بیان میں آورد نہیں آمد کی کیفیت پائی جاتی ہے، یہ شاعری کی خوبی ہے، لیکن اس خوبی ورعنائی سے جوش کی نثر مزین وآراستہ ہے۔

پوری کتاب شاعرانہ رنگین بیانی سے سرشار، شاعری کے جملہ لوازم، قافیہ پیمائی، ہم وزن الفاظ، تمثال سازی، استعارہ سازی، پیکر تراشی اور تراکیب سازی سے مملو ہے۔ کتاب کے اندر دیگر شعراء وادباء کا بیان بھی خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے، جن سے جوش کی ذہنی مناسبت تھی۔ اس اعتبار سے اس خودنوشت کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ معروف شاعر فانی بدایونی کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''تاج باختہ بادشاہوں، روزگار گزیدہ فنکاروں، امید بریدہ مریضوں، شب دریدہ محبوبوں، معشوق سوختہ عاشقوں، پریدہ رنگ بیوہ نوعروسوں، پسر مردہ باپوں اور پدر گم کردہ یتیموں کے خیمۂ سوگواری میں بیٹھ کر مغموم قدرت نے غم دوراں اور غم جاناں کے آفات، ورتھر کے مصائب اور شوپنہار کی مرادی کے طشت میں دیوار گریہ کی مٹی کو میر تقی میر کے آنسوؤں میں تر کر کے گوندھا۔ اس مٹی سے ایک پتلا دبلا گندمی رنگ کا پتلا بنایا، اس پتلے کے دھڑکتے دل میں تمنائے مرگ کی روح پھونک دی اور نام رکھ دیا اس کا فانی بدایونی۔'' [1]

مذکورہ سطور کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جوش نے اپنی خودنوشت کے لیے جس زبان واسلوب کو منتخب کیا وہ سوانح نگاری یا خودنوشت کی زبان نہ ہو کر افسانہ وانشائیے کی زبان ہوگئی۔ یہی رنگ زبان اور

[1] یادوں کی بارات، جوش ملیح آبادی، آئینۂ ادب، لکھنؤ، ۱۹۷۳، ص ۳۷۹

اسلوب بیان بہتوں کی نگاہ میں قابل تعریف ہے تو بہتوں کی نظر میں غیر مستحسن۔ کیونکہ حسن و قبح کے معیار لوگوں کی نگاہ میں مختلف ہیں، لیکن ''صداقت خود کو منوا لیتی ہے، مانی نہیں جاتی۔'' جوش کا یہ خوبصورت، مرصع، مزین اور منفرد اسلوب زبان و بیان بہتوں کی نگاہ میں قابل رشک تو بہتوں کی نگاہ میں حسد کا باعث ہے۔ جوش کو تصویر کشی، پیکر تراشی اور امیجری میں کمال حاصل ہے۔

جوش کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں زبان و بیان پر زبردست قدرت حاصل ہے اور الفاظ و تراکیب ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ زبان و بیان کا یہ شکوہ اور شان و شوکت ہمیں اس کتاب میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ خودنوشت سوانح نگاری کے اعتبار سے یہ کتاب نامکمل کہی جا سکتی ہے، لیکن اپنی شگفتہ بیانی، لطافت اور پرشکوہ تراکیب اور روشن تشبیہات و استعارات کی وجہ سے یہ کتاب ہمیشہ ادبی ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرتی رہے گی۔

مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں: خواجہ غلام السیدین (۱۹۷۴)

خواجہ غلام السیدین اپنی خودنوشت کی تکمیل سے پہلے ہی موت کے بے رحم پنجوں کا شکار ہو گئے۔ گو کہ انہوں نے خودنوشت لکھنے کی شروعات کر دی تھی اور اپنی زندگی کے 60 سالہ تجربات و مشاہدات میں قارئین کو شریک کرنا چاہتے تھے، لیکن ان کی یہ خواہش بارآور نہ ہو سکی۔ اگر وہ بقلم خود اپنی خودنوشت کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے تو یقیناً ان کی خودنوشت ادب میں ایک اضافہ ہوتی۔

موجودہ کتاب ان کی چھوٹی بہن بیگم صالحہ عابد حسین کی محنت و کاوش اور جنبش قلم کا نتیجہ ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ غلام السیدین کا تحریر کردہ ہے جبکہ دوسرا حصہ بیگم صالحہ عابد حسین نے تحریر کیا ہے۔ دوسرا حصہ ضمیمے کی شکل میں ہے، کیونکہ السیدین جو کہنا اور لکھنا چاہتے تھے اس کو صالحہ عابد حسین نے لکھ کر بڑی حد تک پورا کیا ہے۔ بیگم صالحہ عابد حسین کے پاس اس تحریر کا وہ نسخہ ہے، جس میں ''مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں'' کے ابواب ہیں۔ ابواب کی فہرست درج ذیل ہے:

(۱) ایک گزرا ہوا خواب — پانی پت

(۲) باز گو از نجد و از یاران نجد، علی گڑھ

(۳) اگر فردوس بروئے زمیں است

(۴) کان نمک، حکومت ہند (علاوہ مغلوں کے یہاں وہ لوگ بھی تھے، جو زندگی کو نمکینی بخشتے ہیں۔)

(۵) مشاطہ را بگو کہ ہر اسباب حسن دوست ''میری زندگی میں عورتوں کا مقام''

(۶) دنیا میرا گاؤں ہے- غیر ملکوں کی سیر اور کام

(۷) غبار خاطر- میرا دیس میری دنیا

(۸) مگر ستم زدہ ہو ذوقِ خامہ فرسا کا- میری کتاب

(۹) تعلیم کا شغل

(۱۰) سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب (زندگی پر نگاہ بازگشت)

ہندوستان پاکستان، ریڈیو پر چھیڑ چھاڑ

مذکورہ بالا ابواب اور سرخیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ادب کا کتنا کڑھا ہوا ذوق رکھتے تھے۔ سرخیوں کی ادبیت، انفرادیت اور لفظوں کی تراش خراش سے یہ احساس ہوتا ہے کہ اگر سیدین صاحب کے ذریعہ خود نوشت پایۂ تکمیل تک پہنچتی، تو اس کا ایک منفرد رنگ ہوتا اور ادب میں عمدہ اضافہ بھی۔ موجودہ شکل میں سیدین صاحب کی زندگی کی نامکمل تصویر اور ادھورے سفر کی داستان ہم تک پہنچی ہے۔ پہلا حصہ تو خودنوشت کے لوازمات اپنے جلو میں سموئے ہوئے ہم تک پہنچی ہے لیکن دوسرا حصہ جسے بیگم صالحہ عابد حسین نے تحریر کیا ہے، وہ خودنوشت کم اور سوانح زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

سیدین صاحب ہمارے ملک کے ان چند دانشوروں اور ماہر تعلیم میں سے ہیں، جن کی نظر عالمی ادب وثقافت پر گہری ہے۔ وہ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے رمز سے بھی آگاہ تھے، اس لیے بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان زبانوں کی خودنوشتیں بھی ان کی نظروں سے گزری ہوں گی۔ سیدین صاحب خودنوشت کی باریکی سے واقف تھے۔ انہوں نے خود ایک جگہ کارلائل کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ ''عام آدمی بھی ایک اچھی خودنوشت تحریر کر سکتا ہے۔'' (۳۸) اس سے یہ ثابت ہوا کہ خودنوشت نگار کے لیے بڑا آدمی ہونا شرط نہیں ہے،

عام آدمی بھی اپنی خودنوشت لکھ سکتا ہے۔ اپنی یادوں اور تجربوں میں دوسروں کو شریک کر سکتا ہے۔ اس کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے:

''ہر حیثیت کے آدمی کے لیے یہ ممکن ہے کہ (گویا آسان نہیں) وہ کسی حد تک اپنی زندگی میں ایک شاہکار کی شان پیدا کر سکے۔ مجھے عمر بھر (نہ معلوم کیوں) اچھی قدروں کی تلاش رہی ہے اور خواہ ان کو اپنایا ہو یا نہ اپنایا ہو، جہاں کہیں ان کا جلوہ دیکھا، ان کو سر پر رکھا اور آنکھوں سے لگایا۔'' [1]

اس اقتباس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ وہ اچھی اقدار اور خوبیوں کے متلاشی تھے۔ اچھائیوں اور خوبیوں کو وہ کسی ذات، برادری اور قبیلے یا کسی انسان کی ملکیت یا اجارہ داری نہیں سمجھتے تھے۔ سیدین صاحب کی خودنوشت کو اس طور پر امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے اپنی ذات کو مرتکز نہیں ٹھہرایا ہے اور نہ ہی اپنی خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے، جیسا کہ اردو خودنوشتوں میں یہ وبا عام ہے۔ سیدین صاحب اپنی خودنوشت کے ذریعہ دوسروں کی خوبی اور حالات زندگی بیان کرنا چاہتے ہیں، جنہوں نے ان کے لوح دل پر اچھائیوں کے نقش ثبت کیے اور جن سے ان کا 60 سالہ زندگی میں سابقہ رہا۔ وہ لکھتے ہیں:

''میری خواہش نہیں کہ اس کے ذریعہ میں اپنی زندگی کے بیشتر حالات بیان کروں بلکہ چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کی کچھ داستان سناؤں، جن سے گذشتہ 60 سالوں میں مجھے سابقہ پڑا، جن کی محبت سے میں نے فیض اٹھایا ہے، جن میں سے بعض کی زندگی میں میں نے ان قدروں کا جلوہ دیکھا جن کی بدولت انسان کبھی کبھی ابتدائی زندگی کے کیچڑ سے نکل کر آسمان کی رفعت تک پہنچ جاتا ہے۔ اگر کسی آدمی کو یہ خوش قسمتی نصیب ہو، تو اس کا فرض ہے کہ اپنی استعداد کے مطابق اس میں دوسروں کو شریک کرے ورنہ روز قیامت اس سے سوال کیا جائے گا۔'' [2]

سیدین صاحب بنیادی طور پر ماہر تعلیم تھے، لیکن ان کی خودنوشت میں صرف تعلیمی مسائل یا تعلیمی مباحث ہی زیر بحث نہیں آئے ہیں، بلکہ انہوں نے تاریخی، تہذیبی، سماجی، سیاسی اور ثقافتی اقدار پر بھی سیر

[1] مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں، خواجہ غلام السیدین، سیدین ٹرسٹ، دہلی، ۱۹۷۴، ص ۱۹

[2] مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں، خواجہ غلام السیدین، سیدین ٹرسٹ، دہلی، ۱۹۷۴، ص ۱۹-۱۸

حاصل گفتگو کی ہے۔انہوں نے اپنی خودنوشت میں علمی انداز اختیار کیا ہے اور شعری یا افسانوی طرز اظہار سے گریز کیا ہے۔انہوں نے اپنی خودنوشت میں خاندانی حالات، حسب ونسب پر روشنی نہیں ڈالی ہے۔دوسرے حصے میں بیگم صالحہ عابد حسین نے لکھا ہے کہ ان کا خاندان انصاری الاصل تھا۔بلبن کے عہد میں ایوب انصاری کے دو بیٹے ہندوستان آکر بس گئے۔خودنوشت سے سیدین صاحب کی تاریخ پیدائش کا صحیح اندازہ نہیں ہو پاتا، ایک اندازے اور رائے کے مطابق ان کا سن ولادت 1905 یا 1906 قرار دیا گیا ہے۔اگر کوئی انسان اس خودنوشت کی روشنی میں سیدین صاحب کا نفسیاتی مطالعہ کرنا چاہے، تو اسے ناکامی ہاتھ آئے گی کیونکہ انہوں نے اپنے بچپن کے واقعات پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی ہے البتہ کہیں کہیں یہ ذکر ملتا ہے کہ بچپن میں ان کی پرورش و پرداخت انتہائی ناز ونعم اور لاڈ پیار میں ہوئی تھی۔

سیدین صاحب جس وقت علی گڑھ آئے، مسلم یونیورسٹی کے آغاز کا زمانہ تھا، وہ 1922 میں یونیورسٹی میں داخل ہو گئے تھے۔علی گڑھ کا یہ عہد تمام تر رنگینیوں اور جلوہ سامانیوں کا عہد تھا۔ادیب، شاعر، کھلاڑی، سیاست داں گویا ہر میدان کے شہ سوار اس وقت مادر درسگاہ کے آنچل سے لپٹے ہوئے تھے۔علی گڑھ کے اس عہد کا ذکر انہوں نے وارفتگی سے نہیں کیا ہے اور زندگی سے وابستہ ان صفحات میں کوئی بات پرکشش نہیں معلوم ہوتی۔

سیدین صاحب کو علی گڑھ سے تلاش وجستجو کے طفیل جو دولت ہاتھ آئی، اس سے عمر بھر مستفید ہوتے رہے۔انسان دوستی، اپنائیت وخلوص اور دردمندی سے ان کا واسطہ عمر بھر کا رہا۔یہی خوبیاں انگلستان میں بھی ان کے لیے ترقی کی راہیں ہموار کرتی رہیں اور وہ ان ہی اصول و اقدار کو برتنے کے سبب یونیورسٹی کی پارلیمنٹ کے پرائم منسٹر بنائے گئے۔

سیدین صاحب نے اپنی خودنوشت میں رنگین مرصع اور گنجلک زبان کے استعمال سے گریز کیا ہے اور جو زبان استعمال کی ہے، وہ انتہائی بامحاورہ، رچی بسی اور علمی زبان ہے، انداز بیانیہ ہے، جملے نہ بہت زیادہ طویل ہیں اور نہ ہی مختصر بلکہ حالات اور مواقع کے اعتبار سے انتہائی موزوں اور مناسب زبان کا استعمال کیا ہے۔کہیں کہیں انہوں نے خطیبانہ اور مصلحانہ زبان کا استعمال کیا ہے، جس میں شریعت کی جھلک نظر آتی ہے:

''محبت بہت صابر ہوتی ہے اور بہت شفیق، محبت میں حسد نہیں ہوتی، محبت اعلان نہیں کرتی، شان

نہیں دکھاتی، بدتمیزی نہیں کرتی، خودغرض نہیں ہوتی، غصہ نہیں کرتی، جب دوسرے خطا کریں تو اسے خوشی نہیں ہوتی، اسے خوشی تو ہوتی ہے لوگوں کی نیکی سے۔ وہ دوسروں کی برائیوں کو افشاں کرنے میں تامل کرتی ہے، دیر لگاتی ہے، ان کے بارے میں خوش فہمی سے کام لیتی ہے، صبر سے کام لیتی ہے، امید سے کام لیتی ہے۔'' [1]

یہ اقتباس ان کے مزاج اور طبیعت کی عکاسی کرتا ہے۔ ان کے دل کی نرمی اور لطافت کو ظاہر کرتا ہے۔ مختصر اور چھوٹے چھوٹے جملے میں اثر آفرینی کی کیفیت ہے۔

سیدین صاحب نے اپنے بچپن کے حالات اور خاندانی تفاصیل کے بیان سے گریز کیا ہے اس کے باوجود بھی ان کی خودنوشت میں ان کا عہد پوری طرح سانس لیتا نظر آتا ہے۔ زندگی کی ضرورتوں نے انہیں جن جن گلیوں کی سیر اور جس دشت کی سیاحی پر مجبور کیا، وہاں وہاں کی سیاسی، سماجی، ثقافتی، تعلیمی اور معاشرتی حالات کا بیان اس میں موجود ہے۔ ان کی خودنوشت میں انگلینڈ کا سماجی اور معاشرتی نظام، انگریزوں کے عادات و اطوار اور علی گڑھ کی روایات و اقدار کی جلوہ نمائی نظر آتی ہے۔ کشمیر کے فطری مناظر، حسن کی دلآویزی اور کوملتا بھی در آئی ہے۔

سیدین صاحب کا اسلوب بیان سادہ ہوتے ہوئے بھی فصیح ہے کیونکہ ان کی تحریروں میں ان کے دل کی دھڑکن اور خلوص شامل ہے اور جس تحریر میں خلوص کا عمل دخل ہوا سے قبولیت کی معراج حاصل ہو جاتی ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیدین صاحب کی نامکمل خودنوشت اور ادھوری داستان حیات بھی ہندوستان کے تعلیمی اور ثقافتی ادب میں ایک اضافہ ہے۔ اپنے اسلوب اور زبان کی سادگی اور نثر کی دل آویزی کی بدولت اس خودنوشت کا شمار اچھی خودنوشتوں میں کیا جا سکتا ہے۔

زرگزشت: مشتاق احمد یوسفی (۱۹۷۶)

زرگزشت مشتاق احمد یوسفی کی چھ سات برسوں کی روداد، کیفیات پر محیط ایک ایسی خودنوشت ہے جس

[1] مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں، خواجہ غلام السیدین، ۱۹۷۴، ص ۳۱۶

کو پڑھتے وقت قاری کو مصنف کی موجودگی وعدم موجودگی کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ مشتاق احمد یوسفی کتاب کیتقدیم میں خود اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بعض پڑھنے والے کو اس خودنوشت سوانح عمری میں لکھنے والا خود کہیں نظر نہیں آئے گا۔ اگر ایسا تاثر ہے تو یہ عین حقیقت ہوگا۔ اس لیے کہ اپنی زندگی میں بھی ہر قدم پر دوسرے ہی دخیل نظر آتے ہیں۔''[1]

خودنوشت کا یہ انوکھا فن ہے جس کے موجد مشتاق احمد یوسفی ہیں ورنہ اردو کی دیگر خودنوشتوں کے مطالعے سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف خود کو ہر جگہ نمایاں اور ممتاز کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی انفرادیت کی وجہ سے یہ خودنوشت، خودنوشتوں کے اژدہام میں منفرد نظر آتی ہے۔ ''زرگزشت'' میں مصنف نے اپنی بنک (یونائیٹڈ بنک لمٹیڈ، کراچی) کی کہانی تحریر کی ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کا مزاحیہ انداز واسلوب رشید احمد صدیقی سے مماثلت کے باوجود کئی معنوں میں منفرد ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کے یہاں ایسے مضامین اور موضوعات مل جاتے ہیں جو ظاہری ومعنوی طور پر قاری کے حس مزاح کو گدگداتے ہیں اور انھیں تفریح کا سامان بہم پہنچاتے ہیں، جب کہ رشید صاحب کے چست جملے اور پرتکلف فقرے قاری کے دل پر ہمدردی واپنائیت کے اثرات مرتسم کرتے ہیں۔ رشید صاحب کے طنز ومزاح کا خاص حربہ ''جملے بازی'' ہے۔

زرگزشت کا انداز بیان دیگر خودنوشتوں سے یوں بھی مختلف ہے کہ انھوں نے خودنوشت کا آغاز پیدائش حسب ونسب، طفلی کے واقعات آباواجداد کے کارنامے سے نہ کرکے یونائیٹڈ بنک لمٹیڈ سے کیا ہے۔ اس لیے اس میں خودنوشت کے مروجہ اصول وضوابط کی جستجو عبث ہے کیونکہ فکری وفنی اور موضوعاتی سطح پر مشتاق احمد یوسفی انفرادیت کے قائل ہیں اور روایت سے انحراف اور تقلید سے بغاوت ان کی سرشت میں داخل ہے۔ وہ زندگی کے تمام حلقے میں مروجہ اصولوں کے مخالف، تقلیدی روش اور ٹرینڈ سے ہٹ کر چلنے کے عادی رہے ہیں۔ یہی روایت سے انحراف ان کی انفرادیت کی اصل وجہ ہے۔

[1] زرگزشت، مشتاق احمد یوسفی، چمن بک ڈپو، اردو بازار، دہلی، جون ۱۹۷۶، ص ۱۱

مشتاق احمد یوسفی نے تقدیم میں ضمناً اور کتاب میں اشارتاً ایسے بیانات دیے ہیں جن کی روشنی میں قاری کو ان کے خاندان، حسب ونسب اور جائے ولادت کا علم ہو جاتا ہے۔

مشتاق احمد ٹونک راجستھان میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی وطن جے پور ہے۔ بغرض تعلیم جے پور، آگرہ اور علی گڑھ میں ان کا قیام رہا اور تقسیم ہند کی وجہ سے کراچی ہجرت کر گئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اپنے والد کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہ ٹونک میں پولٹیکل سکریٹری رہ چکے تھے۔ ریاستی خوبو سے مبرّا، پابند شرع، سادہ دل مسلمان تھے۔ جے پور کے پہلے مقامی مسلمان تھے جس نے ۱۹۱۴ میں بی اے کیا۔'' [1]

زرگزشت کے تمام متحرک کردار اسی بنک سے متعلق ہیں، جو اپنی حرکت، فعالیت اور خصوصیات کی وجہ سے زندہ وجاوید ہیں۔ اس بنک کے منیجر مسٹر ڈبلیو جی ایم اینڈرسن، یعقوب الحسن غوری، پروفیسر قاضی عبدالقدوس، عبادالرحمٰن قالب، این ایم ایم این پی کنجو، خان سیف الملک خان، خان غلام قدر خان، احمد اللہ ششدر، علی شاہ، کریگری پیک، شیخ نورالحسن (نورل)، فینی ڈارلنگ، مرزا عبدالودود بیگ، ریاضت علی سوختہ، مسٹر لطیفی، ٹونی صاحب، ملا عبدالصمد اور سن مازجری بانڈ، مسن ریمزڈن، خاص طور پر ایسے کردار ہیں، جو اپنی اپنی خصوصیات کی بدولت قارئین کے دل ودماغ میں نہ صرف رچ بس گئے ہیں، بلکہ ان کا تعاقب بھی کرتے رہتے ہیں۔ ان کرداروں سے مصنف کا قریبی تعلق رہا، ان کے نام سے پہلے یا بعد میں وہ ایسے لفظ جوڑ دیتے ہیں جس سے مزاح کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور کردار کی معنویت بھی مجروح نہیں ہوتی۔ چونکہ بات سے بات پیدا کرنا، باتوں باتوں میں طنز ومزاح کا پہلو نکالنا، مشتاق احمد یوسفی کا شعار ہے۔

مسٹر اینڈرسن جو بینک کے جنرل منیجر ہیں جن کے ذکر جمیل میں لطف سخن کا وہ کمال نظر آتا ہے جن کی بدولت وہ کردار حیات ابدی کا مالک ہو جاتا ہے۔ جنرل منیجر اینڈرسن کا پہلا تعارف اس وقت ہوتا ہے جب مصنف بینک کی ملازمت کا انٹرویو دینے کے لیے کمرے میں داخل ہوتا ہے:

''سامنے ایک کرسی پر نہایت بارعب انگریز نظر آیا۔ سر بیضوی اور ویسا ہی صاف اور چکنا، جس پر پنکھے

[1] زرگزشت، مشتاق احمد یوسفی، چمن بک ڈپو، اردو بازار، دہلی، جون ۱۹۷۶، ص ۳۸

کا عکس اتنا صاف تھا کہ اس کے بلیڈ گنے جا سکتے تھے۔ آج کل کے پنکھوں کی طرح اس پنکھے کا وسطی حصہ نیچے چپٹا نہ تھا بلکہ اس میں ایک گاؤدم چونچ نکلی ہوئی تھی، جس کا مصرف بظاہر یہ نظر آیا کہ پنکھا سر پر گرے تو کھوپڑی پاش پاش نہ ہو بلکہ اس میں ایک گاؤدم سوراخ ہو جائے۔ بعد میں خیال آیا کہ سر پر اگر بال ہوتے، تو اس کی وجاہت اور دبدبہ میں یقیناً فرق آجاتا۔ میز کے نیچے ادھڑ ادھڑ اکیمل کلر کا قالین بچھا تھا۔ رنگ میں واقعی اس قدر مشابہت تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی خارش زدہ اونٹ اپنی کھال فراش راہ کیے پڑا ہے۔ بھرے بھرے چہرے پر سیاہ رنگ کی عینک، کچھ پڑھنا یا پاس کی چیز دیکھنا ہو، تو ماتھے پر چڑھا کر اس کے نیچے سے دیکھتا تھا۔ دور کی چیز دیکھنا ہو تو ناک کی پھنگ پر رکھ کر اس کے اوپر سے دیکھتا تھا۔ البتہ آنکھ بند کر کے کچھ دیر سوچنا ہو تو ٹھیک عینک لگا لیتا تھا۔ بعد میں دیکھا کہ دھوپ کی عینک بھی ناک کی نوک پر لٹکائے اس کے اوپر سے دھوپ کا معائنہ کرتا ہوا بنک آجاتا ہے۔ آنکھ ہلکی نیلی جو یقیناً کبھی روشن ہوں گی، ناک ستواں، ترشی ترشائی، نچلا ہونٹ تحکمانہ انداز سے نکلا ہوا، سگریٹ کے دھوئیں سے ارغوانی، بائیں بے ایمان دوکان دار کی ترازو کی طرح مستقلاً اوپر چڑھی ہوئی، گرج دار آواز، جسم مائل بہ فربہی رنگ وہی جو انگریزوں کا ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ چینیوں کا چہرہ عمر سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اور انگریزوں کا جذبات سے عاری بلکہ بعض اوقات تو چہرہ سے بھی عاری ہوتا ہے۔ لیکن یہ بالکل مختلف چہرہ تھا ایک عجیب تمکنت اور دبدبہ تھا اس چہرے پر۔ کمرے میں فرنیچر برائے نام، سارا کمرہ اس کے چہرے ہی سے بھرا بھرا نظر آتا تھا، بلکہ یہ مقابل ہو تو کوئی اور چیز۔ اس کا اپنا جسم بھی۔ نظر نہیں آتا تھا۔'' [1]

اس اقتباس سے مسٹر اینڈرسن کی پوری شخصیت ظاہر ہو جاتی ہے۔ مصنف نے جودت طبع کے سہارے اینڈرسن کے چہرہ کے بیان میں تمسخر اور مزاح کا جو رنگ پیدا کیا ہے وہ انہی کا خاصہ ہے۔ لیکن کمال یہ ہے کہ اس تمسخرانہ مزاح میں تضحیک نہیں، ہمدردی، اپنائیت اور خلوص کا پہلو نمایاں ہے۔ کیونکہ طنز و مزاح کا مقصد کسی کی دل آزاری، دل شکنی نہیں بلکہ اس کے پس پردہ سماج کی بداعمالیوں، خباثتوں اور برائیوں سے سماج کو نجات

[1] زرگزشت، مشتاق احمد یوسفی، چمن بک ڈپو، اردو بازار، دہلی، جون ۱۹۷۶، ص ۲۶-۲۵

دلانا مقصود ہوتا ہے۔محض طنز سے سماج کی اصلاح ممکن نہیں۔طنز میں خلوص کا پہلو بھی نمایاں ہونا چاہیے۔

''زرگزشت'' کا مرکزی کردار اگرچہ مصنف کی اپنی شخصیت ہے لیکن کہیں بھی وہ خود کو ظاہر نہیں ہونے دیتے۔لیکن اگر کہیں خودنمائی کی ضرورت بھی پیش آتی ہے تو وہ خود کو ہی طنز وتعریض کا نشانہ بناتیہیں۔کیونکہ زندہ دل وہی ہوتا ہے جو خود پر ہنستا ہے اور اپنی خامی پر نگاہ رکھتا ہے اس اعتبار سے ''زرگزشت'' کا مطالعہ کیا جائے تو واضح طور پر مشتاق احمد یوسفی کی زندہ دلی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔خود کو تضحیک کا شکار بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اینڈرسن کے حضور میں پیش ہونے سے پہلے ہم نے ایک غیر متعلق فائل ہاتھ میں لے لی، جسے خاص انداز سے پیچھے لگا لینے سے گرم پتلون کی سیٹ کے سوراخوں، ہوادانوں ش اور رفو درر فو کی ستر پوشی ہوجاتی تھی۔اس نے کبھی یہ نہ پوچھا کہ برخوردار تم اس فائل کو ہر وقت سینے بلکہ کولہوں سے لگائے کیوں پھرتے ہو۔''[1]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''ذہن پر زور ڈالا تو اس کا بھی حل نکل آیا کہ چپل پھینک کر ایک پیر پر پٹی باندھ لیں گے۔کسی نے پوچھا تو کہہ دیں گے کہ چوٹ لگ گئی ہے اور یہ کچھ ایسا جھوٹ بھی نہیں۔آخر اندرونی چوٹ آئی ہے تھی۔ایک مونڈھے پر نیلے رنگ کا جھاڑن نظر آیا اس میں سے ایک لمبی دھجی پھاڑ کر پٹی باندھ لی۔ سہ پہر کو اینڈرسن کی نظر پڑی تو کہنے لگے کہ زخم پر کبھی رنگین پٹی نہیں باندھنی چاہیے پک جاتا ہے خصوصاً برسات میں۔

دوسرے دن صبح ہم دونوں کام پر جانے کے لیے تیار ہونے لگے تو بیگم دوپٹہ اوڑھے ہوئے کہنے لگیں کہ تمہارے ان لاڈلوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔اور کچھ نہیں تو کم بخت آدھا دوپٹہ پھاڑ کر لے گئے۔

ہم پٹی بجنسہ واپس کردی اور جلدی جلدی ایک پھٹے پاجامے کے لٹھے کی سفید پٹی باندھ کر بینک چلے

[1] زرگزشت، مشتاق احمد یوسفی، چمن بک ڈپو، اردو بازار، دہلی، جون ۱۹۷۶، ص ۱۸۸

گئے۔گیارہ بجے کسی کام سے اینڈرسن نے طلب کیا واپس آنے لگے تو عینک کی ناک کی پھننگ کے اوپر سے دیکھتے ہوئے فرمایا۔تمہارے زخم نے چوبیس گھنٹے میں کافی مسافت طے کرلی ہے۔ یہ دائیں سے بائیں پیر میں منتقل ہوگیا ہے اب جو ہم نے نگاہ ڈالی تو دھک سے رہ گئے افراتفری میں آج دوسرے یعنی بائیں پیر پر پٹی باندھ کر آ گئے تھے۔''[1]

طنز وظرافت کے لحاظ سے مشتاق احمد یوسفی اپنے ہم عصروں سے ممتاز تو ہیں ہی کہیں کہیں اپنے پیش روؤں سے بھی سبقت لے جاتے ہیں۔ انھوں نے خود مذاقی اور خود تضحیکی کا ڈھنگ رشید صدیقی اور غالب سے سیکھا ہے۔ جب کبھی انھیں ہنسنے اور مذاق اڑانے کا موقع ہاتھ آتا ہے تو وہ سب سے پہلے خود پر ہی پھبتیاں کستے ہیں۔ زبان و بیان پر مشتاق یوسفی کی دسترس، زرگزشت کے تمام ابواب سے نمایاں ہے۔ یہی مشتاق یوسفی کا امتیازی وصفہے۔ زبان انتہائی چٹخارے دار استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے طنز ومزاح کا رنگ دوآتشہ ہوجاتا ہے۔ موصوف طنز ومزاح میں بھی اقدار کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، پھکڑ پن، بے حیائی اور فحاشی سے شعوری طور پر گریز کرتے ہیں۔ ان کی تمام تحریروں میں یہ خوبی نمایاں ہے۔

آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی (۱۹۷۸)

مولانا عبدالماجد دریابادی کی ''آپ بیتی'' ایک ایسی کثیر الجہات شخصیت کی زندگی کے گم گشتہ اوراق کی تصویر کشی کرتی ہے، جو اپنے آپ میں ایک انجمن، ایک ادارہ، ایک مشن، ایک تحریک ہے۔ بیک وقت مولانا انشاپرداز، بے باک صحافی اور صاحب طرز ادیب تھے۔ ہر صنف میں مشاہیر علم وفن ان کی صلابت نظری کے قائل ہیں۔ ادبی موضوعات سے لے کر مذہبی، عمرانی، فلسفیانہ، تاریخی اور تہذیبی زندگی کا شاید ہی کوئی شعبہ اور پہلو ہو، جس پر مولانا کی نگاہ نہ رہی ہو۔ انہوں نے ہر موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، اسی وجہ سے ان کی تحریروں کو علمی حلقے میں وقار و اعتبار حاصل ہے۔ ان کا ایک منفرد اسلوب ہے جو علم و ادب کے اژدہام میں قاری کی نگاہ اپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے۔ گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے ان کی آپ بیتی غیر معمولی دلکشی اور

[1] زرگزشت، مشتاق احمد یوسفی، چمن بک ڈپو، اردو بازار، دہلی، جون ۱۹۷۶، ص ۲۲۰-۲۱۹

اہمیت کی حامل بن جاتی ہے۔ ان کی آپ بیتی کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں مولانا کی نجی اور مخفی زندگی کے گمنام گوشے یکے بعد دیگرے وا ہوتے چلے جاتے ہیں اور مولانا کی شخصیت کی دل آویزی کا نقش قاری کے دل میں گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ نئی وسعتوں کی تلاش و جستجو اور نئے افق کی تمنا ان کی آپ بیتی کا نصب العین ہے۔ اس ''آپ بیتی'' سے جہاں مولانا کی دردمندی، رحم دلی کا پتہ چلتا ہے وہیں مولانا کے اس درد کا بھی ادراک ہوتا ہے جب وہ سماج کے عدم مساوات پر مچل اٹھتے تھے۔ مولانا ایک انتہائی متمول گھرانے کے چشم و چراغ تھے لیکن ہمیشہ ایک گہرا انسانی درد اپنے سینے میں رکھتے تھے۔ مولانا بچپن سے ہی انسانی معاشرے میں تفریق، نسلی امتیاز، ذاتی بھید بھاؤ، تعصب، بداخلاقی اور بدعنوانی کے خلاف کڑھن اور گھٹن محسوس کرتے تھے۔ جس کا جابجا اظہار ان کی ''آپ بیتی'' میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ مولانا اپنے بچپن کا نقشہ جس طرح کھینچتے ہیں اس سے نہ صرف سماج میں ناسور کی طرح جڑ پکڑتی خامیاں اجاگر ہوتی ہیں، بلکہ جاگیردارانہ سماج کی پیدا کردہ مصنوعی اور کھوکھلی زندگی اپنے تمام معائب کے ساتھ واضح ہو جاتی ہے۔

> ''نائی، دھوبی، بھشتہ (سقہ)، دھنئے، جولاہے، لوہار، بڑھئی، مزدور، کسان اور قلی وغیرہ سارے پیشہ ور کمینے قرار پا گئے اور شرافت کا معیار یہ ٹھہرا کہ نسب میں میاں لوگوں کے ٹکر کا کوئی ہے ہی نہیں اور شریف ذاتیں صرف شیخ و سید میں محدود ہو کر رہ گئی تھیں اور پھر باہم ان کبھی تفاضل اور شیخوں کی شیخی کی کوئی حد ہی نہیں۔ اپنے ہاتھ سے اپنا کام کرنا سو عیبوں کو ایک عیب اور سو ذلتوں کی ایک ذلت، تجارت دوکان داری، کاشت کاری سب میں ہماری سبکی اور توہین...
>
> نائی، منہار، کنجڑے، قصائی وغیرہ سب پر جا یا رعایا کہلاتے تھے۔ ان کی نہ کوئی عزت نہ ان کی عورتوں کی کوئی عصمت، ہم یہاں لوگ ان کے مقابل میں فرعون بے ساماں، مجال نہیں کہ جب میاں لوگ اپنے بیٹھکے میں بیٹھے ہوں تو کوئی نیچ قوم کا لڑکا یا جوان ان کے سامنے سائیکل پر سے گزر سکے۔''[1]

ایک بڑی خوبی جو مولانا کی ذات کا حصہ تھی جس کا اندازہ آپ بیتی کی ورق گردانی سے ہوتا ہے، وہ ان کی خاکساری، کسرنفسی اور معروضی انداز بیان ہے۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ جب انسان اپنی ذات کے حوالے

[1] آپ بیتی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مکتبہ فردوس، لکھنؤ، ۱۹۷۸ء، ص ۲۴-۲۳

سے گفتگو کرتا ہے تو اس کی گفتگو توازن کے وصف سے عاری ہو جاتی ہے اور وہ اپنی ذات کو خوبیوں کا پیکر، صفات و کمالات کا منبع کہنے لگتا ہے، کسر نفسی، عجز و انکساری کے بجائے تعلّی سے کام لینے لگتا ہے۔ مولانا کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے خودستائی سے ''آپ بیتی'' کو محفوظ رکھا ہے۔ ماجد دریا آبادی اس مقام سے بھی سلامت روی کے ساتھ گزرے ہیں اور انہوں نے وہی کچھ کہنے کی کوشش کی ہے جس کی صداقت قبول کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ ایسا وصف ہے، جس سے پوری آپ بیتی معمور ہے۔

مذکورہ سطور کی تائید کے لیے آپ بیتی کا اقتباس مذکور ہے:

''لکھنؤ میں ناچ رنگ کے اڈوں کی کیا کمی تھی اور مجھے آزادی بھی بڑی حد تک حاصل تھی۔ لیکن اس فطری شرم و حیا کا اقتضا سمجھئے یا خاندانی شرافت کا کہ کبھی ایسے رنگین محفلوں میں قدم رکھنے کی بھی ہمت نہ ہوئی اور طالب علمی بھر آمد و رفت بس دو ایک سنجیدہ اور ثقہ مرقعوں تک محدود رہی۔'' [1]

مولانا کی زندگی کا یہ پہلو بھی قابل توجہ ہے کہ انہوں نے مذہب اسلام (جو ان کا آبائی مذہب تھا) سے پھر گئے اور کفر و الحاد کی طرف مراجعت کی اور تقریباً 10 سال بے دینی و ارتداد کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے رہے، لیکن رفتہ رفتہ ان کا دائرہ علم وسیع ہوا تو مذہب کے تئیں ان کی فکر میں تبدیلی آنے لگی اور وہ اسلام کی جانب واپس لوٹ آئے۔ مولانا کی زندگی کے اس تاریک پہلو سے اکثر لوگ ناواقف ہیں۔ اس سے پہلے تک مولانا کی شبیہ ایک مذہب پرست انسان کی تھی۔ مولانا کو جن اشخاص کی وساطت سے روحانی فیض پہنچا، ان میں مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا محمد علی جوہر کی خصوصی اہمیت ہے۔ اس تعلق سے مولانا نے مولانا محمد علی جوہر کے بارے میں جو لکھا ہے اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ حریت کے نقیب مولانا محمد علی جوہر کی زندگی قرآن کی روشنی سے منور تھی، قرآن ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔

''سب سے بڑھ کر استفادۂ ایمانی مولانا محمد علی جوہر سے، دیکھنے میں نہ وہ درویش، نہ عالم، نہ مصلح، لیکن حقیقت میں دس درویشوں کے ایک درویش، حرارت ایمانی کے ایک دہکتے ہوئے تنور، عشق رسول اور عشق قرآن کو گویا اوڑھنا اور بچھونا بنائے ہوئے، اپنے ایمان میں اگر جان پڑی تو ان ہی

---

[1] آپ بیتی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مکتبہ فردوس، لکھنؤ، ۱۹۷۸، ص ۲۴

کے فیض صحبت سے...'' [1]

آپ بیتی کی زبان و بیان شستہ اور رواں دواں ہے۔ آپ بیتی کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کی زبان کا بنیادی وصف سادگی، صفائی، وضاحت اور قطعیت ہے۔ مولانا کی آپ بیتی استدلالی نثر کی عمدہ مثال ہے۔ آپ بیتی میں موضوعاتی تنوع، زبان کی مٹھاس، نغمگی، سبک خرامی سبھی کچھ موجود ہے۔

اس لحاظ سے ماجد دریا آبادی کی مجموعی ادبی کاوشوں پر بالخصوص آپ بیتی کی نثر پر پروفیسر احتشام حسین کا یہ قول صادق آتا ہے:

''اپنی بات کو کہنے کو جوش میں حقائق کو نظر انداز نہیں کرتے اور جہاں تک ادب کا تعلق ہے اس کے اخلاقی پہلو پر زور دیتے ہوئے بھی تخلیق کے ادبی جمالیاتی حسن پر نگاہ ڈالتے ہیں۔'' [2]

مولانا دریا آبادی کی یہ آپ بیتی فن اور اسلوب کے اعتبار سے اردو کی تمام آپ بیتیوں میں منفرد اور ممتاز ہے کیونکہ اس میں جذبات و واقعات کی ہم آہنگی ہے۔ آپ بیتی میں مولانا دریا ابادی نے بڑی چابک دستی سے اپنے سماج کی عکاسی کی ہے، جس میں اس عہد کا اودھ اپنے تمام کوائف کے ساتھ جیتا جاگتا نظر آتا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ وہ اپنی اندرونی شخصیت اور اپنی ذات کو پوری طرح سے قاری کے سامنے پیش کر دیتے ہیں لیکن اس پیشکش میں بھی واقعات اور جذبات کی انتخابیت خودنوشت کو بوجھل نہیں ہونے دیتی۔ ان ساری خصوصیات اور حقائق کی بنا پر یہ آپ بیتی اردو کی نمائندہ آپ بیتی کہی جا سکتی ہے۔

حیات مستعار: جلیل قدوائی (۱۹۸۷)

''حیات مستعار'' جلیل احمد قدوائی کی خودنوشت ہے جو ان کی ۱۹۰۴ء سے ۱۹۲۲ء تک کے حالات زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کی اشاعت ۱۹۸۷ء میں ہوئی۔ اس میں جیل قدوائی کی پیدائش، بچپن اور ہائی اسکول تک کی تعلیم کا ہی ذکر ملتا ہے۔ مصنف کی بقیہ زندگی اور تعلیم کا ذکر اس میں نہیں ملتا۔ خودنوشت کا دائرہ

[1] آپ بیتی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مکتبہ فردوس لکھنؤ، ۱۹۷۸، ص ۲۵۹-۲۵۸

[2] مولانا عبدالماجد دریابادی کی تنقیدی بصیرت، احتشام حسین، فروغ اردو، ماجد دریابادی نمبر لکھنؤ، ۱۹۷۱، ص ۱۰۰-۹۹

مصنف کی ذات کے علاوہ والدین، بہن بھائی، پھوپھا پھوپھی، نانا نانی، خالہ خالو، ماموممانی تک پھیلا ہوا ہے۔ ایک جگہ اپنی تاریخ پیدائش ۱۶ مارچ ۱۹۰۴ لکھتے ہیں تو دوسری جگہ ۲۳ دسمبر ۱۹۰۴ لکھتے ہیں۔ گھریلو حالات اور ماحول کا نقشہ انھوں نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اور افرادخانہ کا ذکر بھی بھرپور انداز میں کیا ہے۔ اپنی والدہ شہزادی بیگم کی سیرت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میری امّی ...جن کی ہر بات آنکھ بند کر کے ایمان لانا اپنے مذہب پر ایمان لانے کے برابر سمجھتا ہوں اور جنھوں نے اپنی ساری زندگی مجھے میرے عزیز و محترم بزرگ جناب شیخ ممتاز احمد قدوائی کو میرا باپ بتایا، اور اپنا شوہر مانا، اور اسی حیثیت سے ان کی بے اندازہ خدمت کی۔ اس کے علاوہ ہر دو کی بے پناہ محبت و شفقت نیز ان کا حسن سلوک، ان کے الطاف، ان کے احسانات میرے ابتدائی ہوش سے ان کی وفات تک کچھ اس طرح میرے شامل حال رہے اور ان کی دعاؤں کا سایہ کچھ ایسا مجھ پر چھایا رہا کہ ان کے اور اپنے درمیان والدین اور اولاد کے تعلق کے بارے میں میرا کسی قسم کا شبہ کرنا کفر کے مترادف ہوگا۔'' [1]

زمانے کے دستور کے مطابق ان کی ابتدائی تعلیم گھر سے شروع ہوئی۔ اردو فارسی ناظرہ کلام پاک کی تعلیم اپنے والدین کے علاوہ مولوی زاہد سے حاصل کی۔ ۱۹۱۴ میں چوتھی جماعت میں اناؤ کے ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ اور وہاں چھٹے درجے تک کی تعلیم حاصل کی۔ اناؤ ہائی اسکول میں گزارے ایام کو مصنف نے اپنی زندگی کے بیش بہا ایام سے تعبیر کیا ہے۔ یہیں سے ان کا شعر و شاعری کا ذوق پروان چڑھا۔ خودنوشت میں اساتذہ اور دوست واحباب کا ذکر بھی دلکش انداز میں کیا ہے۔ کتاب میں جگہ جگہ سفرنامے کا عنصر بھی نظر آتا ہے، جس سے خودنوشت کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ تعلیم کے سلسلے میں جلیل قدوائی کو اناؤ، بلگرام، صفی پور اور ملیح آباد کا سفر کرنا پڑا۔ اس زمانے میں سفر کرنا امر دشوار کو دعوت دینا تھا۔ چونکہ سواری کی سہولتیں میسر نہیں تھیں، لوگ اونٹ، بیل گاڑی، یکہ، تانگا اور قرب جوار کے اسفار تو پیدل ہی کیا کرتے تھے۔ گھنٹوں کی مسافت، کئی دن میں طے ہوتی اور دور دراز کے سفر میں ہفتوں میں نہیں بلکہ مہینوں میں طے ہوتے تھے۔ طویل

[1] حیات مستعار، جلیل قدوائی، المخزن پرنٹر، کراچی، ۱۹۸۷، ص ۱۳

سفر کے دوران خورد ونوش کی پریشانی کا تو ذکر ہی کیا کبھی کبھی مسافر کو جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا تھا۔ مصنف اونٹ گاڑی کے سفر کا حال یوں لکھتے ہیں:

''مسافروں کی کثرت اور بہ حیثیت مجموعی گاڑی کے پنجر ڈھیلے ہونے کے سبب راستہ بھر اتنے ہچکولے اور دھکے لگتے کہ بس خدا ہی یاد آجاتا اور اونگھتے ہوئے مسافروں سے ٹکراتے رہنے کے سوا سونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا... گاڑی اتنا شور مچاتی اور کھڑ کھڑ پھٹ پھٹ کرتی اس طرح چلتی کہ قلب و دماغ کا سکون غائب ہو جاتا۔ سونے کے بجائے جیسا کہ پطرس نے ایک موقع پر لکھا ہے مسافروں کے ''آباواجداد کی روحیں جاگ'' اٹھتی تھیں۔'' [1]

تعلیم کے سلسلے میں قدوائی صاحب کو اناؤ کے سرکاری بورڈنگ ہاؤس میں بھی رہنا پڑا، وہاں کے طلبا کھیل کود، دوست واحباب کرکٹ، بیڈمنٹن کے علاوہ وہاں کی اجتماعی زندگی کا نقشہ بہت ہی دلچسپ انداز میں جزئیات نگاری کے ساتھ پیش کیا ہے، جن سے ان کی ذہانت ومتانت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''جتنا میں اردو ادب نیز انگریزی میں شاندار اور تاریخ وجغرافیہ وغیرہ میں اچھا طالب علم تھا اتنا ہی ریاضی میں کمزور تھا، یعنی حساب اور الجبرا میں مجھے کبھی صفر بھی مل جاتا تھا۔ ہاں جیومیٹری میں ضرور تیز تھا اور جماعت میں اپنے استاد کو بھی سکھا دیتا تھا... جب وہ بلیک بورڈ پر کتاب میں لکھے ہوئے طریقے سے مسئلے کو ثابت کرتے، تو میں ان کی اجازت سے بورڈ پر جا کر اسے اور طریقوں سے ثابت کر دیتا۔ سب دنگ رہ جاتے اور میرا سب پر رعب چھا جاتا۔'' [2]

''حیات مستعار'' جلیل قدوائی کی زندگی مختصر لیکن دلچسپ روداد ہے۔ اختصار کے باوجود مصنف کی زندگی کا کوئی پہلو تشنہ نہیں معلوم ہوتا۔ تعلیم سے رغبت، ادب وثقافت اور شعر وسخن سے لگاؤ کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ تعلّی وخودستائی سے صرف نظر کر کے مصنف نے خودنوشت کے فن کو مجروح ہونے سے بچایا ہے اور فنی نزاکتوں کی پاس داری کی ہے۔

---

[1] حیات مستعار، جلیل قدوائی، المخزن پرنٹر، کراچی، ۱۹۸۷، ص ۶۳-۶۲

[2] حیات مستعار، جلیل قدوائی، المخزن پرنٹر، کراچی، ۱۹۸۷، ص ۸۵

جواب دوست: نسیم انصاری (۱۹۸۸)

''جواب دوست'' علی گڑھ میڈیکل کالج کے مشہور سرجن پروفیسر نسیم انصاری کی خودنوشت ہے۔ اس میں روایت کا تتبع نہیں، انفرادیت ہے۔ اس کے پہلے باب میں نہ تو مصنف کا حسب ونسب ہے، نہ ہی پیدائش کی تاریخ، نہ گھریلو باتیں نہ خاندانی وجاہتیں، نہ عشقیہ واقعات، نہ سیر وتفریح کی حکایات، نہ نرگسیت نہ علمی فتوحات کا بیان، نہ تعلّی نہ خودستائی، اس لیے یہ ''آپ بیتی'' کم ''جگ بیتی'' زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ خودنوشت پہلے مختلف قسطوں میں ''تہذیب الاخلاق'' میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد کتابی شکل میں ۱۹۸۸ میں پہلی بار شائع ہوئی۔ یہ خودنوشت ۱۹ ابواب اور ۱۷۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ خودنوشت میں بچھڑے ہوئے دوست (نسیم انصاری) نے دوسرے بچھڑے ہوئے دوست (مختار مسعود) کو اپنے دلی جذبات واحساسات سے آگاہ کرایا ہے۔ پوری خودنوشت میں محبت، اپنائیت اور خلوص کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ دوست کی یادیں، دوست کی باتیں مصنف کے لیے کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ پوری خودنوشت میں یہی جذبہ واحساس نظر آتا ہے۔ ایک دوست دوسرے دوست کو مخاطب کرتے ہوئے خودنوشت کے آغاز میں اس طرح لکھتا ہے:

> ''علی گڑھ میں ہم دونوں اسکول میں اور اس کے بعد یونیورسٹی میں ساتھ ساتھ تھے۔ آپ مجھ سے شاید تین برس آگے تھے۔ میں ۱۹۴۷ میں ڈاکٹری پڑھنے کلکتہ چلا گیا اور آپ ایک سال اور علی گڑھ میں رہ کر پاکستان چلے گئے... آپ کی آواز دوست جب آج سے ۱۴ (چودہ) برس پہلے علی گڑھ آئی تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے آپ جواب دوست کا انتظار کریں۔''[1]

مذکورہ سطور پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خودنوشت نہیں بلکہ کسی خط کا اقتباس ہے۔ پوری خودنوشت میں مکالماتی تکنیک اور ڈرامائی اسلوب نظر آتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہیں اور گفت وشنید کا سلسلہ جاری ہے، باتوں باتوں میں پرانی یادوں کے گمنام صفحات کھلتے چلے گئے ہیں اور ان ہی یادوں کے

[1] جواب دوست، نسیم انصاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۸، ص ۱۱

سہارے گفتگو آگے بڑھتی جاتی ہے۔ان خوشنما یادوں میں تلخی کی تلچھٹ نہیں محبت کی شیرینی ہے۔مصنف نے خودنوشت میں اپنے زمانے کے معاشرتی اور سیاسی حالات کا بھی ذکر کیا ہے۔خودنوشت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایف ایس سی تک کی تعلیم علی گڑھ سے حاصل کی،اس کے بعد ایم بی بی ایس کی اعلیٰ تعلیم کے لیے کلکتہ چلے گئے۔آپ بچپن سے ہی انقلابی ذہن کے تھے اس لیے انقلابی تحریکوں کے سرگرم کارکن کی حیثیت سے بھی اپنی پہچان بنائی۔آپ محنتی اور بلا کے ذہین تھے اس لیے امتیازی نمبر سے کامیابی حاصل کرنے کے بعد وظیفہ سے سرفراز ہوئے اور ایم بی بی ایس کے بعد مزید تعلیم کے لیے اپنی اہلیہ زینت کے ہمراہ انگلستان چلے گئے۔سرجری میں گہری دلچسپی کی وجہ سے کچھ ہی دنوں میں سرجن کے طور پر مشہور ہو گئے۔سات برس تک انگلستان کے مختلف اسپتالوں میں جراحی کی مکمل ٹریننگ لینے کے بعد ۱۹۶۴ میں علی گڑھ واپس آ گئے،اس وقت یونیورسٹی کے وائس چانسلر معروف دانشور بدرالدین طیب جی تھے،جنھوں نے نسیم انصاری کی صلاحیت اور جراحی میں مہارت کی وجہ سے شعبہ جراحت میں ان کو لیکچرار کے عہدے پر بحال کر دیا اور ان کی اہلیہ بیگم زینت بچوں کے علاج کے شعبے سے منسلک ہو گئیں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب میڈیکل کالج کی کوئی باضابطہ عمارت نہیں تھی اور نہ ہی شعبہ میں جراحی کے اوزار تھے۔۱۹۶۲ میں میڈیکل کالج کا قیام عمل میں آیا۔۱۹۶۹ء میں میڈیکل کالج کے لیے پختہ عمارت تعمیر ہوئی۔

''جواب دوست'' میں ڈاکٹر نسیم انصاری نے اپنی شخصیت کے بیان یا نجی حالات کی تفصیل کے بجائے سیاست،مذہب اور طب پر گفتگو کی ہے۔بحث میں مفکرانہ،مدبرانہ اور فلسفیانہ نکات در آئے ہیں۔خودنوشت کے تعارف میں آل احمد سرور،نسیم انصاری کی شخصیت سے متعلق اپنی رائے اس طرح پیش کرتے ہیں:

> ''ایک ممتاز سرجن ہونے کے علاوہ ایک دانشور بھی ہیں۔علمی،ادبی،سیاسی،تہذیبی اور تعلیمی مسائل سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔'' [1]

مجموعی طور پر ڈاکٹر نسیم انصاری کی خودنوشت ''جواب دوست'' ایک دلچسپ کتاب ہے،جس میں ضمناً

[1] جواب دوست،نسیم انصاری،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،۱۹۸۸،ص ۷

علی گڑھ میڈیکل کالج کی تاریخ بھی در آئی ہے۔ اس طرح یہ کتاب علی گڑھ کی تاریخ اور اس دور کی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے۔ مصنف نے اپنے زمانۂ طالب علمی کے حالات سے کر اشاعت سے قبل تک کے حالات نہایت سلیس زبان میں پیش کیے ہیں۔ اپنی فتوحات علمی، جراحی میں دسترس اور مادر درسگاہ کی خدمت کا تذکرہ بھی سلیقے سے کیا ہے لیکن خودستائی اور تعلّی سے دامن بچاتے ہوئے۔

ورودِ مسعود: ڈاکٹر مسعود حسین خاں (۱۹۸۸)

اردو ادب میں ایک ایسی آپ بیتی بھی لکھی گئی ہے، جسے بلاشبہ اردو کی چند بہترین آپ بیتیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ وہ ہے ''ورود مسعود'' جس کے مصنف ہیں مشہور ماہر لسانیات، محقق، نقاد اور شاعر مسعود حسین خاں۔ یہ ضرور ہے کہ بعض لوگ اسے ''نامسعود'' قرار دیں گے کیونکہ اس میں ان کا ذکر اچھے لفظوں میں نہیں آیا۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ خودنوشت کے ذریعہ مصنف اپنی ذاتی زندگی کا اظہار تو کرتا ہی ہے، ساتھ ہی ان احباب و متعلقین کا ذکر بھی کرتا ہے، جن سے اس کے مراسم رہے ہیں۔ گویا خودنوشت سے مصنف کی زندگی کے گمنام گوشے تو روشن ہوتے ہی ہیں ساتھ ہی معاصرین کی شخصیت بھی بے نقاب ہو جاتی ہے۔

''ورود مسعود'' میں مصنف نے غیر ضروری واقعات کے بیان سے گریز کیا ہے اور انہیں چیزوں کو جگہ دی ہے، جو خودنوشت کے لیے ضروری ہیں۔ موصوف نے اپنے تجربات و مشاہدات میں قارئین کو شریک کیا ہے اور ایسے واقعات بیان کیے ہیں، جن سے خودنوشت کی معنویت میں اضافہ ہوا ہے۔ ان کی اس خوبی نے بہتوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ ورود مسعود کا شمار اردو کی چند بہترین آپ بیتیوں میں اس لیے ہوتا ہے کہ اس کے دامن میں کوئی بات نظر نہیں آتی، جو آپ بیتی کے دائرے میں نہ آتی ہو۔ عام آپ بیتی نگاروں کی طرح انہوں نے اپنے موضوع سے کہیں انحراف نہیں کیا اور نہ ہی اپنے تجربات و مشاہدات کے بیان میں غلو سے کام لیا ہے۔ [1]

ڈاکٹر مسعود حسین خاں بنیادی طور پر ماہر لسانیات ہیں۔ اس لیے ان کا انداز بیان و اسلوب بیان بھی

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، مرتب مظفر علی سید، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۹۵، ص ۱۵۴

لسانی فارمولے کا حامل نظر آتا ہے۔ جو واقعہ بیان کرنا چاہتے ہیں وضاحت، صراحت اور قطعیت کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں:

''موصوف نے اپنی خودنوشت میں موقع ومحل کے اعتبار سے اپنے بیشتر اشعار کوٹ کیے ہیں جن کی وجہ سے خودنوشت کی ضخامت میں خاطر خواہ اضافہ ہوگیا ہے۔ اس کتاب کی نمایاں خوبی دلکش پیرایۂ بیان ہے جبکہ محقق زبان و بیان کی دلکشی سے اجتناب کرتے ہیں۔ وہ زبان و بیان میں علمیت کے اظہار کے قائل ہوتے ہیں، نہ کہ زبان و بیان کی دلکشی کے۔ موصوف واقعات کو خوش اسلوبی سے اور دلکش پیرائے میں بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ''ورود مسعود'' کا خوبصورت پیرایۂ بیان قاری کو اس طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کہ کتاب کو شروع کرنے اور ختم کرنے کے درمیان کوئی دوسرا کام کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ ''ورود مسعود'' میں مصنف نے صرف اپنی زندگی کے واقعات ہی نہیں بلکہ ایک عہد کو سمیٹا ہے۔ ان کا عہد، ان کا ماضی پوری طرح کتاب کے اندر سانس لیتا نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کو یوں سمیٹا ہے کہ جس سے ایک پورے عہد کی ادبی، ثقافتی، معاشرتی سمت و رفتار کے تعین میں قاری کو نہ صرف آسانی ہوتی ہے بلکہ اس عہد کے ادبی مزاج سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔ ورود مسعود ایک بھرپور زندگی کی روداد ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنے تجربات و مشاہدات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک فرد ہی نہیں ایک پورے عہد کی زندگی کے نشیب و فراز بھی ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔'' [1]

اس آپ بیتی کا مطالعہ کئی حوالوں سے کیا جا سکتا ہے۔ اس میں سفرنامے کا خوبصورت انداز ملتا ہے۔ شخصی خاکہ نگاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ عملی زندگی کے ساتھ ساتھ فرضی زندگی کے سفر کی روداد ملتی ہے۔ اس میں قدیم تہذیب کی مرقع نگاری کی آمیزش بھی ہے۔ تعلیمی اداروں کی زبوں حالی و پسماندگی کی داستان بھی، غرض اس میں دنیا جہان کے قصے دلکش انداز میں سحر انگیزی کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

خودنوشت میں مسعود حسین خاں نے اس عہد کی علمی و ادبی شخصیتوں کا ذکر بڑے چاؤ سے کیا ہے۔

---

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، مرتب مظفر علی سید، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۹۵، ص ۱۵۷

بالخصوص آل احمد سرور اور رشید احمد صدیقی کا موازنہ ''موازنہ انیس و دبیر'' کی طرح ''موازنہ رشید و سرور'' کی صورت میں مرتب کیا ہے اور سرور صاحب کی اخلاقی عظمت پر رشید صاحب کی کریم النفسی، سخاوت، دریا دلی اور مہمان نوازی کو فوقیت دی ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''رشید صاحب کی شخصیت زیادہ کڑھی ہوئی تھی۔ صدیقی دونوں تھے، رشید صاحب میں شیوخ کی آن بان تھی۔ ان کی پسند و ناپسند بھی شدید تھی۔ ان کے کردار کی سب سے نمایاں خوبی ان کی فیض رسانی اور کریم النفسی تھی۔ سرور صاحب نسبتاً تنگ دل رکھتے ہیں، وہ ابتدا میں جس کو بڑھاتے ہیں، آخر میں اسی سے رشک کرنے لگتے ہیں۔ سرور صاحب کے یہاں تواضع کرنے سے زیادہ تواضع کروانے پر زور ملتا ہے۔ رشید صاحب کا اس اعتبار سے دسترخوان بہت کشادہ تھا، ان کے یہاں معقول، نامعقول ہر طرح کے مہمانوں کا تانتا لگا رہتا تھا، خود سدا کے حاجت مند ہوتے ہوئے دوسروں کی حاجت روائی کرتے رہے۔'' [1]

اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ دوٹوک انداز بیان کے ساتھ دو شہسوار قلم کی داستان حیات اور ان کی سخاوت و فیاضی اور ان کی طبیعت کی کڑواہٹ کے بیان اور واقعات کے دروبست میں یہ خودنوشت اپنی مثال آپ ہے۔ زبان و بیان کی چاشنی اور پرکشش اسلوب کے لیے یہ خودنوشت علمائے ادب کے لیے ہمیشہ توجہ کی مستحق بنی رہے گی۔

خواب باقی ہیں: آل احمد سرور (۱۹۹۱)

اردو کے مشہور نقاد، دانشور اور اقبالیات کے ماہر پروفیسر آل احمد سرور کی خودنوشت ''خواب باقی ہیں'' کئی حوالوں سے اردو خودنوشت میں امتیازات کی حامل ہے۔ سرور صاحب نے اپنی زندگی کے نشیب و فراز مدوجزر اور اپنی جدوجہد کی پوری داستان اس میں لکھ دی ہے۔ انھوں نے مختلف ماحول اور موسم میں اپنی زندگی کے شب و روز گزارے ہیں اور مختلف ماحول میں جو اثرات ان کے ذہن پر پڑے ہیں ان کی پوری تفصیل اس

[1] خامہ بگوش کے قلم سے، مرتب مظفر علی سید، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۹۵، ص ۱۵۸

کتاب میں موجود ہے۔آل احمد سرور کی داخلی اور خارجی شخصیت کی تفہیم میں یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ کیونکہ سرور صاحب نے اس خودنوشت میں اپنی ذات،شخصیت اوراپنے احباب کے حوالے سے بہت کچھ ایسا لکھ دیا ہے جس سے صرف سرور صاحب ہی نہیں بلکہ ادب وثقافت کے بہت سے اہم کرداروں سے مکمل آشنائی ہوتی ہے۔سرور صاحب کی بہت سارے اداروں سے وابستگی رہی ہے،ان اداروں سے متعلقہ شخصیات وہاں کی سرگرمیاں اوردیگر مشاغل کے حوالے سے بھی اس میں ایسا بہت کچھ ہے جس سے صرف شخصیتیں ہی ذہن میں روشن نہیں ہوتیں بلکہ بہت سے مقامات بھی اپنی تمام تر معنویت کے ساتھ منور ہوتے ہیں۔انھوں نے رام پور،لکھنؤ اورعلی گڑھ جیسے ادبی مراکز میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزارا اس لیے ان شہروں کی عملی ادبی فضا کے حوالے سے لکھا اوران مقامات کی ادبی مرکزیت کوانھوں نے روشن کیا۔ یہ صرف ان کی خودنوشت نہیں ہے بلکہ ایک عہد کی تہذیبی،ثقافتی اور تمدنی تاریخ بھی ہے۔سرور صاحب نے اپنی اس خودنوشت میں اپنے وطن مالوف بدایوں کا ذکر کیا ہے جومغربی اتر پردیش کا ایک تاریخی شہر رہا ہے اور جس کا پرانا نام بودھامئو ہے۔مہاتما بدھ کے زمانے سے ہی اس کا ذکر ملتا ہے۔ بدایوں ایسی جگہ ہے جس کے بارے میں مصحفی کا ایک شعر بہت مشہور ہے:

قاتل تری گلی بھی بدایوں سے کم نہیں
جس میں قدم قدم پہ مزار شہید ہے

آل احمد سرور صاحب کا سلسلہ نسب حضرت محمد بن ابوبکر سے ملتا ہے۔شیخ صدیقی خانوادے سے ان کا تعلق ہے جومصر کے قصبے فرشور سے ہندوستان آئے تھے،ان کے خاندان کے ایک پیر سید آل احمد مارہروی بہت مشہور تھے،انہی کے نام پرآپ کا نام آل احمد سرور رکھا گیا۔ان کے والد مولوی کرم احمد علی گڑھ کے فیض یافتہ تھے۔ان کے نانا مولوی حامد بخش شہر کے بڑے زمیندار تھے،جن کے کئی نعتیہ دیوان بھی مشہور ہیں۔سرور صاحب نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ میری پیدائش ۱۵؍رمضان ۱۳۲۹ کی ہے جوتقویم کے مطابق ۹؍ستمبر ۱۹۱۱ء ہوتی ہے۔

ابتدائی تعلیم انھوں نے اپنے علاقے میں حاصل کی اس کے بعد علی گڑھ آگئے۔علی گڑھ کے حوالے

سے لکھتے ہیں۔ میں جولائی ۱۹۳۲ء میں علی گڑھ آ گیا تھا، والد صاحب علی گڑھ کے صدر ڈاک خانے کے پوسٹ ماسٹر تھے۔ ڈاک خانے کے حصے میں ہم لوگ رہتے تھے۔ سید راس مسعود وائس چانسلر تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے علی گڑھ میں ایم اے سال اوّل میں داخلہ لیا۔ یہاں ان کے استاد خواجہ منظور حسین صاحب تھے۔ انھوں نے علی گڑھ کے اساتذہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس زمانے میں پروفیسر اے بی اے حلیم، پروفیسر محمد حبیب، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر ہادی حسن، پیروفیسر ایل کے حیدر، رشید احمد صدیقی، ضیاء احمد بدایونی، مولانا عبدالعزیز میمن، خواجہ منظور حسین، ڈاکٹر ظفر الحسن تھے۔

وہ بنیادی طور پر انگریزی کے طالب علم تھے اور خواجہ منظور حسین کی خصوصی تربیت کی وجہ سے ان کا انگریزی ادب سے شغف بڑھتا گیا۔

آل احمد سرور نے اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ میں نے شاعری تو ۱۰-۱۱ سال کی عمر سے شروع کر دی تھی مگر اس زمانے کی غزلیں اور نظمیں ضائع ہو گئیں:

> ''میں نے شاعری تو دس گیارہ سال کی عمر میں شروع کر دی تھی مگر اس زمانے کی غزلیں اور نظمیں ضائع ہو گئیں۔ سینٹ جانس کالج میں تعلیم کے دوران کالج کے مشاعروں میں شعر سنانے کا موقع ملا۔ سینٹ جانس کالج میگزین میں کچھ نظمیں اور غزلیں شائع بھی ہوئیں۔ فانی بدایونی اور مانی جائسی کے رسالہ ''تسنیم'' میں ایک افسانہ اور مضمون بھی چھپا تھا۔ علی گڑھ میگزین کی ادارت کے زمانے میں نثر کی طرف توجہ ہوئی۔ کشمیر کے سفر سے شاعری کو پھر تحریک ملی اور میرا پہلا مجموعہ ''سلسبیل'' ۱۹۳۵ میں شائع ہوا۔ اس کا ادبی حلقوں میں خاصا خیر مقدم بھی ہوا، مگر درس و تدریس کی ضروریات اور کچھ ذاتی میلان کی وجہ سے پھر نثر خصوصاً تنقید پر زیادہ توجہ رہی۔ شعر میں برابر کہتا رہا ہوں۔ کوئی کیفیت، کوئی تجربہ، کوئی منظر، کوئی چہرہ، کوئی تضاد مجھے ایک اور عالم میں لے جاتا ہے۔ پھر کوئی مصرعہ ذہن کے نہاں خانے سے ابھرتا ہے، کبھی پہلا مصرع کبھی دوسرا۔ اگر یہ محسوس ہوتا ہے کہ بات بن گئی تو پھر سلسلہ آگے چلتا ہے۔'' [1]

---

[1] خواب باقی ہیں: آل احمد سرور، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۱، ص ۳۳۱

ان کی خودنوشت سے ان کی افتادِ طبع کا بھی اندازہ ہوتا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''مجھے اپنی کمزوری کا احساس ہے۔ میری زندگی منظم اور مرتب نہیں ہے۔ مجھ میں کوئی ایسی امنگ(Ambition) نہیں جو ہردم مجھے دنیا میں آگے بڑھنے اور نئی سیڑھیاں چڑھنے پر اُکسائے۔ یکسوئی سے اور باقاعدگی سے کام کرنا بھی میرے لیے آسان نہیں۔ پڑھتا زیادہ ہوں، لکھتا کم ہوں۔ درباداری کسی طرح کی پسند نہیں، نہ اپنی نہ دوسروں کی، وقت پر کام نہیں کر پاتا، اکثر دیر ہو جاتی ہے۔ خیر یہ بھی غنیمت ہے کہ اندھیر نہیں ہے۔ اپنی تعریف کسے اچھی نہیں لگتی۔ مگر اس تعریف سے کسی مغالطے میں مبتلا نہیں ہوتا۔ لوگوں کو پہچاننے میں مجھ سے غلطی بارہا ہوئی ہے۔ مگر جب پہچان گیا تو اس حدیث کو یاد رکھتا ہوں کہ ''مومن ایک سوراخ سے دو دفعہ نہیں کاٹا جاتا'' میں کام کرنا جانتا ہوں، دوسروں سے کام لینا زیادہ نہیں آتا۔ اشخاص سے زیادہ اصولوں سے دلچسپی ہے۔ مدح اور قدح دونوں میں میرے کچھ آداب ہیں۔ میں بعض لوگوں سے کچھ زیادہ ہی توقعات وابستہ کر لیتا ہوں اور جب وہ پوری نہیں ہوتیں، تو اُن سے کچھ دور ہو جاتا ہوں، اس طرح گہرے اور اٹل تعلقات جن پر نشیب و فراز کا اثر نہ ہو، میرے کم ہی لوگوں سے رہے ہیں۔ مجھے نوجوانوں سے، نئے خیالات سے ہمدردی ہے۔ مگر بعض اوقات ان نوجوانوں کی بے راہ روی اور ان خیالات کی تندی اور قطعیت سے الجھن ہوتی ہے۔ ہماری تہذیب میں انکسار کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ آج اشتہاریت کا دور ہے۔ جسے دیکھو اپنا ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے یا کسی کی قصیدہ خوانی میں ہر وقت مصروف ہے اور اس قصیدہ خوانی کے پیچھے کوئی ذاتی مقصد یا وقتی مصلحت ہے۔ آج اشتہار شہرت، مقبولیت دولت سب کچھ عطا کرتے ہیں اور معیار بھی بنانے لگے ہیں۔ میں ہر پرانی چیز کو سونا نہیں سمجھتا، لیکن اپنی تہذیب کی صالح روایات کی قدر کرتا ہوں ہاں شاہراہوں کے بجائے پگڈنڈیوں پر چلنا مجھے زیادہ اچھا لگتا ہے میرا ایک شعر ہے:

شاہراہوں سے گزرتے ہیں شب و روز ہجوم
نئی راہیں ہیں فقط چند جیالوں کے لیے

ہم لوگ اپنے آپ کو شاید کچھ زیادہ ہی اہمیت دیتے ہیں۔ کائنات کی وسعتوں اور پہنائیوں میں انسان گرد کے ایک ذرّے سے بھی کم حیثیت رکھتا ہے۔ مگر ذرّہ جو اپنے اندر ایک سورج رکھتا ہے اور دوسروں کے اندر بھی کوئی سورج اگا سکتا ہے۔ اس کی آب و تاب کچھ کہتی تو ہے۔'' [1]

انھوں نے اپنی خودنوشت کا نام ''خواب باقی ہیں'' رکھا ہے۔ اس کی وجہ تلاش کی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ خواب کے ذریعہ ہی انسان کائنات کی وسعت و معنویت سے روشناس ہوتا ہے اور اس کے خواب کبھی پورے نہیں ہوتے۔ انھوں نے ییٹس کے حوالے سے لکھا ہے:

''ییٹس نے سرکس کے جانوروں کا فرار میں کہا ہے:

"Players and painted stage took all my love and not those that they were emblems of."

''کھلاڑیوں اور رنگ منچ نے (ہی) میرا سارا پیار سمیٹ لیا اور وہ چیزیں رہ گئیں جن کی یہ علامتیں تھیں۔''

میرے خیال میں یہ ییٹس کا ہی نہیں بہت سے شاعروں اور ادیبوں کا مقدر ہے۔ شاعر اور ادیب خواب دیکھتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے حقائق کی توسیع کر سکے۔ ان خوابوں کے ذریعے سے وہ کائنات کی وسعت میں اپنی معنویت، اس کی پہنائی میں اپنی لہر، اس کے آفاق میں اپنا سورنفس دیکھتا اور پاتا ہے مگر یہ بھی اکثر ہوتا ہے کہ وہ نقاب کی رنگینی میں، منظر کے سحر میں، بساط کے نقش و نگار میں محو ہو جاتا ہے اور نقاب کے پیچھے، منظر کے باطن میں، بساط کے تانے بانے میں جو کچھ ہے اس سے اس کی توجہ ہٹ جاتی ہے۔ یہ کھیل، سرگرمی، لگن، لگاؤ کس لیے ہے۔ یہ سوچنے کے بجائے محض جلوؤں، کرنوں، رنگوں، کرشموں میں الجھ جاتا ہے۔ نیتشے نے نہ جانے کس عالم میں کہا تھا کہ انسان ایک ایسی ٹیڑھی لکڑی ہے جس سے کوئی سیدھی چیز نہیں بنائی جا سکتی۔ یہ تو خیر ایک بیمار خیال ہے مگر اتنی بات ضرور سچ ہے کہ زندگی بڑی پیچیدہ ہے۔'' [2]

---

[1] خواب باقی ہیں: آل احمد سرور، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۹۱، ص، ۳۵۹-۳۵۸

[2] خواب باقی ہیں: آل احمد سرور، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۹۱، ص، ۳۵۹

جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے بہت سے خواب باقی ہیں۔ سرور صاحب کی اس خودنوشت سے علی گڑھ، لکھنؤ اور رام پور کے تمام حالات کا علم ہوتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان تحریکات سے بھی آشنائی ہوتی ہے جو اردو میں پروان چڑھ رہی تھیں اور جن سے آل احمد سرور وابستہ رہے ہیں۔ آل احمد سرور ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کی تحریک سے وابستہ رہے ہیں اور انھوں نے بہت سی تحریکوں کا غائر مطالعہ بھی کیا ہے۔ کسی تحریک سے وابستگی یا اس سے انحراف کے پیچھے جو اسباب وعوامل رہے ہیں، ان کا بھی حال لکھا ہے، اس طرح خواب باقی ہیں سے آل احمد سرور کی متضاد ذہنی لہروں کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے، انھوں نے ادب اور تنقید کے میدان میں جو تبدیلیاں دیکھی ہیں ان سب کا بیان بھی اپنی خودنوشت میں کیا ہے۔ خودنوشت خودنمائی کا ایک ذریعہ ہوتی ہے اور آل احمد سرور بھی اپنی اس خودنوشت میں اس کے شکار ہوئے ہیں مگر مجموعی طور پر یہ ان کے علمی وادبی سفر کی مکمل روداد ہے یہ اور بات ہے کہ انھوں نے بعض اشخاص کا عمداً ذکر چھوڑ دیا ہے یا جن سے ان کی ذہنی ہم آہنگی نہیں رہی، ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔

خودنوشت کا یہ پہلو آل احمد سرور کی شخصیت پر یا ان کی دیانت داری پر سوالیہ نشان بھی قائم کرتا ہے مگر ممکن ہے کہ آل احمد سرور نے ایسے اشخاص کے ذکر سے اس لیے بھی گریز کیا ہو کہ کہیں اس کی وجہ سے بیان میں کچھ اور تلخی نہ شامل ہو جائے اور رائی کا پہاڑ بن جائے۔

خواب باقی ہیں ان کی زندگی کی چھ دہائیوں پر محیط روداد ہے۔ اور اس روداد میں مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسی شخصیتیں بھی شامل ہیں، جن کا ذکر انھوں نے والہانہ عقیدت کے ساتھ کیا ہے۔ بہر حال ادبی دنیا میں ''خواب باقی ہیں'' کی اشاعت کے ساتھ ہی ایک ہلچل سی مچ گئی اور ردوقدح اور مدح وتوصیف کا سلسلہ بھی دراز ہوا، یہ خودنوشت کے لیے بہت بڑی بات ہے کہ اس کی وجہ سے بحث کے دروازے کھلیں اور نئے حقائق سامنے آئیں اگر یہ صرف ان کی ذات پر مرکوز ہوتی، تو شاید یہ بحث اور مباحثے کی نوبت نہ آتی۔ مگر چونکہ اس میں بہت سے ان تنقیدی مباحث اور مسائل کا بھی ذکر ہے اور اہم ادبی شخصیات کا بھی، اس کی وجہ سے ادبی دنیا میں ہنگامہ بپا ہونا ایک فطری امر ہے۔ آل احمد سرور صاحب نے اعتراف کے عنوان سے پیش لفظ میں لکھا ہے:

''چونکہ یہ میری داستان ہے اس لیے اگر اسٹیج پر روشنی میرے اوپر زیادہ ہے، تو اس صنف کی مجبوری ہے۔ مجھے جہاں کچھ کرنے کا احساس ہے وہاں بہت کچھ نہ کر سکنے کا بھی۔ ہوسکتا ہے کہ بقول حسرت یہ ''شوق کی بلندی اور ہمتوں کی پستی'' والی بات ہو۔ میں نہ تو اپنا قصیدہ پڑھنے کا قائل ہوں نہ بے جا انکساری کا۔ جس طرح وقت گزرا، جو سوچا، جو کیا، جو کیا، جو نہ کیا، جس طرح بکھرا اور سمٹا، ٹوٹا اور جڑا جو پایا اور کھویا، اس کی جھلک تو بہر حال ان صفحات میں مل جائے گی۔ [1]

اس اعتراف کی روشنی میں دیکھا جائے تو آل احمد سرور اپنی اس خودنوشت میں اپنی بات سے قدرے منحرف نظر آتے ہیں۔ بہر حال عمر کے ساتھ ساتھ ذہن اور حافظے پر بھی زوال کے اثرات نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ خودنوشت ایک اہم اضافہ ہی نہیں بلکہ ایک ایسی خودنوشت ہے جس سے ہماری تاریخ اور تہذیب کے بہت سے ابواب روشن ہوتے ہیں، بالخصوص ایسے ابواب جو کسی تاریخ یا تذکرے میں محفوظ نہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور اپنی تحریروں میں زبان و بیان کی نزاکت، لطافت اور شیرینی پر خاص توجہ دیتے ہیں۔ مرصع اور مسجع نثر کا اہتمام کرتے ہیں، لیکن ''خواب باقی ہیں'' میں زبان و بیان کی وہ دلآویزی نہیں ہے جو ان کی دوسری تحریروں میں عام طور پر ملتی ہے۔ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد اپنی خودنوشت کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''اس خودنوشت کو لکھنے کا خیال میرے دل میں اس وقت پیدا ہوا جب میں آل احمد سرور کی کتاب ''خواب باقی ہیں'' کا مطالعہ کیا۔ سرور صاحب کی انشا پردازی کا میں قتیل اور ان کی تقریروں کا پسند کرنے والا رہا ہوں۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ یہ کتاب مجھے ویسی نہ لگی جس کی توقع میں نے سرور صاحب سے کر رکھی تھی۔ اسلوب نگارش کے وہ چمک دار جملے، نثر کیے گئے مصرعوں کی وہ رمق جو ہمیشہ ان کی تحریروں کا شیوہ رہے ہیں اس میں مجھے کم ملے مگر اس کے باوجود مجھے تحریک ان کی ہی کتاب کو پڑھ کر ملی۔ اور میں نے اس کتاب کا آغاز کر دیا۔'' [2]

---

[1] خواب باقی ہیں: آل احمد سرور، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۱، ص ۶

[2] رقص شرر، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، رہبر آفسیٹ پرنٹرز، ترکمان گیٹ، دہلی، ۲۰۰۴، ص ۸

''خواب باقی ہیں'' پر معترضین کا اعتراض ہے کہ اس میں سرور صاحب نے درون خانہ، خاندان رشتہ دار اور اعزہ واقربا کا ذکر اس تفصیل سے نہیں کیا ہے جس تفصیل اور شرح وبسط کے ساتھ خودنوشت میں کیا جاتا ہے۔اس کے برعکس اپنی حصولیابی، کامرانی، فتوحات، علمی وادبی کارناموں کا بیان قدرے تفصیل سے کیا ہے۔صفحات کے صفحات علمی برتری اور عظموں کے بیان سے پر ہیں۔کہیں کہیں اس تفصیل کی وجہ سے قاری کو تعلّی اور خودستائی کا گمان بھی ہونے لگتا ہے۔

خودنوشت کے دوسرے ایڈیشن میں سرور صاحب نے تقریباً ۲۵ صفحات کے اضافے کیے ہیں۔ کیونکہ خودنوشت کی پہلی اشاعت کے بعد سرور صاحب تقریباً ۱۰ سال حیات سے رہے۔اس دوران ان کی زندگی میں دو بڑے المناک حادثے رونما ہوئے، جس کی وجہ سے آل احمد سرور بجھ سے گئے۔ایک تو ان پر فالج کا حملہ ہوا جس کی وجہ سے وہ تاحین حیات صاحب فراش رہے۔دوسرا جوان بیٹے کی موت۔ان دونوں واقعے نے انھیں جیتے جی مردہ کر دیا۔ایک باپ کے لیے اس سے بڑا غم اور کیا ہوسکتا ہے کہ باپ کی حیات میں بیٹے کا انتقال ہوجائے۔بہت سے باپ یہ جاں گسل دن دیکھنے سے قبل ہی موت کی تمنا کرتے ہیں۔سرور صاحب جوان بیٹے کی ناگہانی موت سے کانچ کی طرح ٹوٹ کر بکھر گئے۔خودنوشت کے اس حصے میں انھوں نے اس دردوکرب کا بیان بھی اسی احساسِ دردمندی کے ساتھ کیا ہے جسے پڑھ کر سنگ دل انسان بھی ریزہ ریزہ ہوجاتا ہے۔خودنوشت کے اس حصے کو ''باب الحزن'' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس حصے کا ایک ایک لفظ درد وغم میں ڈوبا ہوا ہے۔

گفتنی ناگفتنی: وامق جونپوری (۱۹۹۳)

احمد مجتبیٰ صدیقی وامق جونپوری کا شمار ترقی پسند تحریک کے نمائندہ شعرا میں ہوتا ہے۔ترقی پسند نظریے کی تبلیغ وتوسیع کا فریضہ آپ اپنی شاعری کی توسط سے تاحین حیات انجام دیتے رہے۔آپ کی شاعری عصری حسیت اور زمینی حقائق کی ترجمان ہے، زندگی کی تلخ حقیقتوں کی غمازی آپ کا طرۂ امتیاز ہے۔بھوکا بنگال، مینا بازار اور جاڑے کی چاندنی، نیلام پرچم اور فن، آپ کی مشہور نظمیں ہیں۔گفتنی ناگفتنی آپ کی نثری تصنیف

ہے جو آپ کی خودنوشت بھی ہے۔ یہ خودنوشت ۱۴/ابواب اور ۴۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ۱۹۹۳ میں لبرٹی پریس نئی دہلی سے شائع ہوئی۔

پیدائش کی تاریخ، طفلی کے واقعات، تعلیم کی شروعات گھر خاندان، حسب ونسب کا بیان خودنوشت کے پہلے باب میں ہے۔ دوسرے باب میں ان کے آبائی وطن (کج گاؤں) ضلع جونپور کے تاریخی احوال کے ساتھ وہاں کے علمی ماحول اور ادبی شخصیتوں کا تذکرہ ہے۔ وہاں کے علم دوست حضرات اور ادب نواز شخصیتوں میں حاجی محمد حسن، مولوی محمد مجتبیٰ اور حفیظ جونپوری کا ذکر وامق جونپوری والہانہ لگاؤ اور عقیدت کے ساتھ کرتے ہیں۔ خودنوشت کے ذریعے جونپور کی تاریخی اہمیت کا پتہ چلتا ہے، چونکہ وہاں کی تاریخی عمارتوں، عالی شان مسجدوں اور شاہوں کے قلعوں سے مسلمانوں کی روشن تاریخ وابستہ ہے۔ ایک زمانے میں جونپور علمائے اسلام اور مفتیان دین کا گڑھ تھا۔ عصر کی نماز کے بعد علما ومشائخ پالکی پر سوار ہوکر چہل قدمی کے لیے جایا کرتے تھے۔

ڈاکٹر جعفر عسکری اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''یہ کتاب ایسا تخلیقی مرقع ہے جس میں خودنوشت سوانح نگاری کی روایت کے مطابق شجرۂ نسب سے لے کر خاندانی حالات ووطن عزیز سے گہری عقیدت مندی کے تفصیلی تذکرے کے علاوہ پیشہ ورانہ زندگی، ہندوستان کی جنگ آزادی، دوسری عالمی جنگ، ملک کی تہذیبی، سماجی، سیاسی، علمی اور ادبی صورت حال، متعدد مقامات، واقعات، حادثات، تجربات اور شخصیات کا تنقیدی اور عالمانہ جائزہ پیش کیا ہے۔ اس سوانحی تصنیف کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ یہ صرف خارجی زندگی کا احاطہ نہیں کرتی بلکہ خود مصنف کی نفسیاتی کیفیت، جبلی خصائل اور موروثی خصوصیت کو بے نقاب کرتی ہے... وامق کی ذاتی پسند وناپسند، فکری بصیرت، رفعت، شاعرانہ مذاق ومزاج کے علاوہ متعدد رازہائے سربستہ پر سے بھی یہ کتاب پردے اٹھاتی ہے۔''[1]

خودنوشت کا تیسرا باب بچپن سے تعلیم کے اختتام تک کی چند یادوں پر مشتمل ہے۔ جس میں مصنف

---

[1] مضمون جعفر حسن عسکر، رسالہ نیا دور، لکھنؤ، جون ۱۹۹۹، ص ۳۰

نے بچپن کی یادوں کے ساتھ والدین کا ذکر، گریجویشن اور ایل ایل بی تک کے تعلیمی سفر کی روداد بیان کی ہے۔

خودنوشت کے دیباچے میں وامق جونپوری نے اپنی کمزوریوں کا اعتراف خوبصورت انداز میں کیا ہے:

''(۱) بنیادی طور پر میں ایک صلح پسند اور کاہل آدمی ہوں۔ مگر امتدادِ زمانہ نے اضطراری سے زیادہ حساس اور بددماغی کی حد تک تنک مزاج بنادیا ہے، جن وجوہ سے دشمن بنالینے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔

(۲) مجھ میں بڑا عیب یہ ہے کہ کبھی کبھی بلاسوچے سمجھے ایسی بات کہہ جاتا ہوں جو نہ کہنی چاہیے اور بعد میں اس حماقت کا ازالہ امکان کے باہر ہوجاتا ہے۔''

(۳) غیبت کرنے اور غیبت سننے میں مجھ کو بے حد لطف آتا ہے۔ البتہ اس کے پیچھے کسی کی تضحیک یا تشہیر کا مقصد نہیں ہوتا، محض وقت گزاری، لطف صحبت، ہنسنے ہنسانے اور کھانا ہضم کرنے کے مطلب سے ہوتی ہے۔'' [۱]

گفتنی ناگفتنی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خودنوشت کے نصف سے زائد صفحات موصوف کی شعری محفلوں کے بیان سے پر ہیں اسی وجہ سے کبھی کبھی خودنوشت کے مطالعے سے الجھن ہونے لگتی ہے اور یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ خودنوشت نہیں مشاعرے کی رپورٹ پڑھ رہے ہوں۔ خودنوشت کے دیباچے میں وامق جونپوری خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ:

''اس میں مشاعروں کی شرکت کا ذکر ضرورت سے زیادہ ہے۔'' [۲]

مشاعروں کے بیان اور شعرا کے ذکر ادبی وشعری محفلوں کے بیان کی تفصیل کی وجہ سے یہ خودنوشت ادبی ڈائریکٹری معلوم ہوتی ہے۔ بہت سے ترقی پسند ادیبوں وشاعروں کے ذکر میں وہ خاصے جذباتی نظر آتے ہیں۔ مثلاً سجاد ظہیر، رشید جہاں، مجاز، جاں نثار اختر، آل احمد سرور، ڈاکٹر محمد حسن، کیفی اعظمی، پطرس بخاری، باقر مہدی، آغا زیدی، سلام مچھلی شہری، مجروح سلطان پوری، معین احسن جذبی، مجنوں گورکھپوری، علی

[۱] گفتنی ناگفتنی، وامق جونپوری، لبرٹی آرٹ پریس، نئی دہلی، ۱۹۹۳، دیباچہ، ص ۵

[۲] گفتنی ناگفتنی، وامق جونپوری، لبرٹی آرٹ پریس، نئی دہلی، ۱۹۹۳، دیباچہ، ص ۶

سردار جعفری اور احتشام حسین کا ذکر اس میں ملتا ہے۔

وامق جونپوری نے خودنوشت میں وطن مالوف کچ گاؤں (جونپور) فیض آباد، دہلی، گڑھ، کلکتہ، بنارس، الہ آباد، بارہ بنکی، جالندھر، بھوپال، امراوتی، کشمیر، ممبئی، حیدرآباد، لکھنؤ، اعظم گڑھ، روس، عراق، ایران کا بھی ذکر اس میں کیا ہے۔ اس کتاب میں سفرنامے کا عکس بھی شامل ہے۔ ممبئی سے بصرہ روانگی کے وقت انھوں نے آم کی ایک ٹوکری خریدی جو بصرہ پہنچنے سے قبل ہی خراب ہو گئے۔ لکھتے ہیں:

> ''جب ہم نے بصرہ کی سرزمین میں قدم رکھا تو ان سڑے ہوئے آموں کی ٹوکری کو پھینکنے کے لیے میں مناسب گوشہ تلاش کرنے لگا۔ ابھی وہ ٹوکری میرے ہاتھوں میں تھی کہ چند عراقیوں نے شکریے کے ساتھ ان سڑے ہوئے آموں کی ٹوکری کو میرے ہاتھوں سے لے لیا اور ''انبہ انبہ'' کہہ کر کل سڑے آم کھا گئے۔''[1]

بلاشبہ زبان و بیان کی چاشنی اور رواں دواں اسلوب ادیبوں، شاعروں کے تذکرہ، شعری و ادبی مجالس کے بیان کی وجہ سے یہ خودنوشت علمی و ادبی حلقوں میں تادیر یاد رکھی جائے گی اور ذوق و شوق سے پڑھی جائے گی۔

گردِ راہ: اختر حسین رائے پوری (۱۹۹۳)

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری علی گڑھ کے فیض یافتہ تھے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی اور پروفیسر حبیب جیسے اساتذہ انھیں میسر آئے تھے۔ ان کے حلقہ احباب میں حیات اللہ انصاری، سبط حسن، انتظار ملیح آبادی اور اسرار الحق مجاز جیسی اہم شخصیتیں تھیں۔

''گردِ راہ'' ان کی خودنوشت ہے جس میں انھوں نے اپنی زندگی اور اپنے اسفار کا بیان بہت ہی خوبصورت انداز میں کیا ہے، گویا یہ ان کی حکایت ہستی ہے۔ جسے انھوں نے ادب اور زبان کے حوالے سے پیش کر دیا ہے۔ ان کے فکری نظام کی تشکیل میں جس ماحول کا کردار اہم رہا ہے اس کی بھی تفصیل انھوں نے

[1] گفتنی ناگفتنی، وامق جونپوری، لبرٹی آرٹ پریس، نئی دہلی، ۱۹۹۳، ص ۱۲۱

اس کتاب میں بیان کردی ہے۔ یہ صرف ان کی خودنوشت نہیں بلکہ ادب کی تاریخ بھی ہے۔ خاص طور پر اشتراکی ادب کی تاریخ ـــــ اس خودنوشت کے ذریعے ادب کے ماضی اور حال سے بھی آشنائی ہوتی ہے اور ادب کی بہت سی تحریکات اور نظریات سے آگہی بھی۔

بنیادی طور پر وہ افسانہ نگار تھے اور ''زبان بے زبانی'' مطبوعہ نگار (۱۹۳۳) ان کی ادبی شہرت کا نقطہ آغاز ہے۔ انھوں نے اپنی اس خودنوشت میں ''گفتنی اور ناگفتنی'' کی تمیز کے بغیر جو چیزیں ان کے ذہن میں آئیں اور لوح حافظہ پر جو یادیں روشن ہوتی گئیں انھیں قرطاس کے حوالے کردیا۔ انھوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی سال کے حوالے سے لکھا کہ جب میں نے اپنے حافظے کے جادو گھر میں جھانکا تو زندگی کے اوّلین سال کچھ خنداں، کچھ گریاں اور کچھ حیران نظر آئیہ ابتدائی سال کے تعلق سے بیان ہے۔ مگر دیکھا جائے تو پوری زندگی کچھ اسی کیفیت سے دوچار نظر آتی ہے، گوکہ ان کا تعلق رائے پور سے تھا، جو بھلائی اسٹیل کی وجہ سے صنعت وتجارت کا ایک مرکز ہے۔ جب ۱۲ جون ۱۹۱۲ کو ان کا جنم ہوا تھا تو وہاں بجلی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ ان کے والد کا تعلق پٹنہ کے ایک پرانے خاندان سے تھا اور وہ علی گڑھ کے فارغ التحصیل تھے۔ رائے پور میں محکمہ آب پاشی کے ایک اچھے عہدے پر فائز تھے اس لیے وہیں شادی کرلی۔ اختر حسن رائے پوری کی والدہ ممتاز النساء انگریزی اردو ہندی پر کامل عبور رکھتی تھیں اور ان کے مضامین ''تہذیب نسواں'' اور ''زیب النساء'' نامی رسالوں میں چھپتے تھے۔ انھوں نے اپنے ماضی کی یادوں کو کریدتے ہوئے اپنے خاندانی کوائف بھی بہت دلچسپ پیرائے میں تحریر کیے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''ہمارا آبائی مکان پٹنہ کے باہر بیگم پور اسٹیشن کے پاس تھا۔ یہ پرانی وضع کا دومنزلہ مکان ٹیلے پر بنا ہوا تھا اور اس کے بازو سے ایک ندی بہتی ہوئی دریائے گنگا سے جاملتی تھی جو چند میل کے فاصلے پر ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ ندی کی دوسری طرف آم کے باغوں کا سلسلہ دراز تھا جن میں کچھ ہمارے بھی تھے اور مکان کے سامنے دھان کے کھیت جن میں جگہ جگہ تاڑ کے پیڑ کھڑے ہوئے تھے۔ مکان میں ہماری دادی، ملازمہ کے ساتھ رہتی تھیں اور پورن نامی نوکر زمین و باغ کی دیکھ بھال پر مامور تھا۔ پچھواڑے ایک کشتی بندھی رہتی تھی اور ہم دادی کی آنکھ بچا کر دن میں ایک دو بار پورن کے ساتھ اس

پرندی کی سیر کے لیے ضرور نکل جاتے تھے۔غرض یہ فضا بڑی دلکش تھی۔اتنے میں برسات کا موسم اس طرح آیا کہ جل تھل ایک ہوگیا۔لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ گنگا میں سیلاب آنے والا ہے اور پاس پڑوس میں تیزی سے رسد اور ایندھن وغیرہ کی تلاش ہونے لگی۔رات کو اوپر کے کمرے میں سوتے اندھیرے میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی مہیب جانور رینگتا ہوا میری طرف آرہا ہے۔صبح آنکھ کھول کر دریچے سے باہر جھانکا تو گنگا کا پانی ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔گویا ایک ناپیدا کنار ردائے آب نے زمین کو ڈھک لیا ہو، کیونکہ ہمارا مکان اونچائی پر تھا، پانی اس میں داخل نہ ہوسکا، البتہ کئی گھروں میں پانی درّاتا ہوا گھس آیا۔لگ بھگ دو مہینے زندگی کا طور یہ ہوگیا کہ ہر گھر کی شکل جزیرے کی سی ہوگئی اور آمدورفت کے لیے سب نے اپنی اپنی کشتی کا سہارا لیا۔حتیٰ کہ دکان داروں نے کشتیوں پر سامان سجایا اور دَر دَر جا کر اپنی اپنی بولی بولنے لگے۔بچوں کے لیے اس سے زیادہ دلچسپ تماشا کیا ہوسکتا تھا، لیکن میرا دل دیوان خانے میں زیادہ لگتا تھا جہاں والد اپنے دوستوں کے ساتھ دن بھر یا تو شطرنج کے کھیل میں مصروف ہوتے یا اوّل جنگ عظیم کے واقعات پر بحث کرتے رہتے جو اس وقت ۱۹۱۷-۱۹۱۶ جاری تھی۔صدور نامی شاگرد پیشہ کبھی سیخوں پر کباب چڑھاتا، کبھی کٹھل کے بیج بھونتا اور کبھی سماوار سے پیالیوں میں چائے انڈیل کر اہل محفل کی نذر کرتا۔''[1]

اختر حسین رائے پوری کی ذہنی وفکری تشکیل میں علی گڑھ کا بہت اہم رول رہا ہے اور وہاں جا کر ان کے علم وادب کو نئی سمتیں ملیں۔گو کہ انھیں علی گڑھ کی فضا میں جمود کی کیفیت نظر آئی مگر ان کے اندر بے پناہ تحرک اور اضطراب تھا، اس لیے اپنا ایک حلقہ قائم کیا اور وہاں ''پیام'' کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار بھی نکالا۔وہاں بہت سے ذہین طلبا ملے جن کی معیت میں انھوں نے نئی راہوں کا تعین کیا۔علی گڑھ کے زمانۂ طالب علمی میں وہاں بہت سی ممتاز شخصیتیں تھیں ان کے تعلق سے انھوں نے لکھا ہے:

''علی گڑھ کے دورانِ قیام میں جن استادوں کی شخصیت کا مجھ پر دیرپا اثر ہوا وہ پروفیسر محمد حبیب اور پروفیسر رشید احمد صدیقی تھے۔ایک نے مجھے تاریخ اور دوسرے نے کلاسیکی اردو ادب کا صحیح ذوق عطا

[1] گردِ راہ، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، المسلم پبلشرز، کراچی، ۱۹۹۳، ص ۳۶-۳۵

کیااور دونوں نے میری شوریدہ سری کی ایسے حسن سلوک سے اصلاح کی کہ مجھے خبر بھی نہ ہوئی۔

پروفیسر حبیب اس نسل کے نمائندہ تھے جس نے مشرقی اور مغربی تہذیبوں کی بہترین صفات کو سمویا تھا۔اس سنگم کا تال میل میں نے سر عبدالقادر، ڈاکٹر سیّد حسین، ڈاکٹر کچلو، ڈاکٹر تاراچند وغیرہ میں بعد میں دیکھا۔ وضع داری اور رواداری اس کے خاص عنصر تھے اور روشن دماغی، نیز اختلاف رائے کی آزادی کی اس میں گنجائش تھی۔مورخ کی توجہ عہد مغلیہ سے پہلے کی دہلی کی سلطنت کی طرف مبذول کرنے کا سہرا حبیب صاحب کے سر بندھتا ہے۔انھیں کے ایما پر علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ نے اس فراموش شدہ دور پر تحقیق کا جو باقاعدہ کام شروع کیا وہ سلسلہ تا ایں دم جاری ہے۔ عہد وسطیٰ پر Dawson and Elliot کی جامع تاریخ کے نئے ایڈیشن پر پروفیسر حبیب کا مبسوط مقدمہ ان کا شاہکار ہے اور اس میں جدید تاریخ نویسی کا وہ انداز نظر آتا ہے جس کا مدار بادشاہوں اور امیروں پر نہیں بلکہ عوام کی زندگی پر ہے۔

علی گڑھ کے دورانِ قیام میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کا شاگرد رشید ہونے پر مجھے فخر رہا۔وہ ایسے مہمان نواز تھے کہ باہر سے آنے والے مسلمان دانشور اور شاعر انھیں کے گھر ٹھہرتے تھے۔ایسے موقعوں پر صدیقی صاحب مجھے ضرور بلا بھیجتے تھے۔میں اشتراکیت کا مدعی تو تھا ہی۔فی الحال بقول ابوالفضل ''چندے برائے سیر باغ الحاد رقیم، چنانچہ میں کسی کے رعب میں نہ آتا تھا اور صدیقی صاحب کے مہمانانِ گرامی سے گفت وشنید میں مجھے کوئی جھجک نہ ہوتی تھی۔وہ بھی میری باتوں سے محظوظ ہوتے تھے کہ یہ آواز نئی تھی۔ پہلے تو میں مارکسی نظریے کے زیر اثر الحاد کو اشتراکیت کا جزو لاینفک سمجھتا رہا۔ لیکن بعد ازاں ظاہر ہوا کہ اس میں کلیہ کی رجعت پروری کو مذہب پر محمول کر دیا گیا ہے، علاوہ بریں اسلام کے دورِ اوّل کی انقلابی روایتوں سے مارکس ناواقف تھا اور انیسویں صدی کے میکانکی سائنس نے اسے ان قدروں اور حقیقتوں سے بیگانہ رکھا جس سے جدید علم آگاہ ہوا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت میں ذہانت، شرافت اور خودگزاری کا بے نظیر امتزاج تھا۔ان کے عزم وانکسار میں بے پناہ کشش تھی۔ میں نے صرف مولانا ابوالکلام آزاد اور مولوی عبدالحق کو ان سے

احتیاط برتتے دیکھا۔ جامعہ ملیہ کے مردہ جسم میں انھوں نے جس طرح نئی جان ڈالی اور تقسیم ہند کے وقت علی گڑھ یونیورسٹی کی حفاظت میں وہ جس طرح سینہ سپر ہوئے یہ ہماری تعلیمی تاریخ کے اہم واقعات ہیں۔ علی گڑھ میں مجھ پر جوان کا التفات شروع ہوا وہ تب تک باقی رہا جب وہ حکومت ہند کے نائب صدر تھے۔ دہلی ہو یا پیرس، بارہا بے تکلف میرے غریب خانے پر آئے اور میری روحانی بے قراری کی تسکین فرماتے رہے۔''[1]

مجاز تو خیران کے دوست تھے ان کی شاعری اور شخصیت کے حوالے سے اختر حسین رائے پوری نے اشارتاً جو باتیں لکھی ہیں وہ مجاز کو سمجھنے میں معاون ہوسکتی ہیں۔ مجاز کی شاعری اور بادہ کشی کے آغاز کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''جب مجاز نے اپنا تعارف مولانا احسن مارہروی کے شاگرد کی حیثیت سے کرایا اور دو تین فرسودہ سی غزلیں سنائیں تو میں نے بلا تکلف اپنی بیزاری کا اظہار کیا۔ میں نے زبان و بیان پر نکتہ چینی کی بے جا کوشش نہیں کی۔ بلکہ یہ کہا کہ اگر شاعر میں انسانی مسائل کو سمجھنے سمجھانے کا سلیقہ نہیں تو اسے انسانوں کو مخاطب کرنے کا حق نہیں۔ اس زمانے کے لحاظ سے یہ لہجہ نیا تھا۔ مجاز اس تقریر کو سن کر بہت چونکے اور ان کی حیران کن آنکھوں میں فکر و فہم کی جو کیفیت ظاہر ہوئی، وہ اب تک مجھے یاد ہے۔ پھر وہ مجھ سے ملنے اکثر آفتاب ہوسٹل آنے لگے۔

ہم دونوں شام کو ٹہلنے کے لیے کبھی پرانے قلعے اور کبھی ریلوے اسٹیشن کی طرف نکل جاتے تھے۔ اور میں انھیں اپنے مبلغ علم سے (جو مختصر ہونے کے باوجود ان کے لیے قابل توجہ تھا) آگاہ کرتا رہتا تھا۔ اس گفت و شنید کو سال بھر کا عرصہ گزر چکا اور اب مجاز نے پرانے انداز کی غزل سرائی ترک کردی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ان کی تخلیقی صلاحیت ایک نیا راستہ تلاش کر رہی ہے۔ میرا تخلیقی شعور بھی اسی زمانے میں اردو ادب کی طرف مائل ہوگیا تھا اور میرا پہلا افسانہ ''زبانِ بے زبانی'' کے نام سے رسالہ ''نگار'' میں شائع ہو کر اہل نظر کی تحسین حاصل کر چکا تھا۔

---

[1] گردِ راہ، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، المسلم پبلشرز، کراچی، ۱۹۹۳ء، ص ۷۷-۷۶

FHBS

ایک بار دونوں وقت ملے جب ہم اسٹیشن پہنچے، تو ریل گاڑی کے تیسرے درجے کے ایک ڈبے کے آگے ٹھٹک کر رہ گئے۔ اس میں ایک نوخیز گوجر حسینہ گلے میں چاندی کا کنٹھا اور کان میں پیتل کا بالا ڈالے پھٹے حالوں اس آن بان سے فروکش تھی کہ تماش بین محو حیرت اور خوانچہ والے دم بخود تھے۔ ریل چلتے وقت اس نے نگاہِ غلط انداز سے ہمیں خدا حافظ کہا اور ہم اس پر درود وسلام بھیجتے ہوئے واپس چل پڑے۔ میں نے کہا کہ مجاز اسے کہتے ہیں گدڑی کا لعل تم اس پر ایک نظم لکھ ڈالو۔ وہ کہنے لگے کہ میں نے اب تک نظم نہیں لکھی، لیکن کوشش کروں گا۔

چند ہفتے بعد انھوں نے مجھے ''رات اور ریل'' کا مسودہ دکھایا جو اس نظارے کا مظہر تو نہیں لیکن اس سے متاثر ضرور تھا۔ صحیح معنوں میں مجاز کی شاعری کا آغاز اس طرح ہوا۔'' [1]

اختر حسین رائے پوری نے بہت سے ملکوں کا سفر کیا اور وہاں سے تجربوں کی روشنیاں لے کر لوٹے۔ ان کی فہم وفراست کے نئے در کھلے، اور دنیا کو ایک الگ نظر سے دیکھا۔ انھوں نے اسپین کا بھی دورہ کیا امریکہ بھی گئے، جاپان کی دل آویزی بھی دیکھی۔ فلسطین بھی گئے اور ہر ایک شہر سے کچھ نہ کچھ ایسا اکتساب کیا جس سے ملک یا قوم کو فائدہ پہنچے۔ انھوں نے ان ملکوں کے ثقافتی تمدنی اور سیاسی احوال بھی لکھے۔ پیرس کے حوالے سے ایک جگہ لکھا ہے:

''پیرس کو ''شہر روشن'' کہا گیا ہے۔ اس کے چراغاں کا لطف اٹھانا ہو تو کسی بلندی سے مثلاً آئفل ٹاور سے دیکھو تو شب برات یا دیوالی کا سماں نظر آتا ہے۔ یہ روشنی کا ایک پہلو ہے۔ لیکن اس نور کی کیفیت جدا ہے جس کی ضیا پاشی صدیوں سے علم وفن اور انسانی آزادی کی روایتوں نے کی ہے۔ عہد قدیم میں جو حیثیت روم کی تھی، اور عہد وسطیٰ میں بغداد کی، وہی عہد جدید میں پیرس کی تھی۔ یہ شہر صرف بڑی سلطنتوں کے مرکز ہی نہیں تھے، بلکہ عالمگیر تہذیبوں کے محور بھی تھے۔ تہذیبوں کو جاگیردار بورژوا اور پرولتاری کے کنٹوپ نہیں اڑھائے جا سکتے۔ ان کا جوہر انقلاب زمانہ کے بعد بچ رہتا ہے وہ انسانیت کے سیہ خانے کو اُجالتا اور آگے کا راستہ سجھاتا ہے۔'' [2]

---

[1] گردِ راہ، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، المسلم پبلشرز، کراچی، ۱۹۹۳، ص ۷۴-۷۳

[2] گردِ راہ، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، المسلم پبلشرز، کراچی، ۱۹۹۳، ص ۱۳۹

اسی طرح اٹلی کے حوالے سے انھوں نے بہت ہی دلچسپ انداز میں لکھا ہے اور وہاں کی تاریخ وفن کے نقوش کو اجاگر کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ مغرب کے ماضی اور حال کو جاننے کے لیے صرف ایک ملک کافی ہے اور وہ اٹلی ہے کیونکہ یہ ملک سلطنت روما کا مرکز اور عیسائی مذہب کا گہوارہ ہے۔ یہیں سے نشاۃ الثانیہ کی تحریک شروع ہوئی جس نے تاریخ کا رخ عہد جدید کی طرف موڑ دیا۔

انھوں نے اطالیہ کی تاریخ اور وہاں کے دو خوبصورت شہر فلورینس اور وینس کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ خاص طور پر آرٹ کے نادر نمونوں کا بھی انھوں نے ذکر کیا ہے۔

''گرد راہ'' ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی ایک ایسی خودنوشت ہے جس کے مطالعے سے اس عہد کی تصویریں روشن ہوتی ہیں اور عالمی سطح پر سیاسی ادبی سماجی اور سیاسی تغیرات اور تبدیلیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ کیونکہ انھوں نے بہت سے ملکوں کا دورہ کیا تھا۔ اس لیے ان کے سامنے ایک وسیع تر منظر نامہ تھا اور افکار ونظریات کی تفہیم کے نئے زاویے روشن تھے۔

اختر حسین رائے پوری کی ''گرد راہ'' سے وہ تمام منزلیں روشن ہوتی ہیں جو اس عہد کے ممالک اور اقوام کا مقدر تھیں۔ اختر حسین رائے پوری کی زبان صاف، ستھری، سادہ، سلیس اور دل نشیں ہے اور انھوں نے صرف اپنی ذات یا شخصیت کے حوالے سے گفتگو نہیں کی ہے بلکہ سچ کہا جائے تو اپنی شخصیت کو منہا کر کے، خود اپنے آپ کو کائنات میں تلاش کرنے کی جستجو کی ہے جو کائنات نہایت وسیع ہے اور جس میں کسی بھی فرد کی ذات ایک نامعلوم نکتے کی حیثیت رکھتی ہے انھوں نے کائنات کے حوالے سے گویا، اپنی ذات کو جاننے کی کوشش کی ہے اور ''گرد راہ'' کے ذریعے عالمی منظر نامے کو قارئین کے روبرو پیش کر دیا ہے۔

مذکورہ جائزے کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ فرزندان علی گڑھ کی خودنوشتیں ان کے عہد کی آئینہ دار ہیں، جن میں ان کے بچپن کی حرکتیں، شباب کے مستانہ واقعات اور ضعیفی کے موہوم ایام کی داستانیں مرقوم ہیں۔ ان میں سے بعض خودنوشتیں فن، اسلوب اور ہیئت کے اعتبار سے اردو کی چیدہ اور منتخب خودنوشتوں میں شمار کی جاتی ہیں۔ اس طرح علی گڑھ کے قلم کاروں نے شعوری کوشش کی وجہ سے خودنوشت کا دامن کر دیا اور یہ صنف اردو کی دیگر اصناف میں لائق اعتبار ٹھہری۔

اس آباد خرابے میں: اختر الایمان (۱۹۹۶)

''اس آباد خرابے میں'' (اشاعت دوم ۱۹۹۶ء) اردو اکادمی، دہلی نامور شاعر اختر الایمان کی مقبول ترین خودنوشت ہے۔ یہ خودنوشت خودشناسی و دیگراں شناسی کے مرحلے سے بہت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ گزری ہے۔ اس خودنوشت کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے اس میں کہیں بھی کسی بھی لمحے کے سچ کو چھپانے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ اپنی زندگی کے اندھیرے واجالوں کو واضح طور پر روشن کر دیا ہے، یہی خوبی اور یہی سچائی اس آباد خرابے کو مقبولیت وشہرت عطا کرتی ہے۔ اختر الایمان کی خودنوشت کو پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ درد کے کتنے مراحل، کرب کے کتنے پڑاؤ اور آہ وفغاں کی کتنی پر پیچ منزلوں سے گزرے تھے۔ ان کے والد حافظ فتح محمد جو قدرے رنگین اور شوخ مزاج تھے، ان کا جمیلہ نامی ایک لڑکی سے اچھا خاصا شغف تھا، اختر الایمان نے اس واقعے کو خود لکھا ہے:

> ''میرے والد امامت کا پیشہ کرتے تھے، انہوں نے مذہبی تعلیم حاصل کی تھی، بہت اچھے قاری تھے، انہیں دیہات پسند تھے، امامت کے علاوہ مسجد کے صحن میں مکتب کھولتے تھے، جہاں دیہات کے ہر عمر کے لڑکے لڑکیاں پڑھنے آتے تھے، کمباسی میں جمیلہ نام کی ایک لڑکی ان کے پاس پڑھنے آتی تھی، گورا رنگ، لانبا قد، چھریرا بدن، دلآویز ناک نقشہ، ابا اس میں بڑی دلچسپی لیتے تھے، کچھ دن بعد جمیلہ نے آنا بند کر دیا اور ابا نے یہ گاؤں چھوڑ دیا۔'' [۱]

اختر الایمان کی خودنوشت ''اس آباد خرابے میں'' کی روشنی میں بہت سے معزز و عالی مقام تخلیق کار و قلم کار بہت ہی پست حیثیت نظر آتے ہیں، یہ کتاب ان کی شخصی تنزلی، فکری پس ماندگی اور ذہنی ناعاقبت اندیشی کو پیش کرتی ہے۔ مثلاً ن م راشد کے بارے میں جو انہوں نے لکھا ہے اسے پڑھ کر ان کی عظمتوں کی فلک شگاف عمارت پل بھر میں زمیں بوس ہوتی نظر آتی ہے اور احساس ہوتا ہے کہ جو لوگ بہت سرو قد نظر آتے ہیں وہ اپنی ذات میں کس حد تک کوتاہ قد ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں اختر الایمان ایک واقعے کا ذکر کرتے ہوئے

[۱] اس آباد خرابے میں، اختر الایمان، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۶، ۱۴-۱۳

لکھتے ہیں جس سے ن م راشد کی سطحیت کا اندازہ ہوتا ہے:

''واقعہ یوں ہے ریڈیو پر نشر ہونے والے پروگرام میں ان سے کہیں کچھ غلطی سرزد ہوگئی تھی جس کے لیے اسٹیشن ڈائریکٹر نے انہیں 30 روپے جرمانہ ادا کرنے کو کہا، اقتباس ملاحظہ ہو''میں نے کہا تمیں نہیں پندرہ، پندرہ، کیوں انہوں نے پوچھا، میں نے کہا ن م راشد اس شعبے کے صدر ہیں، انہوں نے کیوں نظر انداز کیا۔ ترجمہ انہیں پڑھنا چاہئے تھا آدھی ذمہ داری ان کی ہے، میں نے یہ بات ایسے ہی مذاق میں کہی تھی مگر راشد نے اس بات کا برا مانا۔ اگلے روز جو میں دفتر پہنچا، میری میز پر نوٹس رکھا تھا، تمہیں فوری طور پر برطرف کیا جاتا ہے۔'' [1]

اختر الایمان کی اس خودنوشت سے شاعروں کی شاہد بازی اور ان کی طوائف پرستی کا بھی حال معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانے کے کرسٹن بسٹن روڈ کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے بسمل شاہ جہان پوری، نخشب اور صابر دہلوی کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ لوگ اس کوچے کا چکر لگایا کرتے تھے۔ اس طرح کے اور بہت سارے دلچسپ واقعات ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختر الایمان نے اپنی زندگی کی کسی بھی سچائی سے کبھی چشم پوشی نہیں کی اور اپنی شخصیت کو مجروح ہونے سے بچایا بھی نہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ خودنوشتیں اپنے عہد کی آئینہ دار ہوتی ہیں، اختر الایمان کی خودنوشت بھی ان کے دور کے حالات وکوائف، سماجی، معاشرتی، ادبی تحریکات، رویے اور رجحانات کا پتہ دیتی ہے۔ اختر الایمان نے اپنی خودنوشت میں جہاں سماجی، معاشرتی اشارے کیے ہیں وہیں اس وقت کی ادبی تحریکات، رویے اور رجحانات کا ذکر کرتے ہوئے ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کے تعلق سے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ خاص طور سے پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

''اس آباد خرابے میں'' کے حوالے سے اخیر میں یہ کہنا غیر مناسب نہیں ہے کہ اس خودنوشت میں اختر الایمان کی شعوری کوششیں کارفرما نہیں ہیں بلکہ ان کے حافظے نے جہاں تک ان کا ساتھ دیا اسی کے سہارے وہ واقعات ترتیب دیتے گئے۔ ان کے لوح حافظہ پر جو بھی واقعہ ابھرتا گیا انہوں نے بلا کم وکاست نمک مرچ

[1] اس آباد خرابے میں، اختر الایمان، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۶، ۱۰۳

مصالحے کے بغیر قرطاس کے حوالے کر دیا اور اس کے اوپر کوئی روغن یا غازہ ملنے کی کوشش نہیں کی۔

اختر الایمان کی نثر میں بے انتہا سادگی اور ایک خاص طرح کی روانی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے اگر چہ اس میں کسی بھی طرح کی ترتیب کا خیال نہیں رکھا، یہی وجہ ہے کہ بہت سے واقعات کو انہوں نے مکرر رقم کر دیا ہے، وہ اس طرح کہ انہوں نے کوئی منصوبہ بند خودنوشت نہیں لکھی بلکہ اپنی شخصیت اور اپنے زمانے کے حوالے سے رائج روایات کو درج کیا ہے اور یہ روایات عام طور سے خودنوشتوں میں کمیاب ہیں۔ اس خود نوشت سے اختر الایمان کے باطنی نشیب وفراز اور زندگی کی تگ ودو کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

یہ بات بھی پہلے ہی عرض کی جا چکی ہے کہ اختر الایمان کی شہرت نظم نگاری کی رہین منت ہے، لیکن وہ نثر پر اپنی توجہ مرتکز کرتے تو ممکن ہے انہیں اور بھی زیادہ ادبی شہرت حاصل ہوتی۔ اختر الایمان کو نظم نگاری کی وجہ سے شہرت تو ملی لیکن اگر وہ نظم کی بجائے نثر پر اپنی توجہ مرتکز کرتے تو زیادہ کامیاب رہتے کہ ان کی نثر میں ندی کی سی سبک خرامی ہے اور سمندر کا سا سکون ہے۔ نثر پر زیادہ زور اس لیے کہ ایسی نثر جس میں سچائی ہو، صداقت ہو لکھنے والے کمیاب ہیں۔

جو کہا نہیں گیا: کسم انسل (۱۹۹۶)

کسم انسل نے اعلیٰ تعلیم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے حاصل کی۔ علی گڑھ کے ادبی ماحول نے ان کے فکر وفن اور شعری ذوق کو جلا بخشی۔ کسم انسل 1940 میں پیدا ہوئیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے اور پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔ ان کی ادبی زندگی کی کئی جہتیں ہیں، شاعرہ، افسانہ وناول نگار اور خودنوشت نگار کی حیثیت سے وہ ادبی حلقوں میں ایک خاص مقام رکھتی ہیں، نیو کا پتھر، اس کی پنچوٹی، اپنی اپنی یاترا، ریکھا کرتی ان کی ہندی کی تصانیف ہیں۔ اس کے علاوہ انگریزی سے بھی انہیں گہری واقفیت ہے۔ ''شیٹرنگ شیڈز'' ان کی انگریزی دانی کا ثبوت ہے۔ کسم انسل سیریل فلم اور ٹیلی فلم کے لیے اسکرپٹ اور ڈائیلاگ بھی لکھتی ہیں، اندر دھنوش اور اسی بہانے جیسے مقبول سیریل کی اسکرپٹ انہوں نے لکھی تھی۔

کسم انسل اپنے فکر وفن کا اظہار ہندی میں کرتی ہیں، جو کہا نہیں گیا، ان کی خودنوشت ہے، جو دراصل

ہندی میں ہے، خورشید عالم نے اس کا خوبصورت اور شستہ ترجمہ اردو میں کیا ہے۔

خودنوشت کے ابواب سے ان کے ادبی ذوق کو سمجھا جا سکتا ہے۔ خودنوشت کا پہلا باب 'گھر سے گھر' تک کے عنوان سے ہے۔ اس میں کسم انسل نے اپنی زندگی کی روداد واقعات اور ہوش سنبھالنے کے بعد تعلیم کے حصول کے لیے آگرہ اور علی گڑھ کے قیام کے احوال و کوائف بیان کیے ہیں۔ وہاں قیام کی جو روداد انہوں نے بیان کی ہے اس میں تصنع، بناوٹ اور ملاوٹ کے بجائے سادگی اور صداقت کا عنصر نمایاں ہے۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ خودنوشت کے ابتدائی صفحات ایک معصوم بچی کی سادہ لوحی کا بیان ہیں، جس میں معصومیت، سادگی اور بھولے پن کا اظہار ہے، یہی خودنوشت کا امتیاز ہے۔ خودنوشت کا اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''10 سال کی عمر میں میں اپنی بوا ''پھوپھی جی'' کے ساتھ آگرہ چلی گئی، اب پوری طرح وہی میرے ماں باپ تھے، امی سا جھے داری ٹوٹ رہی تھی، ایک گھر بدل رہا تھا، پہچان بدل رہی تھی، علی گڑھ کے ایک کمرے کی جگہ ایک چھوٹا سا گھر تھا، جس میں میرے لیے ایک اپنا کمرہ تھا، یہاں آ کر لگا کہ میری پہچان بن رہی ہے، میرے کھلے بال کندھوں کو گھیر رہے تھے، محبت کے دو ہاتھ ہیں ''پوری صاحب'' کی اکلوتی بیٹی ہوں، سب یہی کہتے تھے اور میں اسے سمجھنے بھی لگی تھی، پوری صاحب یا پاپا مجھے بہت پیار کرتے تھے اور مجھے فخر سا محسوس ہوتا تھا کہ اسے بانٹنے والا بھی اور کوئی دوسرا نہیں ہے۔ یہاں میرا راج تھا، لیکن دل کے کسی کونے میں میرے بھائی اور ان کا پیار اداسی کے ایک غبارے کی طرح امڑتا رہتا تھا، مجھے لگتا تھا کہ ایک درد سا ہے، ایک ٹیس سی ہے، جو میرے اندر دل میں سوال اٹھاتا ہے، آخر یہ درد کیا ہے؟ کسی نے کہا کہ دکھ ہے، تو ایسے میں دل یہ پوچھتا کہ کیا ہوتا ہے دکھ؟'' [1]

مذکورہ سطور سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں سادگی ہے، خلوص ہے، اپنا پن ہے، زبان و بیان کے اعتبار سے اس میں کوئی الجھاؤ نہیں ہے اور نہ ہی کوئی ابہام۔ اس معصوم کے دل میں جو درد و کسک کی مرتعش لہریں ابھریں، اسے سادگی کے ساتھ بیان کر دیا۔

یہ خودنوشت ان والدین کے لیے تازیانہ نصیحت ہے، جو ہنوز بچیوں کی تعلیم سے روگردانی کرتے ہیں

---

[1] جو کہا نہیں گیا، کسم انسل، راج پال اینڈ سنز، مدرسہ روڈ، کشمیری گیٹ، دہلی، ۱۹۹۶، ص ۲۵-۲۴

اوران کے ذہن اور فکروفن کی بالیدگی کو گھر کی چہار دیواری میں قید کر کے ضائع کر دیتے ہیں۔ دقیانوسی خیالات کے حامل والدین سے صرف یہی گزارش ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں کو شمعِ محفل نہ سہی چراغ خانہ بھی بنائیں کہ یہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی، اقتباس ملاحظہ ہو:

''پاپا مجھے اکساتے، کیونکہ وہ مجھے اندر تک جاننے لگے تھے، وہ مجھ میں قوت ارادی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ انہیں پڑھنے کا خود بہت شوق تھا، وہ مجھ سے پڑھائی کی ہی باتیں کرتے۔ ایک بار مجھے کشیدہ کاری کا شوق چڑھا تھا، پاپا میرے ہاتھ سے دھاگہ، سوئی اور کپڑا چھین لیے اور کہا تم ان سب کے لیے نہیں بنی ہو، تمہیں تو صرف پڑھنا ہے۔ اگر میں کچن میں ماں کا ہاتھ بٹاتی تو کہتے، نہیں تم سبزی نہیں کاٹو گی، تم اوروں جیسی نہیں ہو، تمہیں تو شاعری پڑھنی ہے۔ وہ اکثر نظمیں گنگناتے۔ میری نظموں کی کتابیں شوق سے پڑھتے اور کبھی کبھی وہ ورڈس ورتھ کی پوئم بھی سناتے۔'' [1]

خودنوشت کے مکالمے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسم کے والد خود تعلیم کے تئیں حساس تھے، اسی وجہ سے وہ اپنی بیٹی کی تربیت بھی علمی انداز سے کرتے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کے والد ارسطو کے اس قول سے واقف تھے، جو خواتین کی تعلیم اور ملک وقوم کی سرخروئی سے تعلق رکھتا ہے ''تم مجھے پڑھی لکھی مائیں دو، میں تمہیں بہترین قوم دوں گا۔''

یہ خودنوشت شخصیت کا اظہار ہے۔ اس میں زندگی کی تمام سچائیاں اور تلخیاں ہیں، جس سے سماج کی معصوم بہو بیٹیاں جوجھتی رہتی ہیں اور ان دقیانوسی رسوم و رواج پر ایک کاری ضرب ہے، جس میں صنف نازک کی مرضی نہیں، صرف والدین کا عمل دخل ہوتا ہے۔ اس روشن خیالی کے عہد میں بھی بہت سارے قبیلوں اور سماجوں میں بہو بیٹیوں سے شادی سے قبل ان کی مرضی اور پسند معلوم کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی، والدین کی مرضی اور فرسودہ رسوم و رواج اور مردوں کی بالادستی والے معاشرے میں بادل ناخواستہ لڑکیاں آج بھی دانستہ طور پر اس ظلم و جبر کا شکار ہو رہی ہیں، یہ خودنوشت ان رسوم و قیود پر کاری ضرب لگاتی ہے۔ ملاحظہ ہو اقتباس:

---

[1] جو کہا نہیں گیا، کسم انسل، راج پال اینڈ سنز، مدرسہ روڈ، کشمیری گیٹ، دہلی، ۱۹۹۶، ص ۲۵

''یہ بھی انوکھا سچ ہے کہ اس ان دیکھے واقعے کا اثر مجھ پر بہت زیادہ ہوا تھا۔ مجھے لگا کہ اپنے وجود کو دھوکہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے اپنے دل کی حالت کے برعکس رواجوں کی رو میں بہتے ہوئے چلنا ہو گا، ایک آس پیدا کرنی ہوگی، کھوئی ہوئی رسوم و رواج کو دوبارہ زندہ کرنا ہوگا، میرے دل میں خوشی کی لہر پھوٹنے لگی، جس مایوسی کو میں اپنے آنچل میں باندھے ہوئے بیٹھے تھی، وہ گٹھری کھلنے لگی، مجھے کچھ پکڑنے لگی، ایک سوچ، ایک فرض۔ مجھے لگنے لگا کچھ ہونے والا ہے، شاید ایک خوشبو، ایک مہک، ایک محبت، کانٹوں میں گھنے جنگل میں ایک پھول، لیکن اپنے ہونے والے شوہر کے تعلق سے مجھے کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ سب کچھ پراسرار، انجانا سا تھا اور میں جھجک کے پردے میں قید اس اجنبی کو اپنا بنا کر ''دیوتا'' جان کر تسلیم کرنے کی حالت میں قدم رکھ رہی تھی۔ ایک مکمل آدمی کے میرے خواب کو اس شبیہ کی، اس یادگار کے سامنے آنے کا انتظار کر رہی تھی اور نظم لکھ رہی تھی:

میری ڈولی کے کہار دھیرے چلو رے
دیکھو میرا من ڈگمگائے رے
کچھ کرلو وشرام اس ندی کے پاس
میرے بہت سے اکا کی پلوں کی یاد
یہاں بکھری ہے سانسوں کے ساتھ
ودالیتی چلوں تٹ سے آج کی شام رے [1]

یہ خودنوشت ایک نفسیاتی مطالعہ ہے، جس کے ذریعہ اس نفسیاتی اور ذہنی درد و کرب کا اندازہ ہوتا ہے، جس سے ایک معصوم کلی جوجھتی ہے، جسے اپنی زندگی کی، اپنے مستقبل کی، اپنے شریک سفر اور شریک حیات کے انتخاب کی آزادی نہیں ہوتی۔

پوری خودنوشت میں یہی جذبہ، یہی کیفیت اور یہی احساس رواں دواں ہے۔ حزنیہ لفظوں اور معصوم جذبوں کے پس پردہ ایک نسوانی کراہ سنائی دیتی ہے۔ خودنوشت کا امتیاز یہی ہے کہ اس میں مصنفہ نے ذاتی

[1] جو کہا نہیں گیا، کسم انسل، راج پال اینڈ سنز، مدرسہ روڈ، کشمیری گیٹ، دہلی، ۱۹۹۶، ص ۴۹

اور خاندانی عظمتوں کے بیان میں مبالغہ سے کام نہیں لیا اور خودنوشت کے فن کو مجروح ہونے سے بچایا ہے۔ خودنوشت کے مکالمے سے زندگی کی بہت سی فلسفیانہ گتھیوں کی گرہ کشائی ہوتی ہے، جگہ جگہ کسم انسل کی معصوم محبت اور اس بھولی بھالی بچی کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے، جو حال میں بھی ماضی کی درد بھری لہروں میں محبت کی کشتی پہ سوار ہے۔

کتاب میں زبان و بیان کے اعتبار سے کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ زبان عام فہم اور سادہ ہے، لیکن درد و کسک سے لبریز ہے۔ کسم انسل کے دل میں مادر علمی علی گڑھ کی یادیں جوان ہیں ان یادوں کے بیان میں جو شدت اور اپنا پن ہے اس سے مصنفہ کے ادارے سے تعلق قلبی کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کے دل سے علی گڑھ جدا نہیں ہوا ہے، وہ ہنوز ان کی یادوں میں بسا ہوا ہے۔ کتاب کے مختلف ابواب اور ان کی منطقی ترتیب سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ نے زندگی میں محبت اور حیات و کائنات کے مسائل کو کس زاویہ نگاہ سے دیکھا ہے۔

- گھر سے گھر تک
- الجھا من تانے بانوں میں
- ابھینے کا سچ (اداکارہ کی حقیقت)
- کس نے دیکھا ہے پنر جنم (موت کے بعد دوبارہ پیدا ہونا)
- حال کے اس پل میں
- تتلیوں سے پنچ وٹی تک
- کون سا رشتہ
- میری حصولیابی
- تھوڑا سا آکاش
- کرائے کے ہاتھ
- سنواد (بات چیت)
- رمن کیندر (مرکز)

- سدورنکشتر
- علی گڑھ میری زمین

خودنوشت کا ہر باب زندگی کے کسی مخصوص گوشے کی نمائندگی کرتا ہے۔ ایسا گوشہ جو ہنوز پردۂ خفا میں ہے، جسے زمانے کے رسوم و رواج اور بدعقیدگی زندہ درگور کرنے کے درپے ہے۔ مصنفہ نے اپنی زندگی کی حصولیابی اور کامیابی کے بیان میں سچائی سے کام لیا ہے۔ ان ہی خوبیوں کی وجہ سے خودنوشت اپنا تاثر قارئین کے ذہنوں میں قائم کرنے میں کامیاب ہے۔

کسم انسل نے نفسیات میں ایم اے کیا ہے۔ اس لیے وہ انسان کی نفسیات کو سمجھتی ہیں اور نفسیاتی کشمکش سے نبرد آزما رہتے ہوئے اس کا حل ڈھونڈتی ہیں۔ کسم انسل شعر و شاعری سے شغف رکھتی ہیں۔ اس وجہ سے خودنوشت میں جگہ جگہ اپنی اپنی کویتاؤں کے ذریعہ کتاب کے معنوی حسن کو چار چاند لگانے کی کوشش کی ہے۔ یہ اشعار کہیں بھی بھرتی کے نہیں معلوم ہوتے بلکہ موقع محل کے اعتبار سے کتاب کے لازمی اجزا معلوم ہوتے ہیں۔ ان اشعار میں رچاؤ، بساؤ کے ساتھ دلی جذبات و احساسات کی عکاسی کی گئی ہے۔

خودنوشت مادر درسگاہ علی گڑھ کی تہذیبی، ثقافتی، ادبی زوال پذیری کا احساس بھی دلاتی ہے۔ وہ شہر علم اور خوابوں کا شہر جس میں داخلہ لینا بہت سے طلبا کا خواب ہوتا ہے، شفقت، محبت و اپنائیت اور علم و ادب کی اس حسین وادی کی سیر کی حسرت ہر تشنگان علم کے دل میں جنم لیتی ہے۔ وہاں کے تہذیبی رکھ رکھاؤ کا شہرہ پورے ہندوستان میں تھا، لیکن اب سب خراب ہوتا جا رہا ہے۔ جس پر مصنفہ نے اظہار افسوس بھی کیا ہے:

> ''علی گڑھ اپنے ''علی گڑھی تالوں'' کے ساتھ ساتھ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور وہاں کی ایک خاص تہذیب، ثقافت، کلچر، ادب، رکھ رکھاؤ کے لیے مشہور تھا، لیکن وہ قدیم تہذیب، نفاست، سلیقہ وہاں کا ادبی ماحول اب دھول دھکڑ، آوارگی، غنڈہ گردی اور سیاسی دنگے بازیوں میں تبدیل ہو گیا ہے۔ ''[1]

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی روز اوّل ہی سے تہذیب و ثقافت کا گہوارہ اور ہندوستانی گنگا جمنی تہذیب کی علم بردار، آپسی رواداری اور خیر سگالی کے لیے مثال رہی ہے۔ علی گڑھ کا پہلا گریجویٹ بھی ہندو تھا اور کسم انسل

[1] جو کہا نہیں گیا، کسم انسل، راج پال اینڈ سنز، مدرسہ روڈ، کشمیری گیٹ، دہلی، ۱۹۹۶، ص ۲۱۶

اوران کے جیسے دوسرے لوگوں کا وہاں تعلیم حاصل کرنا بھی اسی خوبی کی دلیل ہے۔اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خودنوشت کسم انسل کی جانب سے ان علی گڑھ سے معاندانہ رویہ رکھنے والوں کے لیے ایک بے حد حسین تحفہ ہے۔امید ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ ان اذہان سے بغض وعناد اور رقابت کی کثافت کو دور کرنے میں بہت حد تک ممد ومعاون ثابت ہوگا۔

ہم ساتھ تھے: حمیدہ سالم (۱۹۹۹)

''ہم ساتھ تھے'' حمیدہ سالم کی خودنوشت ''شورش دوراں'' کی توسیع ہے۔''شورش دوراں'' ان کی ایسی خودنوشت ہے جس سے انھیں بے پناہ شہرت ومقبولیت بھی حاصل ہوئی۔اس کتاب میں اتنی دلکشی اور دل آویزی تھی کہ ''شورش دوراں'' سے انھیں تشنگی کا احساس ہوا اور لوگوں نے محسوس کیا کہ حمیدہ سالم،صفیہ اختر اور اسرار الحق مجاز کا ذکر تفصیل سے نہیں کیا ہے جب کہ ان دونوں کے ذکر کے تئیں لوگوں کی دلچسپی رہی ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے تحت حمیدہ سالم نے ''ہم ساتھ تھے'' کے عنوان سے کتاب لکھی۔

یہ کتاب بھی دراصل ان کی زندگی، خاندانی حالات وکوائف اور دیگر تہذیبی سماجی وثقافتی اقدار کا بیان ہے۔حمیدہ سالم نے جس خاندان میں جنم لیا تھا وہ کافی خوشحال تھا، ان کے پاس خاصی جائیداد تھی مگر اچانک جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ ہوا اور خوش حال گھرانے بھی خستہ حال ہوگئے۔اس کتاب میں حمیدہ سالم نے اپنے بھائیوں اسرار الحق مجاز، انصار الحق ہروانی اور اپنی بڑی بہن صفیہ جاں نثار اختر کے حوالے سے بہت کچھ لکھا ہے اوران کی زندگیوں کے واقعات،ان کی قربانیاں اوران کی آرزوؤں،تمناؤں اور خوابوں کی شکست کا احوال بیان کیا ہے۔حمیدہ سالم پانچ بھائی بہن تھے جن میں تین کی وفات بہت پہلے ہوچکی تھی، باقی بچے تھے انصار الحق ہروانی اور اسرار الحق مجاز۔

اس کتاب میں حمیدہ سالم نے ان تینوں کے حوالہ سے اس طرح لکھا ہے کہ ان کی پوری زندگی نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔

اسرار الحق مجاز اور صفیہ اختر ادبی دنیا میں بہت مشہور ہیں اور انصار الحق بھی مشہور ہیں مگر سیاست کے

حوالے سے۔ انھوں نے انگریزی میں Before Fredom and After بیفور فریڈم اینڈ آفٹر اور گاندھی ٹو گاندھی Gandhi to Gandhi جیسی کتابیں لکھیں۔ سیاست میں انصار الحق ہروانی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ ترقی پسند اور آزاد خیال تھے اور کانگریس کے رہنما تھے، پنڈت جواہر لال نہرو کے بہت قریب تھے۔ جب کہ اسرار الحق مجاز اردو شاعری کے حوالے سے اپنی مستحکم شناخت رکھتے ہیں۔ دونوں کے اندر ایک چیز قدرے مشترک تھی کہ دونوں بلا کے بادہ نوش تھے۔ انصار الحق ہروانی کو اگر شراب نوشی کی لت نہ ہوتی، تو شاید وہ بہت بڑے عہدے پر فائز ہوتے۔

حمیدہ سالم نے اپنے دونوں بھائیوں کے بارے میں انتہائی دکھ کے ساتھ لکھا ہے کہ لگتا ہے کہ کاتب تقدیر نے میرے دونوں بھائیوں کی تقدیریں ایک ہی قلم اور ایک ہی روشنائی سے لکھی تھیں، ابھرے، چمکے اور بجھ گئے۔ ایسا کیوں ہوا اور کیوں کر ہوا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ حمیدہ سالم نے اس کتاب میں کچھ بھی چھپایا نہیں ہے انھوں نے سید مسعود غازی کی رومان پرور اور مجاز اور زہرا انصاری کے رومان کی داستان بھی لکھی ہے۔ اسرار الحق مجاز کے باری میں ساری تفصیل لکھی ہے اور ان کی شاعری کو شخصیت کے حوالے سے اور ان کی شخصیت کو ان کی شاعری کے حوالے سے جاننے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> ''وہ تاعمر فتنۂ عقل سے بیزاری کا شکار رہے، ان کی شخصیت کے اس پہلو کو غیر ذمہ داری، سہل پسندی اور ناعاقبت اندیشی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ان کی ان خامیوں نے ان کی ذات کو نقصان پہنچایا۔ انھوں نے خود اپنی کمزوریوں کا اعتراف کیا ہے۔ منافقت انھیں چھو کر نہیں گئی تھی۔ یہاں تک کہ بانگ دہل اس گناہ و کمزوری کا اعلان کیا ہے جو حافظ و خیام میں تھی لیکن ساتھ ہی انسان پرستی کا بھی اظہار ہے جسے وہ آخری دم تک سینہ سے لگائے رہے۔ اگر ''گناہ'' میں شدت پیدا ہوتی گئی تو ساتھ ہی ساتھ انسانیت کے لیے درد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔'' [1]

اسی طرح انھوں نے اپنے بھائی انصار الحق ہروانی کے بارے میں لکھا ہے اور ان کے سیاسی نظریات کے تعلق سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی سیاسی فکر پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

[1] ہم ساتھ تھے، حمیدہ سالم، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۸۳

''علی گڑھ یونیورسٹی کے متعلق لوگوں کی یہ رائے ہے کہ وہ ہمیشہ سے برطانوی حکمرانوں کے وفاداریوں کا اڈا رہا سراسر بے بنیاد ہے۔ اگر علی گڑھ نے سر سکندر حیات خاں اور سر نظام الدین جیسے انگریزوں کے وفادار پیدا کیے تو راجہ مہندر پرتاپ سنگھ اور حسرت موہانی جیسے قوم پرست بھی پیدا کیے۔ مہم آزادی کے ان سپاہیوں کو کون بھول سکتا ہے۔ راجہ مہندر پرپات سنگھ نے پہلی جنگِ عظیم کے دوران برلن میں ہندوستان کی پروونشل گورنمنٹ کا اعلان کر دیا تھا اور مولانا حسرت موہانی نے ۱۹۲۰ء میں احمد آباد کی آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں ہندوستان کی مکمل خودمختاری کا ریزولیشن رکھا تھا۔ یہ رائے بھی صحیح نہیں کہ علی گڑھ کے تمام طلبا قائد اعظم جناح میں ایمان رکھتے تھے۔ ان نوجوانوں کی خاصی بڑی تعداد تھی جن کے دلوں پر پنڈت جی کے یہ الفاظ کندہ تھے:

"You will not get independence by logic, you will get it when they feel that it will be hell for them in India till agree to it."

''خودمختاری دلائل سے نہیں ملے گی، یہ اس وقت ملے گی جب ان کو یہ احساس ہو جائے کہ اگر انھوں نے ہندوستان کی آزادی قبول نہیں کی تو ہندوستان ان کے لیے جہنم بن جائے گا۔''

اس قوم پرست گروپ میں سوشلسٹ کمیونسٹ رجحان کے ہی نوجوان شامل تھے۔ باعث یکجائی تھا ان کا ایمان ملک کی آزادی میں، قوم کی وحدت میں اور سماجی و سیاسی جمہوریت میں۔ اس گروپ میں نمایاں تھے۔ خواجہ احمد عباس، علی سردار جعفری، سبط حسن، قاضی جلیل عباسی، اختر حسین رائے پوری اور تمام ترقی پسند ادیب، یہ وہ دور تھا جب غلامی کی زنجیریں توڑنے کی کاوشیں تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔ نوجوان خون اُبال پر آ جائے تو حالات خطرناک صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ اس اندیشہ کے تحت حکومت برطانیہ کی نگاہیں ہر یونیورسٹی پر تھیں خصوصی طور پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر جہاں انھوں نے بھانپ لیا تھا ان کی Divide and Rule کی پالیسی کارگر ہو کر رہے گی۔ مستقبل نے یہ ثابت کر دیا کہ ان کا اندازہ غلط نہ تھا۔'' [1]

---

[1] ہم ساتھ تھے، حمیدہ سالم، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۱۷-۱۱۶

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علی گڑھ کی سیاسی سوچ کیا تھی۔ اپنی بہن صفیہ اختر کے حوالے سے بھی انھوں نے جاوید اختر کے نام ایک طویل خط لکھا ہے اور اسی خط سے ان کے جذبات واحساسات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اسی خط سے صفیہ اختر کی پوری زندگی کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ جاوید اختر کے نام اپنے طویل اور جذباتی خط میں لکھتی ہیں:

''جادو مرنے والا چلا جاتا ہے، اپنی یادیں اور کچھ پچھتاہٹیں ضرور چھوڑ جاتا ہے۔ پھر صفیہ جیسی بیوی، بھائی اختر کو اگر کچھ پچھتاہٹیں تھیں تو انھوں نے اپنے دل ہی تک رکھیں۔ اظہار سے حاصل کیا تھا۔ مزید رسوائی مزید بدگمانی، البتہ یادوں کا اظہار دل کھول کر کیا۔ ''نئی بیوی کے نام خطوط'' کے مجموعہ کے صفحات پلٹ کر دیکھو جگہ جگہ تمہاری ماں کی تحریروں اور گفتگو کے حوالے ملتے ہیں۔ یہ یادیں خوب صورت دردانگیز اور دردآمیز تمہارے باپ کی زندگی کے آخری لمحہ تک ان کے ساتھ رہیں۔ شاید اسی کو صفیہ کی فتح کہا جاسکتا ہے۔

خدیجہ کو مخاطب کر کے ایک جگہ لکھتے ہیں: ''اچھا خدیجہ تم کبھی خیال تو نہیں کرتیں کہ تم سے اچھی خاصی باتیں کرنے میں صفیہ کا تذکرہ نکال لیتا ہوں۔ بہرکیف، اس کے لیے میں تم سے کوئی معذرت نہیں کروں گا۔ یہ تو میری زندگی کا راز بن گیا ہے شاید تمھیں چاہنے کا راز بھی یہی ہے، تمہاری بعض باتیں صفیہ کی یاد دلاتی ہیں۔ اسے تم میری کمزوری سمجھو یا کچھ بھی۔ مجھے جیتنے کا راز صفیہ کو چاہتے رہنے میں ہے۔ تم اس راز کو جانتی ہو۔ یہ مجھے معلوم ہے۔ پھر بھی تم اپنی اور میری باہمی محبت میں اس راز کو بھلا نہ دینا ورنہ اسی لمحہ مجھے کھو دو گی۔'' (خاموش آواز) یہ بات الگ ہے صفیہ کی چاہت صفیہ کی بے زبان اور خاموش تصویر پر روزانہ صبح ایک تازے پھولوں کی مالا پہنانے ہی تک محدود رہ گئی۔ صفیہ جو دوادھ کھلی کلیاں چھوڑ گئیں تھیں وہ آبیاری سے محتاج رہیں۔ اسے تو صفیہ کی دلی دعاؤں کا معجزہ سمجھنا چاہیے یہ کلیاں اس طرح کھلیں کہ زمانہ حیران رہ گیا۔ خدا تم دونوں بھائیوں کو نظر بد سے محفوظ رکھے۔'' [1]

---

[1] ہم ساتھ تھے، حمیدہ سالم، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۸۲-۱۸۱

اسی طرح آگے اور لکھتی ہیں:

''لوگ کہتے ہیں تمہاری بہن مری نہیں وہ تو حرف آشنا، زیرلب اور انداز نظر کے ذریعہ زندہ ہے۔ تمہارا بھائی بھی نہیں مرا ''آہنگ'' اس کی زندگی کی ضمانت ہے۔ جب تک اردو زبان زندہ ہے، تمہاری بہن اور بھائی زندہ ہیں۔ جادو میں اس سطح پر نہیں کہ میرے لیے یہ تسکین کافی ہو، میں اپنے دل کو کیسے سمجھاؤں وہ اندر ہی اندر روتا ہے ان جوان موتوں پر ان کی محرومیوں پر ان کی ناقدریوں پر۔''[1]

ہم ساتھ تھے ایک دلچسپ خودنوشت ہے جس سے حمیدہ سالم کی زندگی کے مہ وسال ہی نہیں بلکہ مجاز انصار اور صفیہ جاں نثار اختر کی زندگی کے بہت سے مخفی گوشے سامنے آتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے یادوں کا کولاژ ہے جسے حمیدہ سالم نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔ اس سے نہ صرف حمیدہ سالم کے خاندان اور وہاں کی قدروں سے آشنائی ہوتی ہے بلکہ اس عہد کی ثقافتی، سماجی، مذہبی اور اقتصادی زندگی کی تصویر بھی سامنے آجاتی ہے۔

مجاز کو سمجھنے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی کتاب نہیں ہوسکتی، کیونکہ حمیدہ سالم نے مجاز کے ایک ایک لمحے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور ایک بہن کی نگاہ سے اپنے بھائی کو جاننے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ جاں نثار اختر کی شخصیت بھی اس کتاب کے ذریعے روشن ہوجاتی ہے۔ اور بہت ہی خوبصورت و دلکش پیرائے میں جاں نثار اختر کی تصویر کشی کی ہے۔ جادو یعنی جاوید اختر کے نام خط میں لکھتی ہیں:

''۱۹۴۲ء صفیہ آپا کی زندگی کے لیے بہت اہم ثابت ہوا۔ سلمیٰ آپا کے رشتے کے بھائی یعنی تمہارے باپ (جاں نثار اختر) اپنی کزن سے ملنے گرلس کالج کے ہوسٹل آئے۔ انھوں نے اپنے دوست مجاز کی بہن ہونے کے ناطے صفیہ آپا سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ سلمیٰ آپا سے ان کی دوست کا ذکر بھی سن چکے ہوں گے۔ یہ شام بھائی اختر اور صفیہ آپا کی ملاقات کی پہلی شام تھی۔ ایک کھوئی کھوئی سی شخصیت۔ اپنے سے بے نیاز، اپنے اردگرد سے بے نیاز۔ لہجہ دھیما دھیما اور نرم سا۔ حلیہ شرمیلا سا۔ پیشانی پر پڑے ہوئے کچھ الجھے اور بکھرے ہوئے بال جنھیں گاہے گاہے گردن کو جھٹکا دے کر

[1] ہم ساتھ تھے، حمیدہ سالم، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۸۴

ہٹانے کی کوشش۔اس وقت کون جانتا تھا کہ ان کی پوری شخصیت ہی کچھ ایسے الجھاؤ اور بکھراؤ کا شکار ہے کہ سمیٹے نہیں سمٹ رہی ہے پر وہ تھک ضرور گئے ہیں اور سہارے کی خواہش رکھتے ہیں۔

غرض یہ کہ بھائی اختر کے شاعرانہ انداز، شاعرانہ مزاج اور شاعرانہ حلیہ نے پہلی ہی ملاقات میں صفیہ آپا کے دل کو جیت لیا۔عقل نے بھی حامی بھر دی کہ ایک ہم مذاق، ہم ذوق ساتھی مل جائے، پیاسی زندگی کو اس سے زیادہ کیا چاہیے۔ بھائی اختر کی اس زمانے کی ہلکی پھلکی اور رومانی شاعری نہ جانے کتنی ادب نواز نوجوان لڑکیوں کا دل موہ چکی تھی۔غرضیکہ صفیہ آپا اس پہلی ملاقات میں اُن کی ہو بیٹھیں۔ بھائی اختر بھی غالباً کوئی ایسا مقصد لے کر آئے تھے۔'' [1]

حمیدہ سالم کی زبان بہت خوبصورت ہے، سلیس ہے اور انھیں زبان و بیان پر مکمل قدرت حاصل ہے۔خودنوشت کی زبان ایسی ہے کہ پڑھنے والا اس کے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہے اور کتاب ختم ہونے کے بعد اسے مزید تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ کسی بھی کتاب کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل ہے، ورنہ عموماً چند صفحات کے بعد قاری کی سانسیں تھکنے لگتی ہیں اور ذہن بوریت محسوس کرنے لگتا ہے، جب کہ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ قاری کے اندر تجسس کا جذبہ جاگتا ہے اور اس کے اندر مزید جاننے کی خواہش بیدار ہوتی ہے۔

ظاہر ہے جب ذکر ایسی شخصیتوں کا ہو جن کی زندگی الف لیلہ کی طرح پر اسرار طلسماتی ہو، تو کیوں نہ قاری اس کے اندر کھو جائے۔''شورش دوراں'' اور ''ہم ساتھ تھے'' دونوں دلچسپ خودنوشت ہیں اور اس فن میں ایک اہم اضافہ بھی۔

برگ گل: مقبول احمد (۲۰۰۱)

ایک عام تاثر لوگوں میں پایا جاتا ہے کہ اردو کی بیشتر خودنوشتیں تعلّی سے بھری ہوئی ہیں، گو کہ یہ رائے صد فی صد درست نہیں ہے لیکن اس میں صداقت کا کچھ عنصر ضرور پایا جاتا ہے۔اس صنف میں ذات کا اظہار

[1] ہم ساتھ تھے، حمیدہ سالم، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۵

کم، عظمتوں کا انکشاف زیادہ ہونے لگا ہے۔ اردو میں خودنوشت سوانح عمریوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ مگر کچھ ایسی بھی خودنوشتیں ہیں، جن میں ذات کے حوالے سے کائنات اور انسانی علوم و معارف سے بھی آگاہی ہوتیہے۔ انہیں میں ایک ''برگ گل'' بھی ہے، جس کے مصنف پروفیسر سید مقبول احمد بین الاقوامی شہرت و شخصیت کے حامل ہیں۔ دراسات عربی اور ایشیائے غربی سے ان کا بہت ہی گہرا تعلق رہا ہے۔ وہ حکومت ہند کے عربی مجلّہ ''ثقافت الہند'' کے ایڈیٹر بھی رہے۔ عربی اسلامی جغرافیہ پر انہوں نے بہت ہی اعلیٰ پائے کا کام کیا ہے، جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ ابوالحسن المسعودی (۱۵۷۴ء) کی تصنیف مروج المذہب و معاون الجواہر کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور مسعودی کی جغرافیہ پر تحقیقی کام کیا۔ مشہور جغرافیہ داں دنیا کا پہلا کرۂ ارض کا نقشہ بنانے والے شریف الادریسی (۴۹۳ھ ۵۶۰ھ) کی ''نزہت المشتاق فی اختراق الآفاق'' کے ان حصوں کو ایڈٹ کیا، جو ہندوستان سے متعلق ہے، جسے شعبہ اسلامیات مسلم یونیورسٹی نے ''وصف الہند و مایجاورھا'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس تحقیقی کام کی بدولت مقبول صاحب پوری دنیا میں بحیثیت محقق مقبول ہوئے۔ مقبول صاحب آکسفورڈ یونیورسٹی کے ساختہ پرداختہ تھے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی سے انہوں نے ڈی فل کی ڈگری حاصل کی تھی، اسی وجہ سے وہ ہندوستان کے تعلیمی اداروں کو بھی اسی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ شملہ، کشمیر اور علی گڑھ سے ان کا نہایت ہی ذمہ دارانہ تعلق رہا۔ بحیثیت معلم و منتظم جہاں جہاں بھی گئے اپنی علمیت اور انفرادیت کا گہرا نقش قائم کرتے گئے۔

پروفیسر مقبول احمد کی خودنوشت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ صرف خودنوشت نہیں بلکہ سفرنامہ بھی ہے۔ بہت سے ممالک کی سیاسی، سماجی، معاشرتی، ثقافتی تصویریں بھی اس کتاب میں نظر آتی ہیں۔ اس وجہ سے کئی کتابوں کی خوبیاں اس کتاب میں مدغم ہوگئی ہیں۔ اسی وجہ سے یہ کتاب کئی اعتبار سے علمی، ادبی حلقوں میں اعتبار و استناد، مصادر و مراجع کی حیثیت رکھتی ہے۔ مقبول صاحب کا میدان اسلامی جغرافیہ تھا اس لیے انہوں نے جغرافیائی لحاظ سے اپنی خودنوشت کو بہتر، مستند اور پرمغز بنانے کی کوشش کی ہے۔ مقبول صاحب کی اس کتاب سے جہاں ہندوستان کی مجموعی صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں ان ممالک کے احوال و کوائف سے آگاہی ہوتی ہے، جن سے ماضی میں ہندوستان کے خوشگوار مراسم تھے۔ اس طرح سے یہ

خودنوشت تاریخ، جغرافیہ، سماجیات، ثقافت اور عمرانیات کی ایک ڈائریکٹری معلوم ہوتی ہے۔ اس کتاب میں مقبول صاحب کے بہت سے معاصر مستشرقین کی علمیت اور فکری گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ پروفیسر مینارسکی کی علمی خدمات کی جانکاری بھی اس کتاب سے ملتی ہے۔

تعلیم و تعلم کے پیش نظر انہوں نے لندن، فرانس، پراگ، ہنگری، رومانیہ، چیکوسلواکیہ، بلغاریہ، مصر، بغداد، تیونس، لبنان، افغانستان کے کئی اسفار کیے اور تمام ممالک کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، جس کا اظہار جگہ جگہ اپنی خودنوشت میں کرتے ہیں۔ مقبول صاحب نے شادی انگلستان میں کی تھی۔ ان کی اہلیہ سائنس میں پی ایچ ڈی تھیں لیکن ہندوستان آ کر اپنی بیٹی کے ساتھ ایم بی بی ایس کی سند حاصل کی۔ ولایت میں شادی کرنے کی وجہ سے ان کی گھریلو زندگی افراتفری کا شکار رہی۔ ڈاکٹر ریاض الرحمٰن شیروانی کا خیال ہے:

> ''مقبول صاحب کی گھریلو زندگی بہت غیر استوار رہی، انہوں نے شادی انگلستان میں ہی کر لی تھی۔ ان کے علی گڑھ آ جانے کے بعد ان کی بیگم اور بیٹی کو بعض قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے آنے میں دیر لگی۔'' [1]

''برگِ گل'' کے صفحات ان کی حیات کی ناہمواریوں، خوشگواریوں، پیچیدگیوں کے آئینہ ہیں۔ ان کی زندگی میں بے شمار اعزاز و اکرام سے اللہ تعالیٰ نے انہیں نوازا۔ ایک بڑے اعزاز کی تفصیل ریاض الرحمٰن شیروانی یوں بیان کرتے ہیں:

> ''وہ اردن چلے گئے، جہاں انہیں ایک یونیورسٹی کے قیام میں تعاون کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ یہ کتنا بڑا اعزاز ہے کہ کوئی عرب ملک، ہندوستان کے کسی عربی کے عالم کو ایسی گراں مایہ خدمت کے لیے منتخب کرے۔'' [2]

پروفیسر مقبول احمد نے جتنا اور جس معیار کا علمی کام کیا اس کے جائزے کا یہ موقع نہیں ہے، تاہم یہ

---

[1] کانفرنس گزٹ، پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی، سلطان جہاں منزل علی گڑھ، جلد ۵، شمارہ ۲، فروری ۲۰۰۷، ص ۶

[2] کانفرنس گزٹ، پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی، سلطان جہاں منزل علی گڑھ، جلد ۵، شمارہ ۲، فروری ۲۰۰۷، ص ۱۰

ضرور ہے کہ اگر انہوں نے زیادہ مستحکم گھریلو زندگی گزاری ہوتی اور اس قدر نقل مکانی نہ کی ہوتی تو وہ اپنی صلاحیت کے مطابق اس سے زیادہ اچھا اور بڑا کام کر سکتے تھے۔

برگ گل میں ان کی شخصیت کا وہ پہلو بھی نظر آتا ہے جس میں انگلستان کے طرز حیات اور تمدن کا اثر نمایاں ہے۔ انہوں نے جتنی مدت انگلستان میں گزاری تھی اور وہاں کے طرز حیات اور تمدن کے جس حد تک عادی ہو گئے تھے اس کے زیر اثر وہ انگلستان اور ہندوستان کی معاشرت کا فرق ملحوظ نظر نہیں رکھتے تھے۔ کتنی باتیں ہیں جو مغرب میں اس طرح قبول کر لی گئی ہیں گویا زندگی کا حصہ بن گئی ہیں۔ لیکن مشرق ابھی تک اس کا متحمل نہیں ہے۔ بالخصوص ہمارے یہاں کے لوگوں کے ذہنوں میں عربی اور اسلامیات کے اساتذہ کی ایک خاص شبیہ ہے، جس سے انحراف انہیں گوارہ نہیں ہوتا ہے اس کے برعکس مقبول صاحب کی رائے تھی کہ عربی اور اسلامیات بھی اسی طرح ڈسپلن ہیں جس طرح دوسرے ڈسپلن ہیں اور ان کے عالموں کے لیے مسلمان ہونا بھی ضروری نہیں ہے چہ جائے کہ باعمل مسلمان ہونا۔

اسی طرح اور بہت ساری معلومات کا مخزن ہے ''برگ گل''۔ عام طور سے خودنوشتوں میں مصنف صرف اپنی ذات وحیات کو ہی نمایاں کرتے ہیں اور اپنے اوصاف اور فضائل کو تعلّی کے ساتھ بیان کرتے ہیں مگر یہ خودنوشت ان تمام عیوب ونقائص سے پاک ہے۔ پروفیسر مقبول صاحب بیک وقت کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ انہیں عربی، انگریزی، فارسی، گجراتی، ہندی، فرینچ، ترکی زبانوں سے واقفیت تھی اور وہ اپنے میدان میں فرد فرید تھے۔ ان کی خدمات لازوال ہیں۔

پروفیسر مقبول صاحب انگریزی میں ہی لکھا کرتے تھے، اردو میں انہوں نے بہت بعد میں لکھنا شروع کیا۔ ان کی نثر علمی نثر ہے، جس میں سلاست، روانی، وضاحت، صراحت، قطعیت، ترنم اور نغمگی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کی نثر کی خوبیوں کا اعتراف بڑے ناقدین فن نے کیا ہے۔ چونکہ وہ اپنی نثر میں ایجاز واختصار کا خاص خیال رکھتے تھے، وہ بے جا طوالت اور طویل تمہید سے گریز کرتے اور معروضی انداز میں لکھتے تھے۔ ان کی نثر بہت ہی جامع و مانع ہے اور انتہائی مرتکز نثر ہے۔ بیجا طوالت اور تمہید طولانی سے گریز نے ان کی نثر کو حسن جمیل عطا کیا ہے۔ وہ انتہائی معروضی اور منطقی انداز میں لکھتے ہیں، یہ ایک بہت بڑی خوبی ہے۔

''برگ گل'' پروفیسر مقبول احمد کی بہترین خودنوشت ہے اور اردو والوں کے لیے ایک بہترین رول ماڈل۔ ''برگ گل'' کا نام انہوں نے شاہ جہاں کی بیٹی اورنگ زیب عالم گیر کی علم دوست، سخن شناس بہن جہاں آرا کے ایک شعر سے مستعار لیا ہے:

آہستہ برگ گل بفشاں برمزار ما
پس نازک است شیشۂ دل درکنار ما

جہاں آرا کے اس شعر کی طرح مقبول صاحب کی خودنوشت بھی، خوبصورت، حسین وجمیل اور معنی خیز ہے۔

بابِ چہارم

علی گڑھ میں سوانح نگاری کا ارتقا

(بیسویں صدی کے سوانح نگاروں کے حوالے سے)

سوانح نگاری کے فن پر بات کرنے سے قبل یہ ذہن نشیں کرنا نہایت ضروری ہے کہ اس فن کے تحت کسی مشہور شخصیت کی زندگی کے تمام حالات پیدائش سے موت تک قلم بند کیے جاتے ہیں۔ اسے عام طور پر 'سوانح عمری' کہتے ہیں۔ سوانح عمری کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں، جیسے سوانح عمری تاریخ کی وہ شکل ہے جو انسانی نسلوں اور گروہوں سے نہیں بلکہ افراد سے متعلق ہے، یا یہ کہ سوانح عمری ایک انسان کی پیدائش سے موت تک کے افکار و اعمال کا بیان ہے، وغیرہ وغیرہ۔ مغربی ادیبوں نے بھی اسے 'انسان کی حیات'، 'انسان کی تاریخ' وغیرہ سے تعبیر کیا ہے۔

انسانی تاریخ یا دوسروں کے حالاتِ زندگی جاننے کا شوق انسان کے اندر زمانۂ قدیم سے ہی چلا آ رہا ہے۔ پہلے بھی انسان ایک دوسرے کو اپنے جذبات و احساسات میں شریک کرتا تھا اور آج بھی یہ سلسلہ فنون لطیفہ کی مختلف شکلوں میں جاری و ساری ہے۔ کہانی کہنا اور سننا انسانی جبلت میں شامل ہے۔ یہ کہانی اگر کسی دوسرے شخص کی ہے تو اس کی قدر و اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ یہ بالکل فطری امر ہے کہ انسان خواہ کتنا ہی مصروف ہو لیکن دوسرے کے بارے میں کچھ جاننے کا جذبہ اس کے اندر ہمیشہ کروٹیں لیتا رہتا ہے۔ ان ہی محرکات کی بنا پر انسان اپنے بزرگوں اور آبا و اجداد کے کارنامے کو مختلف شکلوں میں جمع کرتا آیا ہے۔ اسی طرز تحریر کو آج ادبی دنیا میں سوانحی ادب سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لیکن سوانح لکھنے کا جتنا رجحان جو مسلمانوں کے اندر پایا جاتا ہے وہ دنیا کی کسی اور قوم میں نہیں پایا جاتا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ رہی کہ چونکہ نبی

آخرالزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کو جمع کرنے کا رواج ہمارے یہاں ایک زمانے سے رہا ہے اور اسی کو 'حدیث' کہا جاتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو اس فن کی طرف خاص لگاؤ رہا۔ عربی سے یہ فن فارسی میں آیا اور پھر اس کے بعد اس نے اردو ادب پر اپنے اثرات مرتب کیے۔

سوانح نگاری اس لحاظ سے دوسری اصناف نثر سے مختلف ہے کہ اس کا مرکزی کردار حقیقی ہوتا ہے۔ اس کی ذات کے اردگرد ہی کہانی گردش کرتی ہے۔ اس میں سوانح نگار کردار کی زندگی کے تمام نشیب وفراز کو سچائی اور حقیقت کی روشنی میں پرکھتے ہوئے اس میں تخیلی رنگ بھر کر صفحہ قرطاس پر اتارتا ہے۔ حقیقت اور تخیل کی آمیزش ہی اس صنف کو ادب میں انوکھا مقام عطا کرتی ہے اور اسی وجہ سے اس کا تخلیقی فن میں شمار ہوتا ہے۔

اردو میں سوانح نگاری کی تاریخ

دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح اردو میں بھی ابتدائی سوانحی ادب کا آغاز شعری اصناف سے ہوتا ہے۔ سترہویں صدی سے انیسویں صدی کے آخر تک اردو ادب میں نیم سوانحی تحریریں ہمیں دکنی ادب میں ملتی ہیں۔ یہ بات بھی عجیب وغریب ہے کہ اردو اپنے سرچشمہ سے دور دکن کی غیر مانوس دراوڑی فضا میں کیسے پلی بڑھی۔ اس کا سہرا گولکنڈہ اور بیجاپور کے بادشاہوں کے سر جاتا ہے۔ ان کی علم دوستی اور شاہانہ سرپرستی نے شاعروں اور ادیبوں کو اپنے فن کے مظاہرے کے لیے بھرپور موقع عنایت کیا۔ حمد ونعت، منقبت، قصیدہ، غزل، مرثیہ، مثنوی کے علاوہ ادیبوں نے نثر میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ ان ہی کارناموں کی بدولت تاریخ میں اس دور کی اہمیت مسلم ہے۔

اگرچہ ان تصانیف کے موضوع سیاسی، اخلاقی وتاریخی ہیں لیکن ان میں نیم سوانحی عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ فضلؔی کی 'محی الدین نامہ'، باقر آگاہ کی 'محبوب القلوب' اور شاہ حسین ذوقی کی 'غوث نامہ' وغیرہ کے موضوع عبدالقادر جیلانیؒ ہیں۔ کچھ تحریریں پیغمبر اسلام، خلفائے راشدین، انبیا، ائمہ، بزرگان دین، اہل بیت، شہدائے کربلا وغیرہ سے متعلق ہیں، مثلاً مومن (متوطن چن پٹن میسور) کی 'اسرار عشق' (1093ھ) فیض کی 'عام قوس' (1125ھ) مترجمہ سید شہاب الدین، ریاض الجناں کی 'تحفۂ احباب' (1207ھ)

وغیرہ۔اس کے علاوہ اس عہد کی بعض ایسی مثنویاں بھی ہیں جنھیں سیاسی زمرے میں رکھا جا سکتا ہے، جیسے عبدلؔ کی 'ابراہیم نامہ' (1010ھ)، وجہی کی قطب مشتری (1018ھ) اور نصرتیؔ کی 'علی نامہ' (1067 سے 1077 تک) وغیرہ۔

ان تمام تحریروں میں تاریخ کے ساتھ ساتھ ہمیں بعض شخصیتوں کے حالات، پیدائش، عادات واطوار، سفر وغیرہ کا مفصل بیان ملتا ہے۔خاص طور سے قطب مشتری اور علی نامہ میں اس عہد کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے جس سے اس عہد کی طرز معاشرت اور تہذیب وتمدن پر روشنی پڑتی ہے۔نصرتی کی 'گلشن عشق' میں ان کے اپنے حالات تفصیل سے درج ہیں۔اسی طرح امین کی 'بہرام' اور 'بانوئے حسن' میں شاعر کی نجی زندگی کا بیان ملتا ہے۔

قدیم اردو مثنویوں کی طرح اردو مرثیہ میں بھی سیرت نگاری کے عناصر نمایاں ہیں۔مرثیہ میں خاص طور سے کربلا کے واقعہ اور اس سے متعلقہ افراد کی سیرت کو حسن وخوبی کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔دوسری قسم کے مرثیوں میں ہم ذاتی مرثیوں کو بھی شامل کر سکتے ہیں جن کے موضوعات زیادہ تر ہم عصر افراد ہی ہوتے ہیں۔ان تحریروں سے کرداروں کی زندگی پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ایسے مرثیوں کی مثال ہمیں غالب، مومن، حالی، شبلی اور اقبال کے یہاں ملتی ہے۔اگرچہ ہم ان مرثیوں کو سوانح کے زمرے میں نہیں رکھ سکتے لیکن ان مرثیوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مرثیہ نگار نے اپنے اپنے موضوعات کو ایسی فنکاری سے پیش کیا ہے کہ اس عہد کے تاریخی، سیاسی ومعاشی حالات کے ساتھ ساتھ تہذیبی وتمدنی حالات سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔ان مرثیوں میں بھی اردو کے ابتدائی سوانحی نقوش ملتے ہیں۔

شعرائے اردو کے تذکرے بھی اس سلسلے میں کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ان میں عام طور پر شعرا کے سوانحی حالات اور تخلیقی کارنامے کا ذکر ہوتا ہے۔مثال کے طور پر ہم میر کے تذکرہ 'نکات الشعرا' (1752ء)، فتح علی گردیزی کے تذکرہ 'ریختہ گویاں'، لچھمی نرائن شفیق کے تذکرہ 'چمنستان شعرا'، علی ابراہیم خاں کے 'گلزار ابراہیم' وغیرہ کو پیش کر سکتے ہیں۔ان تمام تذکروں میں شاعروں کی زندگی کے حالات وواقعات سرسری طور پر درج کیے گئے ہیں۔ان میں تنظیم وترتیب کی کمی نمایاں ہے۔شاعروں کا انتخاب، ان کی صلاحیت وعظمت کے

اعتبار سے نہیں کیا گیا ہے۔ اگر چہ ان تذکروں میں شعرا کے حالات مفصل بیان نہیں کیے گئے لیکن ان کی علمی و ادبی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے بعد جو تذکرے لکھے گئے ہیں وہ بھی قابل ذکر ہیں، مثلاً 'مجموعہ نغز' جو حکیم قدرت اللہ قاسم کی تصنیف ہے لیکن اس کا شمار درجہ اول کے تذکروں میں ہوتا ہے، 'گلشن بے خار' جس کے مصنف مصطفیٰ خاں شیفتہ ہیں، فیلن کا تذکرہ 'طبقات الشعرا' (1848ء)، مرزا قادر بخش کا تذکرہ 'گلستان سخن' اور 'آب حیات' (1880ء) جو ان تذکروں کی آخری کڑی ہے۔ اگر چہ ان تذکروں کو سوانحی ادب میں شامل نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کی علمی و ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

انیسویں صدی اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس کے ابتدائی دور سے ہی ادیبوں اور مصنفوں نے سوانح نگاری کو بطور فن بروئے کار لانے کی کوشش کی۔ گر چہ ہم ان تصانیف کو سوانح نگاری کے جدید اصول کے مطابق مکمل نہیں کہہ سکتے لیکن ان کی اہمیت ادبی دنیا میں مسلم ہے۔ اس دور کی زیادہ تر سوانح مذہبی نوعیت کی ہیں۔ ان کے تخلیق کار بھی یا تو عالم ہیں یا معلم اور ان کے ہیرو بھی تاریخی شخصیت ہیں۔ مثال کے طور پر 'ترجمہ تاریخ الخلفا'۔ اس میں حضرت ابوبکرؓ کے حالات و اخلاق، شکل و شمائل اور قبول اسلام سے پہلے کی تفصیلات وغیرہ کا ذکر ہے۔

'ضیاء الاخیار' (1818ء) میر اکبر علی بن سید فضل علی رضوی کی تصنیف ہے۔ اس میں امام حسین کی حیات و خصائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ 'تذکرۃ الکاملین' (1849ء) میں مشرق و مغرب کے مشاہیر کے مختصر حالات لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان مشاہیر میں یونان، روم، انگلستان، ایران و ہند کے بادشاہ، سپہ سالار، عالم، فلسفی، شاعر، مذہبی رہنما وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں والمیکی، شنکر اچاریہ اور مہدس بھاسکر بھی ہیں۔ اس کے مؤلف ماسٹر رام چندر تھے۔ 'روضۃ الاصفیا' 1855ء کی تصنیف ہے جس کے مصنف محمد طاہر ہیں۔

سر سید احمد خاں کی تصانیف میں 'سیرت فریدیہ' سر سید کی پہلی سوانحی تصنیف ہے جس میں انھوں نے اپنے نانا فرید الدین کے حالات زندگی کو پیش کیا ہے۔ 'خطبات احمدیہ' 1875ء میں منظر عام پر آئی۔ ان میں کل بارہ خطبات ہیں اور یہ 320 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے ابتدائی حصے میں عرب کا جغرافیہ، اسلام میں

طلاق، تعداد ازدواج، معراج، جنت و دوزخ، پیغمبر اسلام کے نسب نامے وغیرہ کا ذکر ہے۔ بارہویں خطبے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بارہ سال کی عمر تک کے حالات درج ہیں۔ سرسید نے اس کتاب کو بڑی جدوجہد کے ساتھ لفظی جامہ پہنایا ہے۔ اس کی خاطر سرسید کو انگلستان کا سفر کرنا پڑا۔ شروع میں سرسید نے سیرت نگاری کے فن پر مفصل بحث کی ہے اور ان کمیوں کی طرف توجہ دلائی ہے کہ کس طرح علمائے اسلام کی بے احتیاطی سے مغرب میں محمدؐ کے تئیں غلط فہمی پیدا ہوئی ہے۔ اس کتاب کے سوانحی عناصر کے حوالے سے سید شاہ علی لکھتے ہیں:

> ''سوانحی جزئیات کی اس روایت کے باوجود ان کے انداز تحریر میں ایک عیسائی مشنری کا سا جذبہ پایا جاتا ہے جس کا مقصد بیان سے زیادہ استحکام حقائق اور تردید الزامات ہے۔ یہ جذبہ سوانح نگاری کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں حسن ترتیب کی کمی ہے جو سوانح عمری کے لیے خواہ وہ مکمل ہو یا جزوی ضروری ہے۔'' [1]

باوجود ان خامیوں کے یہ تصنیف ادبی سوانحی دنیا میں بہت معروف و مقبول ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سرسید کی سوانحی تصانیف سے آنے والی نسلوں کو ایک نئی تحریک ملی جس کی وجہ سے اس صنف کی طرف خاص توجہ دی جانے لگی۔ ان کے ہم عصر رفقا میں حالی اور شبلی اس لحاظ سے کافی اہمیت کے قابل ہیں۔

سوانح نگاری کے ارتقا میں علی گڑھ کا حصہ (بیسویں صدی کے حوالے سے)

بیسویں صدی میں جہاں اردو ادب کی کئی اصناف کو فروغ حاصل ہوا، وہیں غیر افسانوی نثر میں سوانح نگاری کو بھی کافی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اور حالی و شبلی جیسے اردو کے بڑے سوانح نگار ابھر کر سامنے آئے۔ ان دونوں حضرات نے سوانح عمری کے میدان میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ ان دونوں حضرات کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بعض کئی اور اصحاب نے بھی اس فن کی طرف توجہ کی اور اپنے زمانے کی مشہور شخصیات کے حالات زندگی قلم بند کیے۔ سوانح نگاری کے معاملے میں بھی علی گڑھ اور اس سے وابستہ حضرات کو امتیاز حاصل ہے۔ حالی، شبلی، ذکاء اللہ جیسے ابتدائی سوانح نگاروں کا تعلق علی گڑھ کالج سے ہی تھا۔ ان حضرات نے اس فن

[1] اردو میں سوانح نگاری : ڈاکٹر سید شاہ علی، گلڈ پبلشنگ ہاؤس، کراچی، ۱۹۶۱، ص ۱۴۹

کو کمال عروج تک پہنچایا اور سرسید، غالب، مولانا روم، سعدی وغیرہ جیسی نابغہ روزگار ہستیوں کے واقعات زندگی کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔

ذیل کے سطور میں علی گڑھ سے وابستہ ان مشہور شخصیات کی سوانح نگاری پر تفصیلی گفتگو کرنے کی کوشش کی گئی ہے جنھوں نے بیسویں صدی میں سوانح نگاری کے ارتقا میں اہم رول ادا کیا۔

سوانح نگار حالؔی اور 'حیاتِ جاوید'

حالؔی کی سوانح نگاری پر اب تک ہزاروں صفحات سیاہ کیے جا چکے ہیں اور اس صنف ادب میں ان کی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لہٰذا ان کی سوانح نگاری سے بحث کرتے وقت وہی تمام چیزیں دوبارہ ذکر کی جائیں گی، اس میں کسی اضافہ کی گنجائش اب بہت کم نظر آتی ہے۔ دوسرے یہ کہ حالؔی نے اپنی زندگی میں تین سوانح عمریاں قلم بند کیں – حیات سعدی، یادگارِ غالب اور حیات جاوید۔ ان میں سے آخر الذکر ہی ایک ایسی سوانح ہے جس کا تعلق اس دور، یعنی بیسویں صدی سے ہے جس پر ہم گفتگو کر رہے ہیں۔ 'حیات جاوید' کا دورِ تصنیف 1893 سے 1901 ہے اور چونکہ یہ سرسید کی سوانح عمری ہے اس لیے علی گڑھ میں اس صنف کے ارتقا کے تعلق سے کافی اہمیت کی حامل ہے۔ یہاں پر ہم حالی کی اسی سوانح پر گفتگو کرنے پر اکتفا کریں گے۔

حالی کو اردو کا اولین سوانح نگار اور ان کی سوانح 'حیات جاوید' کو کامل ترین سوانح عمری قرار دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ ذکر کرنا بے جا نہیں ہوگا کہ سرسید کی شخصیت جتنی اعلیٰ اور ہمہ گیر تھی، اس کو یکجا کرنا دریا کو کوزے میں بند کرنے کی مانند تھا۔ حالی نے اس چیلنج کو قبول کیا اور جتنی محنت و عرق ریزی سے انھوں نے اس کام کو مکمل کیا، وہ کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن اس کام کی تکمیل میں جس چیز نے ان کا سب سے زیادہ ساتھ دیا وہ سرسید سے ان کی رفاقت تھی۔

'حیات جاوید' سے پہلے چونکہ حالی دو سوانح عمریاں لکھ چکے تھے اور ان دونوں سوانح عمریوں کو کافی مقبولیت بھی حاصل ہو چکی تھی، اس لیے اس سوانح کو لکھنے میں انھیں تکنیک کے اعتبار سے کوئی خاص دقت نہیں

اٹھانی پڑی۔ 'حیات جاوید' کے دیباچہ میں حالی نے اس سوانح کو لکھنے کا مقصد بھی پوری طرح واضح کر دیا ہے۔ کہتے ہیں ''سرسید احمد خاں مرحوم کے جہاں ہم پر اور بہت سے احسانات ہیں انھیں میں سے ایک بہت بڑا احسان یہ ہے کہ وہ ہمارے لیے ایک ایسی بے بہا زندگی کا نمونہ چھوڑ گئے ہیں جس سے بہتر ہم اپنی موجودہ حالت کے موافق کوئی نمونہ قوم کی تاریخ میں نہیں پا سکتے۔'' اور ظاہر ہے کہ جس کی شخصیت اتنی اعلیٰ و بلند ہو اس کی زندگی کے بارے میں مکمل معلومات کون حاصل کرنا نہیں چاہے گا۔ اسی دیباچہ میں آگے چل کر مزید لکھتے ہیں کہ ''البتہ سرسید کی لائف ہمارے لیے ایک ایسی مثال ہے جس کی پیروی سے ممکن ہے کہ ہماری قوم کی یہ کٹھن منزل جو تنگنائے دنیا میں ظاہراً اس کی سب سے آخری منزل ہے آسانی کے ساتھ طے ہو جائے۔ اس بزرگ کی لائف ہم کو نصیحت کرتی ہے کہ زمانے کی مخالفت کو خدا کی مخالفت سمجھ کر اس کے ساتھ موافقت پیدا کرو تا کہ دنیا میں آرام سے رہو اور عزت سے زندگی بسر کرو۔ جب تم میں عمدہ حاکم بننے کی لیاقت باقی نہ رہے تو عمدہ رعیت بننے میں کوشش کرو تا کہ دونوں عمدگیوں سے ہاتھ نہ دھو بیٹھو۔'' گویا حالی نے سرسید کی سوانح لکھنے کی ضرورت و اہمیت کو بتانے کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ ہمیں سرسید کی زندگی سے کیا سبق لینا چاہیے۔ آج بھی ملک کے حالات تقریباً ویسے ہی ہیں جیسے کہ انگریزوں کے دورِ حکومت میں ہوا کرتے تھے۔ آج بھی ہماری قوم کو سرسید جیسے کسی مسیحا کی ضرورت ہے، لیکن سرسید نہ سہی ان کی یہ سوانح بقول حالی، ہمارے لیے ایک رہبر کا کام کر سکتی ہے۔

حالی کے اس دیباچہ سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کی زندگی پر سب سے پہلے جس شخص نے قلم اٹھایا تھا وہ ایک انگریز کرنل گریہم تھا، جس پر حالی افسوس بھی کرتے ہیں کہ یہ کام تو مسلمانوں کے کرنے کا تھا نہ کہ کسی غیر مسلم کا۔ کرنل گریہم نے سرسید کی یہ سوانح ان کی وفات سے تیرہ برس پہلے ہی انگریزی زبان میں لکھ کر شائع کر دی تھی۔ پھر حالی نے سرسید کی سوانح کو دوبارہ لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟ اس کے بارے میں خود ہی لکھتے ہیں کہ ''لیکن سچ یہ ہے کہ اس عجیب و غریب شخص کی بائیوگرافی ایسی چیز نہیں جس کے لکھنے کا حق ایک آدھ مصنف سے ادا ہو سکے۔ چنانچہ کرنل گریہم کی کتاب پر ایک انگریزی اخبار میں یہ ریمارک کیا گیا تھا کہ 'وہ ایک مکمل بائیوگرافی ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔' ہم کو پہلے بھی یہی امید تھی اور اب جب کہ سرسید کی

وفات نے ایک حیرت انگیز غلغلہ تمام ہندوستان میں ڈال دیا ہے وہ امید یقین کے درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ جس قدر زیادہ زمانہ گذرتا جائے گا اُسی قدر سرسید کے کاموں کی زیادہ قدر اور اُن کے حالات کی زیادہ چھان بین ہوتی جائے گی، متعدد لوگ ان کی بائیوگرافی لکھنے پر قلم اٹھائیں گے اور صدیوں تک اس ہیرو کا راگ ہندوستان میں گایا جائے گا۔''

اس سلسلے میں ڈاکٹر سید شاہ علی یوں رقم طراز ہیں :

''...سرسید کی رفاقت، سوانحی مواد کی فراوانی، برسوں سے ان کی سوانح عمری لکھنے کی نیت اور سعی ہر چیز انھیں اس کا استحقاق اور موقع عطا کرتی تھی کہ اسے ایک لازوال شاہکار کی شکل دیں، اردو کے ایک عظیم ادیب کو ہندوستان کے ایک عظیم ترین انسان کی سوانح عمری لکھنے کا موقع حاصل ہوا تھا۔ حالی کو کم سے کم پچیس سال تک سرسید کی دوستی اور رفاقت کا شرف حاصل رہا۔ انھوں نے سرسید کو نہایت قریب سے دیکھا اور ان کے کاموں میں ہاتھ بٹایا۔ ملازمت کی مجبوریوں کی وجہ سے سرسید کے عزیز ترین دوست محسن الملک کو بھی ان کی سیرت و کردار اور کارناموں کے اتنے قریبی مطالعے کا موقع نہیں ملا ہوگا جتنا حالی کو، حالی ایک ادیب ہونے کی وجہ سے سرسید کو بحیثیت عملی انسان کے بیحد پسند کرتے تھے۔ اس کے علاوہ حالی اپنی طبعی شرافت، رواداری اور فراخ دلی کی بنا پر دوسروں کی عظمت کا کھلے دل سے اعتراف کرتے تھے اور ان کا انکسار اور ان کا طالب علمانہ جذبہ ہمیشہ ان کے دل و دماغ کے پٹ کھلے رکھنے کا باعث ہوا تھا۔'' [1]

جیسا کہ میں نے گذشتہ کے صفحات میں ذکر کیا کہ سرسید جس وقت مدرستہ العلوم کی بنیاد ڈال رہے تھے، حالی کی دوراندیش نظر نے اسی وقت ان کی اعلیٰ شخصیت کو پہچان لیا تھا اور تبھی سے انھوں نے ان کی سوانح لکھنے کا قصد کرلیا تھا۔ اس کا ذکر خود حالی نے 'حیات جاوید' کے دیباچہ میں کیا ہے۔

''اگرچہ سرسید نے اپنی زندگی عام بھلائی کے کاموں میں مدت سے وقف کر رکھی تھی مگر ابھی تک ان کا حال پہلی رات کے چاند کا سا تھا کہ کسی نے دیکھا اور کسی نے نہ دیکھا لیکن مدرستہ العلوم اور

[1] اردو میں سوانح نگاری : ڈاکٹر سید شاہ علی، گلڈ پبلشنگ ہاؤس، کراچی، ۱۹۶۱، ص ۱۷۳

تہذیب الاخلاق نے ان کی کوششوں کو چودھویں رات کے چاند کی طرح سب پر روشن کر دیا۔'' [1]

حالی نے سرسید کی سوانح لکھنے کی تیاری کیسے کی، اس کا ذکر انھوں نے 'حیات جاوید' کے دیباچے میں کئی جگہ کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''اگر چہ قوم میں عموماً مخالفت پھیلی ہوئی تھی مگر ایک گروہ ایسا بھی تھا جو سرسید کے کاموں کو نہایت عظمت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ میرے دل میں بھی ان کی وقعت روز بروز زیادہ ہونے لگی۔ اُسی وقت سے میں نے کچھ نوٹ ان کی لائف کے متعلق قلمبند کرنے شروع کیے اور کم وبیش سو سوال ایک کاپی میں لکھ کر سرسید کے پاس بمقام علیگڈھ اس غرض سے بھیجے کہ ان کے جواب مختصر طور پر لکھدیں مگر وہ کاپی ان کے پاس یوں ہی پڑی رہی، کسی سوال کا جواب وہاں سے نہ ملا۔ میں نے یہ بھی چاہا کہ برس چھ مہینے خود علیگڈھ میں جا کر رہوں جہاں اس کام کے لیے قیام کرنا نہایت ضروری تھا مگر ملازمت کے تعلق کی وجہ سے یہ موقع بھی نہ مل سکا۔'' حالی کی ان تحریروں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے سرسید کے ابتدائی سوانح نگار، جیسے کرنل گریہم اور منشی سراج الدین کے ذریعے جمع کیے گئے مواد سے بھی استفادہ کیا۔ بقول حالی ''میں آنریبل حاجی اسمٰعیل خاں کا شکر گذار ہوں کہ جس وقت ان کو میرا ارادہ معلوم ہوا انھوں نے وہ تمام مسودات جو منشی سراج الدین نے مرتب کیے تھے میرے حوالہ کر دیے اور اپنے دوست منشی سراج الدین کا بھی ممنون ہوں کہ ان کے مسودات سے میں نے فائدہ اٹھایا ہے۔''

۱۸۵۷ سے قبل اور اس کے بعد کے سرسید کے احوال وکوائف چونکہ کئی اخبارات ورسائل میں تفصیل سے شائع ہو چکے تھے، اس لیے ان تفصیلات کو جمع کرنے میں بھی حالی کو کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی۔ البتہ ان کو جس دشواری کا سامنا تھا، خود اپنی زبان میں یوں بیان کرتے ہیں:

> ''...مگر درحقیقت ان کی تمام سوانح عمری کا سمیٹنا نہایت دشوار کام ہے۔ ان کی زندگی ایسے اہم واقعات سے بھری ہوئی ہے کہ نہ کسی واقعہ کو سرسری سمجھ کر چھوڑا ہی جا سکتا ہے اور نہ ہر ایک واقعہ کو مفصل بیان کیا جا سکتا ہے۔ ایک دوست نے بالکل سچ کہا کہ جس قدر سرسید کی زندگی میں اُن کے مخالف یا موافق لکھا گیا ہے اور جس قدر اُن کی وفات پر اطراف ہندوستان میں رنج وماتم کا اظہار کیا

[1] دیباچہ، حیات جاوید، مولا الطاف حسین حالی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۹، ص ۲۳

گیا ہے اگر صرف اسی کو جمع کیا جائے تو متعدد ضخیم جلدیں مرتب ہوسکتی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ جو شخص سرسید کی لائف ایک آدھ جلد میں ختم کرنی چاہتا ہے اس کو کیسا مشکل کام کرنا ہے۔ اس سے بھی زیادہ سخت مشکل جو بائیوگرافی کے مضمون سے علاقہ رکھتی ہے یہ ہے کہ سرسید کی ذات میں اس قدر مختلف الجنس حیثیتیں جمع تھیں کہ ہر ایک حیثیت پر اُس کی شان اور اُس کے درجہ کے موافق گفتگو کرنا ایک ایسا کام ہے جس کا پورا پورا حق وہی مصنف ادا کرسکتا ہے جو خود بھی سرسید کے برابر جامع حیثیات ہو۔ مذہب، اخلاق، معاشرت، تعلیم، ججمنٹ، پالٹکس، لٹریچر، پبلک سپیکنگ، انجینئرنگ، آرکیولوجی وغیرہ وغیرہ کس کس بات کو بیان کیا جائے؟ اور کس کس حیثیت پر گفتگو کی جائے؟'' [1]

لیکن حالی نے ہار نہیں مانی اور دریا کو کوزے میں بند کرنے کا کام آخر کر ہی ڈالا۔ البتہ ایک اعتراض جو حالی پر ہمیشہ سے کیا جاتا رہا ہے کہ انھوں نے اس سوانح میں سرسید کی ہر جگہ تعریف ہی تعریف کی ہے اور غیر جانبداری سے کام لیتے ہوئے ان کی خامیوں کو اجاگر نہیں کیا ہے۔ لیکن یہ اعتراض سراسر غلط ہے کیوں کہ 'حیات جاوید' کا اگر ایمانداری سے مطالعہ کیا جائے تو اس میں حالی نے سرسید کی خوبیوں کو گنانے کے ساتھ ساتھ ان کی خامیوں کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بارے میں انھوں نے اس کے دیباچہ میں یہ بات صاف کردی ہے کہ ''وہ (سرسید) ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے اس لیے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اُسی کی لائف میں اُس کی پیروی کیجائے اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔'' اس کے آگے مزید لکھتے ہیں کہ ''اگرچہ سرسید کے معصوم ہونے کا نہ ہم کو دعویٰ ہے اور نہ اس کے ثابت کرنے کا ہم ارادہ رکھتے ہیں لیکن اس بات کا ہم کو خود بھی یقین ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اوروں کو بھی اس کا یقین دلائیں کہ سرسید کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا اور اس لیے ضرور ہے کہ ان کے ہر ایک کام کو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا جائے کیونکہ سچ میں اور صرف سچ ہی میں یہ کرامت ہے کہ جس قدر اس میں زیادہ کرید کیجاتی ہے اُسی قدر اُس کے جوہر زیادہ آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔''

[1] دیباچہ، حیات جاوید، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۷۹، ص ۲۶

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالی نے سوانح کو لکھتے وقت کسی طرح کی جانبداری سے کام نہیں لیا بلکہ سچ بات کہنے پر اکتفا کیا۔ اسی لیے حالی کی یہ سوانح فن سوانح نگاری کے تمام لوازمات کو پوری کرتی ہے اور اس پر کھری اترتی ہے۔ باوجود اس کے ایسے لوگوں کی ایک لمبی فہرست ہے جو 'حیات جاوید' میں خامیاں تلاش کرنے سے باز نہیں آئے۔ اس قافلے میں شبلی، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر عبداللہ، پروفیسر آل احمد سرور پیش پیش ہیں۔ ڈاکٹر سید شاہ علی نے بھی 'حیات جاوید' میں کئی خامیاں تلاش کی ہیں۔ ایک جگہ 'حیات جاوید' کی طوالت پر سوالیہ نشان لگاتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں :

''لیکن جس تفصیل اور جامعیت کے ساتھ حالی نے اس کام کو پورا کرنا چاہا اور جس طرح تمام جزئیات وتفصیلات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی، اس نے ان کے عزیز مقصد ہی کو فوت کر دیا، یعنی غلط فہمیوں کے ازالے کیلئے انھوں نے جو زحمت اٹھائی تھی وہ کتاب کی ضخامت کی وجہ سے شرمندۂ معنی نہیں ہوئی۔ حالی کی ادبی صلاحیتوں اور پختہ کاری کو دیکھتے ہوئے ان کے لئے اپنے سوانحی مواد کو سمیٹنا محال نہ تھا لیکن سوانح عمری کی دو حصوں میں تقسیم جو غیر ضروری اعادے کا باعث ہوتی اور ان کی اپنے دوست اور رہبر کی ہر چیز کی تشریح اور صفائی میں سرگرمی اس کے آڑے آئی۔ اس سے انکار نہیں ہے کہ ایک طویل سوانح عمری میں اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ کوئی قابلِ ذکر بات چھوٹنے نہ پائے۔ اگر حالی انتخابِ واقعات میں اصلاحی پہلو مدنظر نہ رکھتے اور اپنے تبصرے، بحث اور اظہار رائے کی بجائے وہ صرف بیانِ حقائق پر اکتفا کرتے تو شاید اتنی طوالت نہ ہوتی۔ لیکن یہ چیز سرسید کے کارناموں اور خدمات کے حالی پر انتہائی اثر کی وجہ سے تھی۔'' [1]

بعض حضرات کو یہ سوانح مکمل مداحی نظر آتی ہے تو بعض حضرات 'حیات جاوید' کے حوالے سے سرسید کو ایک انسان کے بجائے صرف ایک مصلح گردانتے ہیں۔ اس قسم کے اور بھی کئی اعتراضات حالی پر کیے گئے ہیں۔ سید شاہ علی 'حیات جاوید' کے تعلق سے حالی کی ایک اور خامی نکالتے ہوئے یوں لکھتے ہیں :

''اس کے علاوہ ایک اور خامی جو حالی کے یہاں ہمیں نظر آتی ہے اور جس نے کتاب کے حجم کے

---

[1] اردو میں سوانح نگاری، ڈاکٹر سید شاہ علی، گلڈ پبلشنگ ہاؤس، کراچی، ۱۹۶۱، ص ۱۷۷

اضافے میں مدد دی ہے وہ ان کی خطوط کے اندراج کی عادت ہے سوانح نگاری میں عموماً خطوط کی نقل کی نہیں بلکہ خطوط کے استعمال کی ضرورت ہے۔ حالی نے سرسید کے نجی اور عام حالات و کردار اور کارناموں دونوں کے معاملہ میں نہایت فراخ دلی سے خطوط کو نقل کیا ہے۔ اس کے علاوہ اخبارات کی تحریروں، مشاہیر کی تقریروں اور مختلف تصانیف سے طویل اقتباسات وغیرہ کو بے کم و کاست پیش کر دیا ہے۔ اس میں حتی الامکان کاٹ چھانٹ، امتیاز اور احتراز کی ضرورت تھی اسی قسم کی کمی، سرسید کے متعلق غلط فہمی، اور کتاب کی اشاعت میں تاخیر اور ناشروں، کتب فروشوں اور پڑھنے والوں کی بے اعتنائی کا باعث ہوئی ورنہ حیاتِ جاوید اور الفاروق ادبی اور قومی دونوں لحاظ سے ناقابلِ فراموش کتابیں ہیں۔'' [1]

بہرحال 'حیات جاوید' کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ سید احمد خاں کی پیدائش 17 / اکتوبر 1817 کو دہلی میں ہوئی۔ ان کا سلسلۂ نسب چھتیس واسطوں سے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ ان کے آباء و اجداد ملک عرب سے ہجرت کر کے سب سے پہلے ایران کے شہر دامغان میں سکونت پذیر ہوئے اور پھر وہاں سے شاہ جہاں کے دورِ حکومت میں ہندوستان آ کر مقیم ہو گئے۔ سرسید کے دادا سید ہادی شاہانِ مغلیہ کے دربار سے جڑے ہوئے تھے اور وہیں سے انھیں 'جواد الدولہ' کا خطاب بھی ملا تھا۔ سید ہادی کے بیٹے اور سرسید کے والد میر متقی کا بھی دربارِ مغلیہ میں وہی مقام و رتبہ تھا جو کہ سید ہادی کا لیکن چونکہ اس وقت بادشاہت برائے نام رہ گئی تھی اور خود میر متقی ایک آزاد طبیعت کے مالک تھے، اس لیے انھوں نے دربارِ مغلیہ سے ملنے والے خطابات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، پھر بھی اکبر شاہ سے ان کے کافی قریبی تعلقات تھے اور وہ ان کے دربار اور محل میں بے روک ٹوک آیا جایا کرتے تھے۔ بعض دفعہ سرسید بھی ان کے ہمراہ ہوا کرتے۔ اس کے علاوہ سرسید کے والد دہلی کے ایک مشہور پیر حضرت شاہ غلام علیؒ سے بیعت تھے اور خود شاہ صاحب کی ان پر پدرانہ نظرِ عنایت تھی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کو مذہب اور خانقاہی زندگی سے لگاؤ ان کے والد صاحب کی وجہ سے تھا۔ سرسید کے نانا خواجہ فرید الدین بھی دربارِ مغلیہ سے وابستہ تھے۔ سرسید نے 'سیرت

[1] اردو میں سوانح نگاری، ڈاکٹر سید شاہ علی، گلڈ پبلشنگ ہاؤس، کراچی، ۱۹۶۱، ص ۱۸۴۔۱۸۵

فریدیہ' کے عنوان سے اپنے نانا کی سوانح لکھی ہے جس میں ان کے بارے میں مکمل تفصیلات بیان کی ہیں۔ سرسید کی زندگی پر نانا کے کافی اثرات تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ سرسید کے والد میر متقی، شادی کے بعد خواجہ فریدالدین کے گھر منتقل ہوگئے تھے، اس کے علاوہ چونکہ والد کا زیادہ تر وقت خانقاہی ماحول میں گزرتا تھا، اس لیے ابتدائی تعلیم وتربیت نانا اور والدہ کی زیرنگرانی ہی ہوئی جس کا اثر ان کی پوری زندگی میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

بچپن میں سرسید کو کھیلنے کودنے کی پوری آزادی تھی لیکن ان کو ایک تنبیہ یہ ضرور کی گئی تھی کہ وہ جو بھی کھیل کھیلیں چھپا کر نہ کھیلیں بلکہ گھر کے افراد کے سامنے کھیلیں۔ ایسے میں ظاہر ہے کہ بچوں میں بری عادتوں کے پڑنے کا خطرہ بالکل نہ کے برابر رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کھیلوں میں کوئی ایسی بات نہ ہوتی تھی جو بچے اپنے بزرگوں کے سامنے نہ کرسکیں۔ یہیں سے سرسید کے اندر اچھی عادات وخصائل پیدا ہونے شروع ہوئے۔

اسی طرح حالی نے سرسید کی زبانی دسترخوان پر کھانے کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے :

''میرے نانا صبح کا کھانا اندر زنانے میں کھاتے تھے۔ ایک چوڑا چکلا دسترخوان بچھتا تھا۔ بیٹے بیٹیاں، پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں اور بیٹوں کی بیویاں سب ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ بچوں کے آگے خالی رکابیاں ہوتی تھیں۔ نانا صاحب ہر ایک سے پوچھتے تھے کہ کون سی چیز کھاؤ گے؟ جو کچھ وہ بتاتا وہی چیز چمچے میں لیکر اپنے ہاتھ سے اُس کی رکابی میں ڈال دیتے۔ تمام بچے بہت ادب اور صفائی سے اُن کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ سب کو خیال رہتا تھا کہ کوئی چیز گرنے نہ پائے، ہاتھ کھانے میں زیادہ نہ بھرے اور نوالا چبانے کی آواز منہ سے نہ نکلے۔ رات کا کھانا وہ باہر دیوانخانے میں کھاتے تھے۔ زنانہ ہو جاتا تھا۔ میری والدہ اور میری چھوٹی خالا کھانا کھلانے آتی تھیں۔ ہم سب لڑکے اُن کے سامنے بیٹھتے تھے۔ ہم کو بڑی مشکل پڑتی تھی۔ کسی کے پانو کا دھبا سفید چاندنی پر لگ جاتا تھا تو نہایت ناراض ہوتے تھے۔ روشنائی وغیرہ کا دھبا کسی کے کپڑے پر ہوتا تھا اُس سے بھی ناخوش ہوتے تھے۔ شام کو چراغ جلنے کے بعد اُن کے پوتے اور نواسے جو مکتب میں پڑھتے تھے اور جن میں سے ایک میں بھی تھا، ان کو سبق سنانے جاتے تھے جس کا سبق اچھا یاد ہوتا اُس کو کسی قسم کی

عمدہ مٹھائی ملتی اور جس کو یاد نہ ہوتا اس کو کچھ نہ دیتے اور گھرک دیتے۔'' [1]

یہی وہ عادات و خصائص تھے جو بعد میں چل کر سرسید پوری قوم میں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ تہذیب الاخلاق کی فائلیں اس کی گواہ ہیں کہ سرسید نے کھانے، پینے، رہائش و زیبائش سے متعلق کتنے مضامین لکھے ہیں اور اس بات کے لیے کتنے فکر مند رہا کرتے تھے کہ یہ تمام خصلتیں ان کی قوم کے اندر پیدا ہو جائیں۔

سرسید نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر ہی حاصل کی بلکہ ناظرہ قرآن ننھیال میں ایک استانی سے مکمل کیا۔ اس کے بعد گھر کے باہر مکتب میں پڑھنے لگے اور اس وقت کے رواج کے مطابق مولوی حمید الدین سے کریما، خالق باری اور آمد نامہ جیسی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ فارسی میں بھی گلستاں و بوستاں اور اس جیسی دوسری کتابیں پڑھیں۔ عربی میں شرح ملا، شرح تہذیب، میبذی، مختصر معانی وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ لیکن یہ تمام کتابیں بے توجہی سے پڑھی گئیں۔ اس میں انھوں نے کوئی کمال حاصل نہیں کیا۔ البتہ ان کے نانیہال میں علم ریاضی کا خوب دور دورہ تھا، لہٰذا اپنے ماموں سے ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔ طب کی بھی کچھ کتابیں پڑھیں۔ لیکن اٹھارہ انیس سال کی عمر میں کسی استاد کی زیر نگرانی تعلیم حاصل کرنا چھوڑ دیا اور خود سے ہی کتابوں کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔

عنفوان شباب میں سرسید اکثر طوائفوں کے مجرے بھی سننے جایا کرتے تھے اور شعر و شاعری سے بھی انھیں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن زندگی کی یہ رنگینی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی اور اپنے بڑے بھائی کی بے وقت موت کا سرسید پر اتنا گہرا اثر پڑا کہ رنگین صحبتوں سے ان کا دل بالکل اچاٹ ہو گیا۔ لباس وغیرہ بھی تبدیل ہو گئے، داڑھی بھی بڑھالی اور مذہب کی طرف زیادہ مائل ہو گئے۔

محمد میر متقی کا جس وقت انتقال ہوا، اس وقت سرسید کی عمر بائیس سال تھی۔ والد کی زندگی میں چونکہ ذریعہ معاش قلعہ سے ملنے والی رقم ہوا کرتی تھی، جس میں دربار کے بعض لوگوں کی عداوت کی وجہ سے اب کمی بیشی ہونے لگی تھی، اس لیے والد کے انتقال کے بعد سرسید نے قلعہ سے رشتہ توڑ لینا اور سرکار انگریزی کی نوکری کرنا ہی بہتر سمجھا۔ حالی نے سرسید کی ابتدائی ملازمت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

---

[1] حیات جاوید، مولانا الطاف حسین حالی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۵۱

''اُس وقت وہ (سرسید) عدالت کی کارروائیوں سے اور انگریزی قوانین سے محض ناواقف تھے۔ سب سے پہلے انھوں نے عدالت کی کارروائی سے اطلاع حاصل کرنی چاہی۔ اُن کے خالو مولوی خلیل اللہ خاں اُس وقت دلی میں صدر امین تھے۔ ان سے درخواست کی کہ وہ اپنی کچہری میں اُن کو کام سیکھنے کی اجازت دیں۔ انھوں نے خوشی سے اجازت دیدی اور سرسید نے وہاں کام سیکھنا شروع کیا۔ چند مہینے ان کو کام سیکھتے گذرے تھے کہ مولوی خلیل اللہ نے اُن کو فوجداری کے خفیف مقدمات کا جو کہ فیصلہ کے لیے صدر امینی میں آتے تھے اپنی کچہری میں سررشتہ دار مقرر کر دیا۔ سرسید کو اس کام پر کچھ بہت دن نہ گذرے تھے کہ مسٹر رابرٹ ہملٹن (جو آخر کو سر رابرٹ ہملٹن ہوئے) دلّی میں جج ہو کر آئے۔ سرسید کو وہ پہلے سے جانتے تھے اس لیے یہ اُن سے ملنے کو گئے اور نوکری کی درخواست کی۔ انھوں نے اُن کو عدالت سشن کا سررشتہ دار مقرر کرنا چاہا لیکن انھوں نے اُس کام کو مشکل جان کر انکار کیا۔ ہر چند صاحب جج نے بہت اصرار اور دلدہی کی کہ کچھ تردد کی بات نہیں ہے، ہم تم سے بہ سہولت کام لیں گے اور ہر ایک بات بتاتے رہیں گے مگر سرسید نے کہا کہ جس کام کی میں اپنے میں لیاقت نہیں پاتا اُس کو کیونکر قبول کر سکتا ہوں۔ غرض کہ بدستور صدر امینی میں کام کرتے رہے۔ اتفاق سے انھیں دنوں میں مسٹر ہملٹن آگرہ کے کمشنر ہو گئے اور چلتے وقت سرسید کو ایک چٹھی کے ذریعہ سے اپنے جانشین مسٹر لینڈزی کے سپرد کر گئے۔ لیکن ابھی مسٹر لینڈزی سرسید کو کوئی عہدہ دینے نہیں پائے تھے کہ مسٹر رابرٹ ہملٹن نے اُن کو آگرہ میں بلا لیا اور فروری ۱۸۳۹ء میں کمشنری کے دفتر میں جو عہدہ نائب منشی کا خالی ہوا اُس پر مقرر کر دیا۔'' [1]

اس کے بعد سرسید کا تبادلہ فتح پور سیکری، دلی، بجنور، مرادآباد جیسے مقامات پر ہوا۔ اس دوران سرسید اپنے علمی اور تصنیف و تالیف کے کاموں میں مسلسل مشغول رہے، جیسے آثار الصنادید، تاریخ سرکشی ضلع بجنور، آئین اکبری کی تصحیح و تالیف وغیرہ۔ لیکن اس کے بعد سرسید کی زندگی میں وہ زمانہ آتا ہے جس نے نہ صرف ان کے زندگی کے مقصد کو تبدیل کر کے رکھ دیا بلکہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کی چولیں بھی ہل گئیں۔ یہ واقعہ

[1] حیات جاوید، مولانا الطاف حسین حالی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۹، ص ۶۱

تھا1857 کے انقلاب کا۔ انگریزوں کی ظلم وزیادتی اور مذہبی تعصب کی وجہ سے سب سے پہلے ان کے ماتحت کام کرنے والے ہندوستانیوں کے اندر فوجی بغاوت کا جذبہ پیدا ہوا اور منگل پانڈے نامی ایک ہندوستانی سپاہی نے میرٹھ سے بغاوت کا بگل بجا دیا جس نے آہستہ آہستہ ایک ہندوستان گیر بغاوت کی شکل اختیار کرلی۔ ہزاروں لاکھوں ہندوستانیوں کے ساتھ ساتھ اس میں سیکڑوں انگریز بھی مارے گئے۔ لیکن انجام کار یہ ہوا کہ انگریزوں کے دل میں مسلمانوں کے خلاف بدظنی اور غلط فہمی پیدا ہوگئی۔ چونکہ انھوں نے ہندوستان کی حکومت مسلمانوں کے ہاتھ سے چھینی تھی، لہٰذا انھیں یہ خیال آیا کہ اس بغاوت کے پیچھے ضرور بالضرور ہندوستانی مسلمانوں کا ہی ہاتھ ہے اور اس طرح انھوں نے چن چن کر مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ سرسید سے ہندوستانی مسلمانوں کی یہ حالت دیکھی نہ گئی اور آخر کار انھوں نے اس قوم کو انگریزوں کے ظلم وعتاب سے بچانے کی تدبیروں پر غور کیا۔ سب سے پہلے انھوں نے 'اسباب بغاوت ہند' نامی کتاب لکھ کر انگریزوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ 1857 کی بغاوت مسلمانوں کی وجہ سے نہیں بلکہ خود ان کی غلط حکمت عملیوں کا نتیجہ ہے۔ وہ جس ہندوستانی رعایا پر حکومت کرنے آئے ہیں، نہ تو اس کی زبان جانتے ہیں اور نہ ہی ان کے مسائل کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی لیجسلیٹو اسمبلیوں میں ہندوستانی نمائندگان نہیں ہوتے جو کہ ہندوستانی رعایا کے مسائل سے ان کو باخبر کرسکیں۔ لہٰذا اس بغاوت کا قصوروار ہندوستانی مسلمانوں کو ٹھہرانے کے بجائے انگریزوں کو خود اپنے انتظامی امور میں اصلاح کرنے کی ضرورت ہے۔ سرسید کی یہ کوشش آخر کار رنگ لائی اور انگریزوں نے اپنی حکمت عملیوں پر پھر سے غور کرنا شروع کر دیا۔

اس کے بعد سرسید نے اپنی زندگی کا دوسرا مقصد یہ طے کیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو جدید طرز کی اعلیٰ تعلیم پر مائل کر کے ان کو ذلت ورسوائی کے غار سے باہر نکالنا ہے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے علی گڑھ میں کالج کی بنیاد ڈالی اور پھر اپنی تمام زندگی اس کے لیے وقف کر دی۔

علی گڑھ میں کالج قائم کرنے کے لیے انگریزی حکومت سے کیسے زمین حاصل کی گئی اس کا تفصیلی ذکر حالی نے اس سوانح عمری میں کیا ہے جو کہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ ذیل میں اس سلسلے کے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

''جس وسیع میدان میں اب محمڈن کالج علیگڑھ اور اُس کی تمام عمارتیں موجود ہیں کسی زمانہ میں یہ چھاؤنی سے متعلق تھا اور یہاں فوج کی پریٹ (پریڈ) ہوا کرتی تھی مگر اب وہاں چھاؤنی نہیں رہی تھی اور اُس میدان میں سے کچھ قطعات لوگوں کو سرکار سے کوٹھیاں بنانے کے واسطے مل گئے تھے لیکن اب بھی قریب ۱۷۴ ایکڑ کے زمین باقی تھی۔ سرسید نے مدرسہ کے لیے کمیٹی کی طرف سے اُس زمین کے ملنے کی درخواست کی تھی۔ اُس وقت ہنری لارنس علیگڑھ میں کلکٹر تھے انھوں نے اُس قطعہ کے ملنے کی رپورٹ گورنمنٹ میں بھیج دی اور سر ولیم میور نے بھی جو اس زمانہ میں لفٹنٹ گورنر تھے اُس قطعہ کے دینے کا وعدہ کرلیا مگر ابھی وہ قطعہ کمیٹی کو ملنے نہیں پایا تھا کہ مانٹی گیوٹ صاحب علیگڑھ میں قائم مقام کلکٹر ہوگئے۔ انھوں نے اس بات کی سخت مخالفت کی کہ وہ قطعہ کمیٹی کو کالج کے لیے دیا جائے۔ اُن کے بعد جو مسٹر کالون مستقل کلکٹر یٹ و مجسٹریٹ مقرر ہو کر آئے انھوں نے بھی ویسی ہی مخالفت کی اور اس وقت کے تمام یوروپین حکام اُن کے ہم رائے اور ہمزبان ہوگئے یہ ایسی سخت مزاحمت ہوئی تھی کہ بانیانِ کالج اس کے ملنے سے مایوس ہونے لگے تھے اور قریب تھا کہ وہ کالج کا خیال چھوڑ دیں اور تمام کوششیں برباد ہو جائیں۔ مگر خوش قسمتی سے اسی زمانے میں سر جان اسٹریچی جن کا اس کالج پر سب سے زیادہ احسان ہے لفٹنٹ گورنر ہوگئے اور یہ معاملہ ان کے سامنے پیش ہوا۔ وہ خود دورہ کے دونوں میں علیگڑھ آئے اور موقع کو ملاحظہ کیا۔ سرسید بھی بنارس سے علیگڑھ پہنچے اور بہت سی گفت وشنید کے بعد ہز آنر نے یہ فیصلہ کیا کہ زمین کالج بنانے کے لیے کمیٹی کو اس شرط پر دی جائے کہ جو عمارت اُس میں بنائی جائے اُس کے بننے سے پہلے اس کا نقشہ گورنمنٹ کے ملاحظہ کے لیے بھیجا جایا کرے اور اگر بالفرض کبھی کوئی ایسا اتفاق پیش آئے کہ یہ کالج بند ہو جائے تو جس قدر عمارات کمیٹی کی بنائی ہوئی یہاں موجود ہوں گی اُن سب پر سرکار کا قبضہ ہو جائے گا۔ کمیٹی نے یہ دونوں شرطیں منظور کرلیں اور سر جان اسٹریچی نے اس کی منظوری گورنمنٹ ہند سے منگا کر سند عطائے اراضی کمیٹی کو عنایت کی اور حسب ضابطہ قطعۂ مذکورہ پر قبضہ دلایا گیا۔'' [۱]

---

[۱] حیات جاوید، مولانا الطاف حسین حالی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۹، ص ۱۸۷۔۱۸۸

یہ انگریزوں سے دوستی کا نتیجہ ہی تھا کہ سرسید کو اتنی آسانی سے کالج بنانے کے لیے زمین مل گئی ورنہ اس وقت کے حالات کو دیکھتے ہوئے کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی کہ وہ اتنا عالیشان کالج قائم کر پاتا۔ اس کے علاوہ اس وقت کے امراونوابین کے ساتھ بھی سرسید کے مراسم اچھے تھے اور سرسید کی شخصیت نے ان امراونوابین کو کالج کے لیے چندہ دینے پر مجبور کر دیا جس کا نتیجہ آج ہمیں مسلم یونیورسٹی کی شکل میں دیکھنے کو مل رہا ہے۔

کالج کی تعمیر کے لیے پیسہ جمع کرنے کی سرسید نے بہت سی تدبیریں نکالیں، جن کو سن کر بعض دفعہ ہنسی بھی آتی ہے لیکن خود سرسید کو اس طرح کے کام کرنے میں کبھی کوئی شرم نہیں آئی۔ مثال کے طور پر بورڈنگ ہاؤس (ہوسٹل) کی تعمیر کے وقت انھوں نے اخباروں میں اشتہار دینا شروع کیا کہ ایک کمرے کی لاگت اتنی آتی ہے، لہٰذا جو شخص اس پیسہ کالج کو چندہ دے گا، وہ کمرہ اس کے نام سے منسوب کر دیا جائے گا اور کمرہ کے دروازہ پر اس کے نام کی تختی لگائی جائے گی۔ یہی کام انھوں نے بعض عمارتوں کو مختلف ناموں سے منسوب کر کے کیا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ انگریز افسران اور ہندوستانی امراونوابین دل کھول کر چندہ دینے لگے جس سے ان عمارتوں کو بنانے میں کافی مدد ملی۔ ایک دفعہ سرسید نے تیس ہزار روپے کی لاٹری بھی ڈالی اور دوستوں اور دیگر احباب کی مخالفت کے باوجود کہ یہ کام جائز نہیں ہے، سرسید نے دلیل دی کہ 'جہاں ہم اپنی ذات کے لیے ہزاروں ناجائز کام کرتے ہیں وہاں قوم کی بھلائی کے لیے بھی ایک ناجائز کام سہی'۔ کالج کے لیے پیسہ جمع کرنے کے لیے سرسید نے اپنی اور اپنے دوستوں کی کتابیں تک بیچ ڈالیں، اپنی تصویر کی کاپیاں بیچیں، یہاں تک کہ دوستوں کی پارٹیوں میں شریک نہ ہو کر اپنے کھانے پر خرچ ہونے والی رقم کو وصول کر کے کالج فنڈ میں جمع کیا۔

بقول حالیؔ:

> ''چندہ وصول کرنے کے موقع پر انھوں نے کبھی اس بات کا خیال نہیں کیا کہ میں کون ہوں؟ کس سے مانگتا ہوں؟ اور کس طرح مانگتا ہوں؟ نمائش گاہ علیگڑھ میں انھوں نے کتابوں کی دوکان لگائی اور خود کتابیں بیچنے کے لیے دوکان پر بیٹھے۔ نیشنل والنٹیر بن کر گلے میں جھولی ڈالی، پبلی ریڈنگ کا جلسہ کیا

اور اسٹیج پر کھڑے ہو کر غزلیں گائیں۔'' [1]

سرسید نے مسلمانوں کو سب سے زیادہ تعلیم کی طرف راغب کیا اور سیاست سے دور رہنے کی تلقین کی۔ وہ یہ بات بخوبی جانتے تھے کہ اگر مسلمانوں میں تعلیم نہیں ہوگی تو وہ اعلیٰ ملازمتوں پر فائز نہیں ہو پائیں گے اور نہ ہی اپنے حقوق کا مطالبہ کر پانے میں کامیاب ہوں گے۔ اس کے علاوہ کل کو ہندوستان جب انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوگا تو وہی لوگ حلقۂ اقتدار میں شامل ہو سکیں گے جو کہ تعلیم یافتہ ہوں اور سیاسی داؤ پیچ کو اچھی طرح سمجھتے ہوں۔ اس وقت کے سرکاری اعداد و شمار اور دیگر سرکاری فائلوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ علی گڑھ کالج سے فارغ التحصیل طلبہ بڑی تیزی سے سرکاری عہدوں پر فائز ہو رہے تھے۔ یہ سب سرسید کی محنت و کاوش کا ہی نتیجہ تھا کہ برصغیر ہند کے مسلمانوں کی تقدیریں اب بدلنے لگی تھیں۔

یہی کالج اب سرسید کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھا اور اسی کے سہارے وہ جی رہے تھے۔ لیکن 1895 میں سرسید کے ایک ہیڈ کلرک، شام بہاری لال نے کالج کے فنڈ سے ایک لاکھ پانچ ہزار روپے کا غبن کر دیا جس کے نتیجے میں کالج کا سارا تعمیری کام ٹھپ پڑ گیا۔ خود شام بہاری لال پر فالج کا دورہ پڑا اور جیل کی سلاخوں کے پیچھے زہر کھانے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی۔ لیکن سرسید کی حالت بھی اس طرح کے صدموں سے روز بروز بگڑنے لگی۔ کچھ ہی دنوں بعد بڑے بیٹے کی علالت نے انھیں ایک طرح سے توڑ کے رکھ دیا۔ زندگی کے آخری ایام میں سرسید نے بولنا تک ترک کر دیا تھا۔ دوستوں کے اصرار کرنے پر جواب دیا کرتے کہ ''اب وہ وقت قریب ہے کہ ہمیشہ چپ رہنا ہوگا اس لیے خاموش رہنے کی عادت ڈالتا ہوں۔'' اور آخر کار مارچ 1898 کو اس مردِ مجاہد نے ہمیشہ کے لیے خاموشی اختیار کر لی۔ جامع مسجد کی مغرب سمت میں کرکٹ کے میدان میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور جامع مسجد کے احاطے میں سرسید کو دفن کیا گیا۔ حالی نے ان تمام واقعات کو بڑے ہی موثر انداز سے بیان کیا ہے۔

'حیاتِ جاوید' کو اگر اردو کی بہترین سوانح کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ جامع اور مکمل ہے۔ اس میں سرسید کی زندگی سے متعلق تمام جزئیات اور تفصیلات کا بیان ہے۔ اس

[1] حیات جاوید، مولانا الطاف حسین حالی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۹، ص ۱۹۵

میں حالی نے سرسید کے کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کی شخصی زندگی میں بھی کافی دلچسپی دکھائی ہے اور 'انسان' اور 'آدمی' کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن حیاتِ جاوید کے حصۂ اول میں جو اسلوب بیان اختیار کیا گیا ہے اس کی جھلک حصۂ دوم میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ اس حصے میں اندازِ بیان تشریحی اور بعض دفعہ تلقین کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ پھر بھی مجموعی طور پر 'حیات جاوید' ایک مکمل اور جامع اور سوانح نگاری کی ایک بہترین مثال ہے۔

سوانح نگار شبلی 'الغزالی' و 'سوانح مولانا روم' کی روشنی میں

سوانح نگاری میں حالی کے بعد دوسرا نمبر شبلی کا آتا ہے۔ لیکن شبلی کا انداز حالی سے بالکل جداگانہ ہے۔ شبلی کی تاریخی تصانیف کی تعداد بھی کافی زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شبلیات کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے سب سے بڑا متنازع فیہ مسئلہ یہ ہے کہ شبلی کا صحیح مقام سوانح نگاروں میں ہے یا مورخوں میں؟ خیر یہ بحث ہمارے موضوع سے باہر ہے۔ البتہ 'الغزالی' اور 'سوانح مولانا روم' ایسی دو سوانح عمریاں ہیں جن کا سنہ تصنیف 1902 ہے اور جو ہمارے موضوع کے دائرے میں آتی ہیں۔ لہٰذا ہم اپنی گفتگو انہی دونوں سوانح عمریوں تک محدود رکھیں گے۔

سوانح نگاری کے سلسلے میں شبلی نے کئی چیزوں کو اپنا اصول بنایا جن میں سے کچھ کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔ شبلی کی رائے میں خوش اعتقادی سوانح عمری کے محاسن پر پانی پھیر دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص سے آدمی کو عقیدت ہوگی اس کے بارے میں ایمانداری سے لکھنا اور اس کی خوبیوں اور خامیوں پر تبصرہ کرنا نہایت مشکل کام ہوگا۔ اس لیے سوانح لکھتے وقت شبلی نے خوش اعتقادی رکھنے سے منع کیا ہے اور صرف سچائی اور صداقت کو ہاتھ سے تھامے رکھنے کی تلقین کی ہے۔ اس کے علاوہ شبلی کی نظر میں زمانہ قدیم میں لکھی گئی سوانح عمریاں مافوق البشر ہستی کی تصویریں پیش کرتی ہیں جب کہ ایسا ہونا نہیں چاہیے۔ شبلی کی رائے میں سوانح عمری کو پڑھ کے ایسا لگنا چاہیے کہ یہ کسی انسان کی داستان حیات ہے۔ سوانح کے ہیرو کے عادات و خصائل بھی انسان سے ملتے جلتے ہونے چاہئیں اور ان کا بیان کرتے وقت کسی مبالغے سے کام نہیں لینا چاہیے۔ ہیرو کے

معائب ومحاسن کو غیر جانبداری سے بیان کیا جانا چاہیے۔شبلی کے نزدیک سوانح نگاری کا سب سے بڑا مقصد اصلاح اخلاق ہے اوران کے نزدیک یہی طریقہ سب سے زیادہ صحیح اور کامل ہے۔

ان تمام باتوں اور اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے شبلی نے سوانح عمری لکھی۔'الغزالی' امام غزالی کی سوانح ہے۔مولانا شبلی نے اس موضوع کا انتخاب مذہبی اور تاریخی نقطۂ نظر سے کیا۔شبلی کی تمام سوانح عمریوں میں ایک خامی یہ پائی جاتی ہے کہ ان میں انھوں نے زیادہ تر بحث قدیم سوانحی تصانیف کی عمدگی اور خوبیوں پر کی ہے۔'الغزالی' میں بھی بحث کا موضوع یہی ہے کہ کن اثرات نے غزالی کو امام غزالی بنایا۔اس سوانح کو مولانا نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔لیکن اس کا پہلا حصہ جو کہ ذاتی حالات کے بیان پر مشتمل ہے اس کی ضخامت صرف چالیس صفحے ہے۔جب کہ پوری سوانح سوا دو سو صفحات پر مبنی ہے۔ شبلی نے 'الغزالی' میں زیادہ تر بحث حقیقت، فلسفہ اور تصوف سے متعلق کی ہے۔بعض ناقدین 'الغزالی' کو مکمل سوانح نہیں مانتے اور نہ ہی اسے سوانح عمری کے فن کی تکمیل مانتے ہیں۔

'الغزالی' کا ماخذ مولانا شبلی نے کیسے حاصل کیا، اس کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سید شاہ علی یوں رقم طراز ہیں :

> ''مولانا کی سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ الفاروق اور سیرت النبی کے برعکس ان کو اپنی دوسری تصانیف کے لئے عمدہ ماخذ نہیں مل سکے ہیں۔چنانچہ امام غزالی کی بھی کوئی مستقل سوانح عمری نہیں مل سکی ہے بلکہ انھیں رجال اور تراجم کی کتابوں سے جن میں اوروں کے ساتھ غزالی کا بھی ذکر ہے، کام چلانا پڑا ہے۔'' [1]

'الغزالی' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا شبلی نے اسے فلسفہ کو فروغ دینے کے مقصد سے لکھا تھا۔خود شبلی نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔اسی لیے انھوں نے امام غزالی کی تصانیف میں سے صرف ان ہی کتابوں پر توجہ دی ہے جن میں عقلیات کے مباحث ہیں۔اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ فلسفے کے متعلق علما کے درمیان جو بدگمانیاں پھیلی ہوئی تھیں وہ دور ہو جائیں۔

---

[1] اردو میں سوانح نگاری، ڈاکٹر سید شاہ علی، گلڈ پبلشنگ ہاؤس، کراچی، ۱۹۶۱، ص ۱۹۶

'سوانح مولانا روم' اس لحاظ سے بہتر ہے کہ اس میں زبان و بیان کے لحاظ سے اختصار اور پختگی پائی جاتی ہے۔ اس وقت تک شبلی کے اندر سوانح نگاری کا پورا شعور پیدا ہو چکا تھا۔ شبلی نے یہ سوانح حیدر آباد کے قیام کے دوران لکھی۔ سوانح مولانا روم کا بنیادی ماخذ تو خود مولانا روم کی شاعری ہے، اس کے علاوہ شبلی نے مولانا روم کے ایک مرید، سپہ سالار کے ذریعے لکھی گئی مولانا کی سوانح کو بھی اپنا ماخذ بنایا ہے۔ مولانا روم کی زندگی کے تمام واقعات اسی سوانح سے اخذ کیے گئے ہیں۔ لیکن ان تمام تفاصیل کو مولانا شبلی نے اپنے منفرد لب ولہجہ اور انداز بیان میں پرو کر قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس میں شبلی نے مولانا روم کے نام ونسب، ولادت، تعلیم وتربیت، اساتذہ اور مدرسوں، شادی، اولاد اور وفات کے علاوہ ان کے تصوف کی ابتدا و ارتقا، ان کے معاصرین، ارباب صحبت اور اخلاق و عادات کا ذکر اپنے مخصوص لب و لہجے میں کیا ہے۔

'سوانح مولانا روم' کا بڑا مقصد مولانا روم کو حکیم کی حیثیت سے اور ان کی مثنوی کو عقائد اور علم کلام کی حیثیت سے پیش کرنا ہے۔ لیکن سید عبداللہ اس میں بعض خامیاں بھی تلاش کر لیتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :

> ''سپہ سالار نے مولانا روم کی کرامتوں اور خارق عادات واقعات کے ذریعے ان کو ایک مافوق البشر ہستی کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ شبلی نے مواد کی قلت کی وجہ سے سپہ سالار کی روایتوں کو کاٹ چھانٹ کر ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔'' [1]

> ''شبلی یوں تو خوش اعتقادی کے مخالف ہیں مگر سوانح مولانا روم میں بارہا انھوں نے پرانے تذکرہ نگاروں کے عقیدت مندانہ حواشی کو تسلیم کیا ہے۔ بیچو خاں تاتاری کے سپاہیوں کا مولانا کو تاک کر تیر باراں کرنا اور کمانوں کا نہ کھنچ سکنا۔ قونیہ میں مسلسل ۴۰ دن تک زلزلے کا جاری رہنا۔ اسی طرح شمس تبریز کے سلسلے میں بعض عجیب وغریب واقعات۔ ان سب میں شبلی نے ''مشتہرہ'' و روایت پرستی سے کام نہیں لیا۔'' [2]

بقول سید عبداللہ مولانا شبلی چاہتے یہی تھے کہ مولانا روم کے فلسفہ، جذبہ عشق و عاشقی اور تصوف و

---

[1] سرسید اور ان کے نامور رفقا، سید عبداللہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۴، ص ۱۴۷

[2] سرسید اور ان کے نامور رفقا، سید عبداللہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۴، ص ۱۴۷۔۱۴۸

عرفان جیسی خصوصیات کو اجاگر کر کے پیش کیا جائے۔ لہٰذا وہ اس میں پوری طرح کامیاب ہوئے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو سوانح نگاری کے معاملہ میں شبلی کا قد اتنا اونچا نہیں دکھائی دیتا جتنا کہ حالی کا ہے۔

مولوی محمد ذکاءاللہ اور 'سوانح مولوی محمد سمیع اللہ'

شمس العلما مولوی محمد ذکاءاللہ کی پیدائش 1832 میں دہلی میں ہوئی اور تعلیم و تربیت قدیم دہلی کالج میں۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ان کا تقرر اسی دہلی کالج میں ریاضی کے پروفیسر کے طور پر ہو گیا۔ بعد میں کئی اور کالجوں میں عربی اور فارسی کے استاد کے فرائض بھی انجام دیے۔ انتقال 1910 میں ہوا۔

مولوی ذکاءاللہ کا دور کم و بیش وہی ہے جو حالی اور شبلی کا ہے اور آپ کا شمار بھی سرسید کے رفقا میں ہوتا ہے۔ مولوی ذکاءاللہ کے مضامین سرسید کے رسالہ 'تہذیب الاخلاق' میں اکثر و بیشتر چھپا کرتے تھے لیکن چونکہ بنیادی طور پر ان کا موضوع ریاضی تھا اس لیے ان کی بیشتر تحریریں اور تصانیف اسی موضوع پر مبنی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا کچھ کام ترجمے کا بھی ہے۔ سوانح اور تاریخ میں بھی ان کی دو چار کتابیں ملتی ہیں۔ اس کے بارے میں سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ''تاریخ و سوانح کے متعلق مولوی ذکاءاللہ کی اہم تصنیف تاریخ ہندوستان ہے جو دس جلدوں میں ہے۔ اس کے علاوہ آئین قیصری (ملکہ وکٹوریہ کی لائف) اور فرہنگ فرنگ (اہل یورپ کی شائستگی اور تہذیب کا حال) دو کتابیں اور ہیں۔ مولوی سمیع اللہ خاں کی سوانحعمری بھی لکھی ہے۔ آخری عمر میں تاریخ اسلام لکھ رہے تھے کہ وفات پا گئے۔'' [1]

چونکہ ان کا زمانہ حالی اور شبلی کا ہے اور ان دونوں حضرات نے کئی سوانح عمریاں لکھیں، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس وقت اردو میں فن سوانح نگاری کو کافی شہرت و مقبولیت حاصل ہو چکی تھی اور اس کے اصول و ضوابط بھی متعین ہو چکے تھے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولوی محمد ذکاءاللہ نے بھی سوانح نگاری کے ان اصول و ضوابط اور فنی عناصر سے پورا استفادہ کیا ہوگا۔ فی الحال میرے پیش نظر 1909 میں ان کے ذریعے تصنیف

[1] سرسید اور ان کے نامور رفقاء: سید عبداللہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۴، ص ۱۹۶۔ ۱۹۷

کردہ 'سوانح عمری حاجی محمد سمیع اللہ خاں بہادر سی ایم جی' ہے جسے انھوں نے بڑی عرق ریزی سے رقم کیا ہے۔اس کتاب کا صرف ایک قلمی نسخہ پایا جاتا ہے جو کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری کے گوشۂ سرسید میں موجود ہے۔اسے حاصل کرنے میں مجھے کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ یہ کتاب اتنی بوسیدہ حالت میں ہے کہ اس کا نہ تو زیراکس کرایا جاسکتا ہے اور نہ ہی اسے لائبریری سے باہر لے جانے کی اجازت ہے۔لہٰذا مجھے جو کچھ بھی وقت مل سکا میں نے لائبریری کے اندر ہی بیٹھ کر اس سوانح کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی۔

مولوی سمیع اللہ کا شمار سرسید علیہ الرحمہ کے رفقا میں ہوتا ہے۔وہ سرسید کی فکر اور ان کے نظریہ کے ہمیشہ حامی رہے اور ساتھ ہی ان کے افادی نظریے کی تاعمر تبلیغ بھی کرتے رہے۔مولوی ذکاءاللہ کو ان کی سوانح عمری لکھنے کا خیال کیوں پیدا ہوا، اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے دیباچہ میں وہ یوں رقم طراز ہیں :

''یہ ہمارا ضروری فرض ہے کہ حاجی مولوی محمد سمیع اللہ خاں کی گراں بہا سوانح عمری کو آئینہ بنا کے ان کاموں کو دکھائیں جن کی زمانہ حال میں مسلمانوں کو اپنی ترقی، بہبودی، آسودگی و تونگری، آسائش و آرام کے لئے اشد ضرورت ہے۔مولوی صاحب کا مسلمانوں پر یہ بڑا احسان ہے کہ اپنی بزرگ زندگی میں انہوں نے ان نیک کاموں کو کر کے دکھایا ہے کہ جن کی پیروی کرنے سے مسلمانوں کا دنیا اور عقبیٰ میں بھلا ہوگا۔کل ہندوستان میں ایک مسلمان بھی نہیں کہ جس کے نام کے اول مولوی اور حاجی اور آخر میں سی ایم جی لکھا جاتا ہو۔حاجی اور مولوی کو تو سب مسلمان سمجھتے ہیں کہ رما کس شخص کے نام کے ساتھ منسوب کئے جاتے ہیں۔مگر سی ایم جی کو شائد کم لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ حاجی کا ہم قافیہ کیا معنی رکھتا ہے۔اس کا حال یہ ہے کہ وہ ممالک یورپ میں اعلیٰ درجہ کے خطابات میں سے ایک خطاب ہے جو بادشاہ کی طرف سے ان کارپردازان سلطنت کو دیا جاتا ہے جو اسکی مملکت سے باہر کسی ملک میں جا کر بادشاہ اور اپنے ملک کے بزرگ خدمات بجالاتے ہیں۔سرکار نے مولوی صاحب کو مصر کی پولٹیکل خدمات کے لئے جلدوں میں یہ خطاب مرحمت کیا تھا پس جو شخص فقط ان خطابات پر نظر کرے گا وہ سمجھ جائے گا کہ ان کی ذات نیک صفات میں دین و دنیا کی دونوں خوبیاں جمع تھیں۔

وہ دین کے سارے چھوٹے بڑے کام قرآن اور حدیث کو اپنے پیش نظر رکھ کر کرتے تھے۔ فرائض مذہبی کے ادا کرنے میں احکام خدا کی پوری اطاعت ملحوظ رکھتے تھے۔ ان کو دلی نفرت تھی کہ وہ اپنے قدیمی مذہب میں بدعتیں ایجاد کریں۔'' [1]

لہٰذا کتاب کے دیباچہ سے ہی ہمیں مولوی سمیع اللہ کے کردار کی وہ خوشبو بکھرتی ہوئی نظر آنے لگتی ہے جسے منظر عام پر لانے کے لیے سوانح نگار نے ان کی عظیم شخصیت کا انتخاب کیا اور ان کی سوانح لکھنے کا بیڑہ اٹھایا۔ دیباچہ کی زبان سے عہد سرسید کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس دور کے تقریباً ہر قلم کار کا لہجہ اور اسلوب اسی قسم کا ہے، جسے مولوی ذکاءاللہ نے یہاں پر استعمال کیا ہے۔

حاجی محمد سمیع اللہ کی اس پوری سوانح کو ذکاءاللہ نے چودہ ابواب میں تقسیم کیا ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے :

باب اول	:	خاندانی حالات
باب دوم	:	ولادت، طفولیت، اور عام تعلیم وشوق وتصنیفات
باب سوم	:	انسانی ہمدردی، سلوک
باب چہارم	:	ملازمت ووکالت، اور سرکار میں رسوخ
باب پنجم	:	قومی تعلیم اور رفاہ عام کے کاموں سے دلچسپی اور صلح کل مسلک
باب ششم	:	دیہی ریاستوں کی قدردانی
باب ہفتم	:	سیاحت، یورپ
باب ہشتم	:	سیاحت مصر
باب نہم	:	واقعات زمانہ قیام شملہ ودہلی
باب دہم	:	حج وزیارت
باب یازدہم	:	ذاتی خصوصیات، تعلیم اولاد

[1] سوانح عمری حاجی مولوی محمد سمیع اللہ خاں بہادر سی ایم جی: مولوی محمد ذکاءاللہ، ۱۹۰۹، مطبع نورالاسلام حیدرآباد، ص ۱۔۲

باب دوازدہم : استعداد فقہی وقانونی

باب سیزدہم : مختلف واقعات

باب چہاردہم : انجام بخیر

ابواب کی اس تقسیم سے ہمارے ذہن میں مولوی محمد سمیع اللہ کی زندگی کا ایک ہلکا سا نقشہ بن کر تیار ہو جاتا ہے اور پھر اس کتاب کے کسی بھی قاری کے ذہن میں ان ابواب کی تفصیل جاننے کی تمنا پیدا ہوتی ہے۔ جیسے جیسے ہم کتاب کی ورق گردانی کرتے جاتے ہیں، مولوی سمیع اللہ کی پوری زندگی ایک فلمی پردے کی طرح ہماری نظروں کے سامنے سے گزرنے لگتی ہے۔ یہ سوانح نگار کی خوبی ہے کہ انھوں نے تمام حالات زندگی کو ایک ایسے پیرائے میں بیان کیا ہے جس کے اندر زبردست روانی پائی جاتی ہے اور اس کتاب کے مطالعے میں کہیں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ زبان بالکل سادہ اور عام فہم ہے اور اسلوب نگارش بھی نہایت شستہ وسلیس۔ یکے بعد دیگرے تمام واقعات اس طرح بیان کیے گئے ہیں جیسے یہ حقیقی زندگی میں رونما ہوتے ہیں۔ انداز بیان کا یہی فطری پن ہمیں ایک کے بعد دوسری تفصیل جاننے کی طرف راغب کرتا ہے۔

سوانح نگار کا شجرۂ نسب بیان کرتے ہوئے مولوی ذکاء اللہ اس طرح رقم طراز ہیں :

''آپ کا سلسلۂ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہہ خلیفہ چہارم سے چونتیسویں پشت میں مل جاتا ہے۔ آپ کے مورث حضرت بطل غازی دوسری صدی ہجری مطابق نویں صدی عیسوی میں مسلمان حملہ آوروں کے ساتھ عرب سے ہندوستان تشریف لائے تھے۔

سید جلال الدین سرخ بخاری رحمتہ اللہ علیہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے خلفائے کرام سے ایک جلیل القدر خلیفہ تھے۔ آپ کا نسب نامہ نویں پشت میں حضرت امام نقی علیہ السلام سے ملتا ہے۔''[1]

''یہ خاندان سلطنت مغلیہ ہی کے دور میں ذی وقعت، ومرتبت اور رسوخ یافتہ نہیں رہا ہے بلکہ انگریزی عملداری ہونے پر بھی اس خاندان کی وہی عظمت وعزت قائم رہی اور وہی رسوخ واثر

[1] سوانح عمری حاجی مولوی محمد سمیع اللہ خاں بہادر سی ایم جی : مولوی محمد ذکاء اللہ، ۱۹۰۹، مطبع نور الاسلام حیدر آباد، ص ۴

بحال رہا۔" [1]

محمد سمیع اللہ خاں عرف میاں محمود جان 1834 میں منشی حافظ محمد عزیز اللہ خاں کے گھر پیدا ہوئے۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق رسم بسم اللہ کے بعد ان کے لیے قرآن کی تعلیم کا پورا بندوبست کیا گیا اور اس کے لیے ایک استاد مقرر کیا گیا۔ مولوی سمیع اللہ چونکہ بلا کے ذہین تھے اس لیے آٹھ نو سال کی عمر میں ہی ناظرہ ختم کرلیا۔ ان کی آواز اور خوش الحانی کا یہ عالم تھا کہ جب تلاوت کلام پاک کرتے تو سماں بندھ جاتا تھا۔ قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولوی محمد حسین سے فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ چونکہ ان کے خاندان میں علوم شرقیہ کے ساتھ ساتھ قانون کی تعلیم کا بھی چرچا تھا اس لیے محمد سمیع اللہ نے بھی خاندان کی طرز پر تھوڑے ہی عرصہ میں علم قانون پر عبور حاصل کرلیا۔ نومبر 1856 میں انگریزوں کی نگرانی میں وکالت اور منصفی کا امتحان نہایت اعلیٰ نمبرات سے پاس کیا۔ اگست 1858 کو آپ کانپور شہر کے منصف مقرر کیے گئے۔ منصفی کے پیشہ میں آپ اس قدر ماہر تھے کہ رعایا کے ساتھ ساتھ حکام بھی آپ کا لوہا مانتے تھے اور آپ کے ان اوصاف کے قائل تھے۔ مولوی سمیع اللہ نے صدر الصدور کی حیثیت سے علی گڑھ، مراد آباد اور فتح گڑھ جیسے مقامات پر اپنی خدمات انجام دیں اور اپنے حسن انتظام، صداقت، محنت، شرافت کی وجہ سے ہر جگہ ہر دل عزیز رہے۔ آپ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اگر آپ کا تبادلہ ایک جگہ سے دوسری جگہ ہوجاتا تو لوگ غمگین و افسردہ ہوجاتے۔ سوانح نگار نے اس کی مثال علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (سرسید کے ذریعے نکالا جانے والا اخبار) میں یکم اکتوبر 1881 کو شائع ہونے والے ایک مراسلہ سے دی ہے جو کچھ اس طرح ہے :

"22 ستمبر 1881

کل مولوی سمیع اللہ خاں بہادر سب جج نے اپنی عدالت میں اخیر اجلاس فرمایا۔ دو بجے دوپہر کے کل ممبران بار بہ حیثیت مجموعی اجلاس میں آئے، اور اہل عملہ اور اہل مقدمہ کا مجمع عظیم تھا جو اس عالم مولوی کے اخیر دیدار کے لئے جمع ہوئے تھے جنہوں نے اس عرصے میں کہ وہ ہم میں رہے، یکساں انصاف ملا فرق رنگ ذات یا ملت کے کیا تھا۔ اور جنہوں نے اپنے فرائض کو نہایت خردمندی اور علم و

[1] سوانح عمری حاجی مولوی محمد سمیع اللہ خاں بہادر سی ایم جی: مولوی محمد ذکاءاللہ، 1909، مطبع نورالاسلام حیدرآباد، ص ۷

لیاقت سے انجام دیا مگر افسوس یہ جلسہ مثل سچی مفارقت کے جلسوں کے نہایت غمگین تھا، جس وقت یہ جلسہ ہوتا رہا تمام وکلا آب دیدہ تھے، اور خود مولوی صاحب کا دل بہت بھرا ہوا تھا۔ ایک بزرگ وکیل واقعی پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔'' [1]

ہندوستانی مسلمان مولوی سمیع اللہ سے اس قدر محبت اس لیے بھی رکھتے تھے کیوں کہ ان کے دل میں مفلوک الحال قوم کا درد ہمیشہ رہا۔ وہ زندگی بھر مسلمانوں کو ذلت و پستی کے غار سے نکالنے کی کوشش میں لگے رہے۔ اس کے لیے 1862 میں آپ نے دہلی میں ایک عالیشان عربی و فارسی کا مدرسہ قائم کیا اور مولوی نوید الدین خاں کو اس کا رئیس المدرسین بنایا۔ اس کے علاوہ مولوی محمد علی اور مولوی محمد احمد کو بطور مدرس مقرر کیا، لیکن سمیع اللہ صاحب کی مصروفیت اور دہلی سے دور رہنے کی وجہ سے یہ مدرسہ 69-1868 میں بند ہو گیا۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں سے متعلق ذکر کے دوران میں نے اس کا حوالہ دیا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو تعلیم یافتہ بنانے سے متعلق امور پر غور و خوض کرنے کے لیے سرسید نے 1886 میں محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالی تھی بعد میں جس کا نام آگے چل کر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس پڑا۔ اس کانفرنس کا پہلا جلسہ جو علی گڑھ میں منعقد ہوا تھا، اس کی صدارت مولوی سمیع اللہ نے ہی کی تھی۔ اس سے ان کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

سوانح نگار کے مطابق مولوی سمیع اللہ نہایت با اخلاق اور شریف النفس انسان تھے۔ انسانوں سے بے پناہ ہمدردی کا جذبہ رکھتے تھے۔ خاص کر 1857 کے غدر کے وقت مولوی سمیع اللہ نے کئی لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کی۔ اس سلسلے میں مولوی ذکاء اللہ نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

''شورش غدر کے زمانے میں دہلی کے بعض شریفوں پر چھوٹی چھوٹی رقموں کا جرمانہ ہوا، اور اس کے ساتھ یہ بھی حکم سنایا گیا کہ اگر جرمانہ نہ ادا کیا جائے گا تو اس کے بدلے اتنی اتنی مدت کی قید بھگتنی پڑے گی۔ وہ شرفا بچارے اس وقت جرمانہ ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ اور قرض بھی اس زمانے میں نہیں ملتا تھا۔ قریب تھا کہ وہ پا بجولاں کر کے قید خانے بھیج دیئے جائیں گے، مولوی

[1] سوانح عمری حاجی مولوی محمد سمیع اللہ خاں بہادر سی ایم جی : مولوی محمد ذکاء اللہ، ۱۹۰۹، مطبع نور الاسلام حیدر آباد، ۴۵۔۴۶

صاحب کی حمیت کو جوش آیا اور خدا ترسی کا جو مادہ خداوند تعالیٰ نے ان میں ودیعت کیا تھا، اس نے ان کو ان کے بے کسوں کی اعانت پر آمادہ کیا۔ مولوی صاحب نے ان سب لوگوں کی طرف سے جن جن سے انہیں تعارف وشناسائی تھی اپنے پاس سے زر جرمانہ ادا کر کے ان کو زنداں خانہ کی مصیبتیں جھیلنے سے بچالیا۔'' [1]

مولوی سمیع اللہ کو سیاحت کا بھی شوق تھا اور سرسید کی طرح انھوں نے بھی کئی ممالک کا دورہ کیا تھا۔ ان کا ایک سفرنامہ بھی عمدۃ المطابع امروہہ سے 1380ھ میں شائع ہو چکا ہے۔ سیاحت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے اس سفرنامے کے دیباچہ میں مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''سیاحی اور ملکوں کی سیر ایک ایسی عمدہ چیز ہے کہ اسکی ہر زمانہ میں قدر وتعریف ہوتی آئی ہے۔ انسان کی عقل کو روشنی، خیالات کو ترقی، مختلف قسم کے تجربے جیسے اسکے ذریعے حاصل ہو سکتے ہیں ایسے کسی اور چیز سے میری رائے میں حاصل نہیں ہوئے، بلکہ اگر مبالغہ نہ خیال کیا جائے تو زندگی کا لطف ہی یہ ہے، جو آدمی سفر نہیں کرتا اس کی صاف مثال اس گڑھے کے مینڈک کی سی ہے جس کی حکایت کو سب جانتے ہیں، جب تک آدمی سفر نہ کرے اس وقت تک یہ مضمون عمدگی سفر کا ایک خیالی مضمون ہوتا ہے، اور امتناعی طور سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن تجربہ کے بعد بلاشبہ عین الیقین کے درجہ کو پہنچ جاتا ہے۔'' [2]

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مولوی ذکاء اللہ کی یہ کاوش ان معنوں میں بہتر نظر آتی ہے کہ انھوں نے مولوی سمیع اللہ جیسی شخصیت کا انتخاب کیا، جن کے بارے میں دوسرے ذرائع سے زیادہ تفصیل نہیں مل پاتی۔ سرسید کی علی گڑھ تحریک کے حوالے سے یہ سوانح کافی اہم ہے۔ لیکن جہاں تک سوانح کی تکنیک کا تعلق ہے اس لحاظ اسے زیادہ اہم نہیں کہا جا سکتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مولوی ذکاء اللہ کو بطور سوانح نگار اردو ادب میں زیادہ اہمیت نہیں دی گئی اور نہ ہی ان کا ذکر اتنی کثرت سے ملتا ہے جتنا کہ حالی اور شبلی کا۔ بقول سید عبداللہ:

---

[1] سوانح عمری حاجی مولوی محمد سمیع اللہ خاں بہادر سی ایم جی : مولوی محمد ذکاء اللہ، ۱۹۰۹ء، مطبع نور الاسلام حیدر آباد، ص ۲۹۔۳۰

[2] سوانح عمری حاجی مولوی محمد سمیع اللہ خاں بہادر سی ایم جی : مولوی محمد ذکاء اللہ، ۱۹۰۹ء، مطبع نور الاسلام حیدر آباد، ص ۸۷

''...وہ ایک محنتی نثر نگار اور ریاضی دان تھے۔ مگر ان انقلاب انگیز جذبات وافکار سے ان کا دل ودماغ آشنا نہ تھا جن کی بدولت اعلیٰ ادب یا اعلیٰ تاریخ وجود میں آتی۔ ان کی انشا معمولی اور عموماً کاروباری قسم کی ہوتی ہے۔ ان کی نثر برجستگی، زندگی اور شوخی سے محروم ہے۔ مقالات کا بھی یہی عالم ہے۔ ان کی سوانح نگاری بھی عام اور معمولی درجے کی ہے۔ سوانح کے متعلق ان کی کتابیں آئین قیصری اور فرہنگ فرنگ ترجمہ یا تلخیص کی حد سے آگے نہیں بڑھتیں — اور پھر موضوع بھی ایسا ہے کہ اس پر کامیابی کے ساتھ قلم اٹھانے کا حق کسی مغربی قلم کار ہی کو ہوسکتا ہے۔'' [1]

مولوی ذکاءاللہ کے بارے میں یہی عام تصور پایا جاتا ہے۔ اس لیے سوانح نگاری کے تعلق سے صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ علی گڑھ تحریک کے حوالے سے انھوں نے اس تحریک سے وابستہ ایک ایسے شخص کے حالات زندگی قلم بند کیے جو اس کڑی کو جوڑنے میں کارآمد ہوسکتی ہے۔

حبیب اللہ خاں اور 'حیات آفتاب'

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی زندگی 1867 سے 1930 کے عرصے پر محیط ہے۔ ان کا شمار علی گڑھ کالج کے ابتدائی طالب علموں میں ہوتا ہے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے سرسید کے مقصد اعلیٰ کی تکمیل میں کس طرح ان کا ہاتھ بٹایا، اس کے بارے میں علی گڑھ سے وابستہ ہر فرد واقف ہے۔ خود سرسید کے قائم کردہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی تعمیر وترقی میں آفتاب احمد خاں کی بیش بہا خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ ان کے حالات زندگی قلم بند کیے جائیں۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن حبیب اللہ خاں نے اس سلسلے میں پوری محنت ومشقت کے ساتھ کام کرتے ہوئے اس سوانح کو مکمل کیا جو کہ ہر علیگ کے لیے ایک مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سوانح 'حیات آفتاب' کے نام سے منظر عام پر آچکی ہے۔ لیکن کتاب پر سن اشاعت درج نہیں ہے، البتہ 'عرض حال' میں حبیب اللہ خاں نے 5 رمئی 1947ء لکھا ہے، پرنٹر عبدالمجید، اسرار کریمی پریس الہ آباد بھی درج ہے۔ سوانح کے ابتدائی اوراق میں 'عرض حال' کے عنوان سے

[1] سرسید اور ان کے نامور رفقاء: سید عبداللہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۴، ص ۱۹۸

سوانح نگار نے اس بات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ وہ کس طرح اس سوانح کو لکھنے کے لیے آمادہ ہوئے اور اس سلسلے میں انھیں کیا کیا اقدام کرنے پڑے۔ دراصل جس وقت آفتاب احمد خاں کا انتقال ہوا، اس وقت آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے آنریری سکریٹری نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا الحاج محمد حبیب الرحمٰن خاں شیروانی تھے۔ لہٰذا حبیب اللہ خاں نے نواب صاحب کے نام ایک خط 23/جنوری 1930، یعنی آفتاب احمد خاں کی وفات کے پانچ دن بعد لکھا جس میں اس بات کا ذکر کیا کہ مسلم ایجوکیشنل کانفرس کے قیام، ترقی سرمایہ وعمارت میں آفتاب صاحب کی خدمات کو دیکھتے ہوئے یہ ضروری معلوم پڑتا ہے کہ ان کے حالات وکوائف کو یکجا کر دیا جائے اور اس کے لیے یہی وقت موزوں ومناسب ہے کیوں کہ ان کی زندگی سے متعلق تمام مواد اس وقت بآسانی فراہم ہو سکتے ہیں۔ پھر جب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی اور مسعود جنگ بہادر (مسلم یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر) کی اجازت حاصل ہوگئی تو آفتاب صاحب کی سوانح لکھنے کا کام شروع کر دیا گیا۔ اس کے بارے میں حبیب اللہ خاں 'عرض حال' کے عنوان سے خود یوں رقم طراز ہیں :

''صاحبزادہ صاحب نے ۱۸۸۶ء سے جب کہ وہ ایم۔اے۔او۔کالجیٹ اسکول کے طالب علم تھے اپنا روزنامچہ شروع کیا تھا اور یہ سلسلہ باستثنائے چند مجبوری کے وقفوں کے مدت العمر جاری رہا۔ ان ضخیم روزنامچوں کے علاوہ ان کی بہت سی غیر مطبوعہ اردو اور انگریزی کی تحریریں اور یادداشتیں (جو کالج، کانفرنس، یونیورسٹی، مسلم لیگ، کونسل صوبہ متحدہ، انڈیا کونسل لندن، مذہب اسلام، مسلمانوں کی دینی تعلیم، ملک کی عام تعلیم اور اقتصادی اور سیاسی حالات اور ضروریات پر مشتمل ہیں) آفتاب منزل میں موجود تھیں۔ اس ''گنج گراں مایہ'' کو جناب مرحوم کے منجھلے فرزند صاحبزادہ شہزاد احمد خاں نے بڑے بڑے صندوقوں میں محفوظ کر کے ولایت منزل میں پہنچا دیا اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ میٹریل بھیجنے سے قبل بہت سے کاغذات بالخصوص انڈیا کونسل کی اہم اور طویل تحریریں، پبلک اور پرائیوٹ مراسلت کو (جو بجائے خود وقت طلب کام تھا) سلیقہ کے ساتھ مرتب کر دیا چونکہ اس قیمتی ذخیرے سے صاحبزادہ صاحب کی پبلک اور پرائیوٹ زندگی پہ گہری روشنی پڑتی ہے سید معین الدین صاحب نے ہر کاغذ کو محنت اور غور کے ساتھ پڑھا۔ اقتباسات لئے اور ان سے صحیح

واقعات اور نتائج اخذ کر کے دو سال کی مدت میں بڑی تقطیع پر باریک قلم سے خوشخط ۵۰۰ صفحوں کی سبق آموز اور دلچسپ سوانحعمری (حیات آفتاب) مرتب کر دی۔''

لیکن جو سوانح شائع ہو کر منظر عام پر آئی وہ یہ سوانح نہیں تھی جس کا ذکر اوپر کے سطور میں کیا گیا بلکہ یہ 'حیات آفتاب' کا ابتدائی مجموعہ تھا جس میں حبیب اللہ خاں نے بعد میں حذف و اضافہ کیا اور پھر اسے نئے سرے سے مرتب کر کے شائع کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے مولوی سید طفیل احمد، حاجی انوار احمد زبیری اور مولوی نظام الدین حسین نظامی (بدایونی) کی ضروری خدمات حاصل کیں اور اسے موجودہ شکل میں مرتب کر کے شائع کیا۔ پھر اخیر میں اس کا مقصد واضح کرتے ہوئے لکھا کہ:

''خاتمۂ کلام کے مخاطب ملک کے مسلم نوجوان بالخصوص علی گڑھ کے طلبہ ہیں ''حیات آفتاب'' کی تالیف و اشاعت کا مقصد وحید یہ ہے کہ صاحبزادہ صاحب مرحوم کی گراں قدر ملی و ملکی خدمات کا ایک مختصر و صحیح خاکہ پیش ہو جس سے اندازہ ہو سکے کہ قابلیت، دل سوزی، خلوص، ایثار، انہماک اور اخلاقی جرأت کے ساتھ ملک و ملت کی خدمت کس طرح کی جاتی ہے۔ اگر نونہالانِ قوم نے اس اسوۂ حسنہ کی پیروی میں قدم اٹھایا تو خیال کیا جائیگا کہ ہماری ناچیز کوشش و محنت ٹھکانے لگی۔''

لہٰذا یہ وہ تیاریاں تھیں جن کی بنیاد پر 'حیات آفتاب' ترتیب دی گئی اور پھر اسے شائع کر کے منظر عام پر لایا گیا۔ اب آیئے دیکھتے ہیں کہ سوانح کا متن کیا ہے اور اس میں فن سوانح نگاری کے اصول و تکنیک کو کیسے برتا گیا ہے۔

صاحبزادہ آفتاب احمد کی پیدائش 28 رمئی 1867 کو ضلع کرنال (ہریانہ) کے کنج پورہ میں ہوئی۔ ان کے والد نواب غلام احمد خاں کنج پورہ کے فرمانروا خاندان کے ایک رکن تھے۔ دراصل کنج پورہ ریاست کی بنیاد نواب نجابت خاں نے اٹھارویں صدی میں ڈالی تھی۔ وہ ایک کاکڑزئی پٹھان تھے اور کچھ عرصہ تک لاہور اور ملتان میں شاہی صوبہ دار کی فوجی ملازمت میں رہنے کے بعد تین سو سواروں کے ساتھ کرنال پہنچے اور اپنے نام پر نجابت گڑھ کی بنا ڈالی۔ بعد میں اسی نجابت گڑھ کا نام کنج پورہ پڑ گیا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کا تعلق انہی نواب نجابت خاں کی چھٹی پشت سے تھا۔ سوانح نگار نے اس کتاب میں نجابت خاں کی سات پشتوں تک کا

شجرہ پیش کیا ہے۔

آفتاب احمد خاں نے ابتدائی تعلیم کنج پورہ سے ہی حاصل کی۔ قرآن کی تعلیم میاں جی یعقوب صاحب سے پائی، اس کے بعد اسی قصبہ کے ورنیکلر اسکول کی ایک شاخ میں، جہاں پرائمری درجہ تک تعلیم ہوتی تھی داخل ہوئے اور وہاں کی تعلیم ختم کر کے ورنیکلر اسکول کنج پورہ میں پڑھنے لگے۔ اس اسکول میں انھوں نے اردو نصاب کے علاوہ انتخابات گلستاں، بوستاں، سکندر نامہ جیسی فارسی کی کتابیں بھی پڑھیں۔ پرائمری اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے بڑے بھائی صاحبزادہ سلطان احمد خاں کے ساتھ مدرستہ العلوم، علی گڑھ چلے آئے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے سوانح نگار نے لکھا ہے :

> ''صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے بچپن کا وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی طرف سے عموماً نفرت و بدگمانی تھی اگر چہ سرسید احمد خاں کی تعلیمی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا مگر مذہبی حیثیت سے عموماً مسلمان اُن کو اچھا نہ سمجھتے تھے اور پرانے مذہبی خیال کے مسلمان شرفاء اپنے بچوں کو انگریزی پڑھانے یا سرسید کے مدرسہ میں بھیجنے میں تامل کرتے تھے مگر صاحبزادہ صاحب کے والد نہایت دور اندیش، ہوشمند اور تجربہ کار شخص تھے ان کی دوربین نظر نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ بچوں کو کس قسم کی تعلیم کی ضرورت ہے اس لئے انھوں نے عام خیال کی پیروی نہ کی اور کم سنی ہی میں اپنے دونوں بچے علیگڈھ بھیج دئے۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا دونوں بھائی ۲۶/ جون ۱۸۷۸ء کو مدرستہ العلوم علیگڈھ میں داخل ہوئے۔ اس وقت صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی عمر گیارہ سال کی تھی اور کالج کو قائم ہوئے صرف تین سال ہوئے تھے۔ اس وقت یہ دونوں بھائی صرف چار ماہ علی گڈھ میں رہ کر وطن چلے آئے اور ۱۱/ مارچ ۱۸۸۰ء کو دوبارہ علیگڈھ اسکول میں داخل ہوئے اور پھر برابر یہیں تعلیم پاتے رہے۔'' [1]

لیکن علی گڑھ میں تعلیم کے دوران آفتاب احمد بجائے اپنی تعلیم پر توجہ دینے کے اپنا زیادہ تر وقت کالج کی تعمیر و ترقی کے لیے اسکیمیں سوچنے پر لگاتے تھے۔ دوسرے یہ کہ 1887 میں شادی ہو جانے کی وجہ سے وہ

[1] حیات آفتاب، حبیب اللہ خاں، پرنٹر عبدالمجید۔ اسرار کریمی، الہ آباد، ۱۹۴۷ء، ص ۷

کالج چھوڑ کر اکثر گھر چلے آتے۔ والدین نے جب یہ دیکھا کہ آفتاب صاحب اپنی تعلیم پر پوری توجہ نہیں دے رہے ہیں تو اعلیٰ تعلیم کے لیے 1891 میں انھیں انگلستان بھیج دیا جہاں سے انھوں نے بار ایٹ لا کی ڈگری حاصل کی۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد آفتاب صاحب نے بیرسٹری کا پیشہ اختیار کیا اور اس کے لیے علی گڑھ کا انتخاب کیا۔ آفتاب صاحب کے علی گڑھ آجانے سے سرسید کو کافی خوشی ہوئی۔ سرسید کو ان پر ہمیشہ ناز رہا کہ ایک طالب علم کے طور پر انھوں نے علی گڑھ کالج کا نام روشن کیا۔ اس کے علاوہ کالج سے متعلق فکرمندی کو دیکھتے ہوئے بھی سرسید ان پر کافی بھروسہ کرتے تھے۔ لہٰذا 1896 میں آفتاب صاحب کو علی گڑھ کالج کا ٹرسٹی مقرر کر دیا گیا۔ اس کے ایک سال بعد ہی 8 رجنوری 1897 کو صاحبزادہ صاحب کو کالج میں قانون کا پروفیسر بنا دیا گیا اور اس کے لیے ان کی تنخواہ تین سو روپے ماہوار مقرر کی گئی لیکن اس رقم کو بجائے اپنے مصرف میں لانے کے وہ اسے کالج کے ہی مختلف کاموں میں خرچ کر دیا کرتے تھے۔

علی گڑھ میں قیام کے دوران صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ جس کام میں صرف کیا وہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی خدمت تھی۔ دراصل مسلمانوں کی تعلیمی ترقی سے متعلق مسائل پر غور و فکر کرنے کے لیے سرسید نے 1886 میں ایک انجمن قائم کی تھی جس کا نام انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانگریس رکھا تھا جس کا نام بعد میں 'آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس' پڑ گیا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اس کانفرنس سے 41 برسوں تک وابستہ رہے اور سرسید کے اس مشن کو ان کی وفات کے بعد پوری محنت و لگن اور ایمانداری کے ساتھ آگے بڑھایا۔ زمانہ طالب علمی میں اس کانفرنس کا پہلا اجلاس مولوی محمد سمیع اللہ خاں کی صدارت میں 1886 میں ہی علی گڑھ میں منعقد ہوا جس میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے بھی شرکت کی۔ اس اجلاس میں سب سے اہم موضوع جس پر بحث و مباحثہ ہوا وہ یہ تھا کہ ہندوستان میں قرآن مجید کے حافظوں کی تعداد میں روز بروز کمی آتی جا رہی ہے لہٰذا کوئی ایسی تدبیر اختیار کی جائے جس سے اس کمی کو روکا جا سکے۔ سوانح نگار نے اس سلسلے میں آفتاب احمد خاں کے ذریعے کی گئی تقریر کے کچھ اقتباسات کو نہایت اہمیت کے ساتھ رقم کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آفتاب صاحب کی سوچ سرسید کی سوچ سے کس قدر میل کھاتی ہے اور زمانۂ طالب علمی سے ہی مسلمانوں کی تعلیم و ترقی کو لے کر وہ کتنے فکرمند رہا کرتے تھے۔ تقریر

کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں:

''صاحبان یہ جلسہ حقیقتاً وہ جلسہ ہے کہ اگر خدا کے فضل و کرم سے اس کے مقاصد کے پورے ہونے کے عمدہ ذریعے اور وسیلے مہیا ہو گئے تو ہندوستان کے مسلمانوں کو اس بات کا پورا یقین ہو جانا چاہئے کہ وہ وقت اب قریب ہے کہ خدا کے فضل سے ان کی گردش کا زمانہ پلٹا کھائے اور اب پھر اُس زمانہ کے آثار نمودار ہوں جس زمانہ میں تمام روئے زمین پر اسلام کی صدائے اللہ اکبر گونجتی تھی اور جس کی وجہ سے تمام دنیا کی قوموں کے دلوں میں اسلام کی بہت بڑی عزت اور عظمت بیٹھ گئی تھی اور جس کے سنتے ہی مسلمانوں کے سینے جوش سے بھر جاتے تھے۔

صاحبان! میں اس وقت اس تحریک کی تائید کرنے کھڑا ہوا ہوں جو ہماری قوت، ہماری دینی و دنیوی ترقی اور ہماری قوم کی عزت و عظمت کی جڑ ہے۔

قرآن مجید ہی اس شخص کا جس نے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ زبان و دل سے کہا دین و ایمان ہے یہ وہ مقدس اور بے مثل کتاب ہے کہ جس کو غیر قوموں کے لوگ بھی جاننے کی کوشش کرتے ہیں ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ قرآن مجید کو ذہن نشین کرے اور اپنے پاک اور سچے خداوند کے کلام کو دل پر نقش کالحجر کرے کوئی قاعدہ اور کوئی قانون ہمارے واسطے اس سے بڑھ کر عمدہ عمل کرنے کو نہیں ہو سکتا یہ اس ذات پاک کا قانون بنایا ہوا ہے جس کو ہم خدائے ذوالجلال کہتے ہیں اور یہ اس مقدس شخص سے ہم کو پہنچا ہے جس کو رسول اللہ اور خاتم النبیین کہتے ہیں ؎

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

میں اس بات کو دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر قرآن مجید پر پورے طور سے عمل کیا جاوے تو ممکن نہیں کہ مسلمان اس ذلت کے دریا سے خود تیر کر نہ نکل جائیں پہلے زمانہ کے مسلمانوں میں کیا تھا جیسے ہاتھ پاؤں خدا نے ہم کو دئے ہیں ویسے ہی ان کے بھی تھے ان میں کوئی چیز زیادہ تھی تو یہ تھی کہ وہ اپنے اللہ جل جلالہٗ کی مرضی پر مٹے ہوئے تھے۔

ہم کو چاہئے کہ ہم اس مقدس کتاب کے مطالب کو اپنے ذہنوں میں ایسا محفوظ رکھیں کہ ہم کسی وقت اس سے بہک نہ جائیں اور یہ عمدہ طور پر اسی وقت ہوسکتا ہے کہ بجائے کاغذ کے ہم اس کو دل پر لکھیں جو خدا کے فضل سے کبھی مٹ نہیں سکتا اور ہم سے جدا نہیں ہوسکتا اور اس واسطے ہم کو چاہئے کہ جہاں تک ہوسکے اس بات کی کوشش کریں کہ قرآن مجید کے حافظوں کی تعداد جو آج کل دن بدن کم ہوتی جاتی ہے بڑھے۔'' [1]

اس سے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے مذہبی جذبہ کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ سرسید، ان کے رفقا اور پھر علی گڑھ کالج سے تعلیم حاصل کرنے والے افراد کی یہی خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے برصغیر ہند کے مسلمانوں کو سرخروئی کا موقع حاصل ہوا اور وہ ذلت و رسوائی کی قید سے آزاد ہونے میں کامیاب ہو سکے۔ بعد میں 1923 میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر بھی منتخب کیا گیا، جس کی ذمہ داریاں انھوں نے تین سال تک بحسن و خوبی نبھائیں۔ وائس چانسلری سے سبکدوشی کے بعد صاحبزادہ صاحب کی طبیعت زیادہ تر خراب رہنے لگی اور 1928 میں ان پر فالج کا حملہ بھی پڑا۔ یہ بیماری آہستہ آہستہ بھیانک روپ اختیار کرنے لگی اور آخر کار 18 رجنوری 1930 کو صاحبزادہ صاحب کا انتقال ہوگیا۔

جیسا کہ شروع میں ذکر کیا گیا، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی سوانح عمری کو تیار کرنے میں کئی لوگوں کا ہاتھ رہا ہے، اس لیے مجموعی طور پر کسی ایک کو اس کا کریڈٹ نہیں دیا جاسکتا۔ البتہ حبیب اللہ خاں صاحب نے اس کو حتمی شکل دینے اور شائع کرانے میں نمایاں رول ادا کیا اس لیے 'حیات آفتاب' کے مصنف و مرتب کے طور پر ان کا ہی نام درج ہے۔ سوانح نگاری کی تکنیک کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اس کے زیادہ تر اصولوں کو پورا کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ زبان و بیان سادہ اور عام فہم ہے۔ لیکن اس کا مطالعہ کرنے سے سوانح کے بجائے کسی تاریخی کتاب کا مطالعہ کرنے کا گمان ہوتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے اس میں اس زمانے کے سرسید کے رفقا، علی گڑھ سے وابستہ حضرات اور اس زمانے کی ادبی، سماجی اور سیاسی شخصیات کا پورا خاکہ مل جاتا ہے۔ اس کو پڑھ کر اس زمانے کے علی گڑھ اور اس کے اطراف کے علاقوں کی تاریخ تیار کی جاسکتی ہے۔ سوانح کو پڑھنے سے

[1] حیات آفتاب، حبیب اللہ خاں، پرنٹر عبدالمجید۔ اسرار کریمی، الہ آباد، ۱۹۴۷، ص ۹۹۔۱۰۰

آفتاب احمد خاں کی تمام اچھائیوں کا تو علم ہوتا ہے لیکن ان کی خامیوں کا ذکر کہیں نہیں ملتا، اور یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ کسی انسان سے پوری زندگی میں کوئی غلطی ہی سرزد نہ ہوئی ہو۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو 'حیات آفتاب' میں جانبداری سے کام لیا گیا ہے جب کہ سوانح نگاری کا فن اس بات کا متقاضی ہے کہ پوری غیر جانبداری سے سوانح نگار کی زندگی کے اچھے اور برے تمام واقعات کو یکجا کر دیا جائے۔

مولوی محمد امین صاحب زبیری اور 'حیات محسن'

جیسا کہ اس کتاب پر درج ہے، 'حیات محسن' نواب محسن الدولہ محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں منیر نواز جنگ بہادر کی سوانح عمری ہے جسے ریاست بھوپال کے سابق مہتمم تاریخ، مولوی محمد امین صاحب زبیری مارہروی نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے آنریری سکریٹری، نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حاجی محمد حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے ارشاد کے مطابق مرتب کیا۔ 'حیات محسن' مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں 1934 میں طبع ہوئی۔ یہ تمام تفصیلات اس سوانح عمری کے سرورق سے ہی حاصل ہو جاتی ہیں۔

سید مہدی علی، جو نواب محسن الملک کے نام سے مشہور ہیں، کا شمار سرسید کے عزیز ترین دوستوں میں ہوتا ہے۔ محسن الملک کی کوئی قابل ذکر تصنیف نہیں ملتی۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے رسالہ تہذیب الاخلاق میں پے در پے مضامین لکھ کر زبان اردو میں مقالہ نویسی کو مقبول عام بنایا اور اس کا بلند معیار قائم کیا۔

سوانح نگار نے ان کی پیدائش اور خاندان وغیرہ کا ذکر پوری تفصیل سے کیا ہے۔ محسن الملک کی پیدائش اتر پردیش کے اٹاوہ ضلع کے سادات گھرانے میں 9 ردسمبر 1837 کو ہوئی۔ ان کی پیدائش ایک ایسے گھرانے میں ہوئی جہاں تعلیم و تعلم کا کوئی رواج نہ تھا بلکہ چاروں طرف کم علمی اور جہالت کا دور دورہ تھا۔ البتہ محسن الملک کا خاندان جرأت سپاہیانہ، شرافت خاندانی اور نڈر پن کی وجہ سے اس قصبے میں خاصا مشہور تھا۔

نواب محسن الملک کے خاندان کا ذکر کرتے ہوئے سوانح نگار مولوی محمد امین زبیری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ '' آپ کے والد میر ضامن علی اور نانا مولوی محمود علی ایک مشہور عالم تھے اور اسی دولت علم کی بدولت انگریز

عہد حکومت میں صدر الصدور اور دربار ٹونک میں وزارت کی کرسی پر پہنچے۔ نانا کے برکت کے طفیل آپ کی توجہ علم و معرفت کی طرف مبذول ہوئی۔'' اس سے چند سطور قبل ہی سوانح نگار نے یہ لکھا ہے کہ نواب محسن الملک کے خاندان میں تعلیم و تعلم کا کوئی رواج نہ تھا، اور اس کے فوراً بعد یہ کہنا کہ آپ کے والد اور نانا ایک مشہور عالم تھے۔ یہ تضاد سمجھ سے باہر ہے۔

سوانح نگار کے مطابق 1857 کے غدر کے بعد اٹاوہ کے انگریز کلکٹر اور نواب صاحب کے قدیم سرپرست، مسٹر ہیوم نے ان کو اپنا پیش کار بنالیا۔ بعد میں ان کی محنت و لگن اور ایمانداری کو دیکھتے ہوئے ہیوم نے ان کو وہاں کا سررشتہ دار بنا دیا۔ کچھ دنوں بعد سررشتہ داری کے عہدے سے ترقی کرتے ہوئے آپ کو اٹاوہ کا ڈپٹی کلکٹر بنا دیا گیا۔ اسی زمانے میں آپ نے مال اور فوجداری سے متعلق چند رسالے بھی تالیف کیے۔ محسن الملک کی ترغیب پر ہی مسٹر ہیوم اور مسٹر پالک نے اٹاوہ میں جدید سڑکیں اور سرکاری عمارتیں تعمیر کروائیں جن میں شفاخانہ، ہائی اسکول کی عمارت، تحصیل منصفی اور کوتوالی وغیرہ کی شاندار عمارتیں قابل ذکر ہیں۔

1867 میں ہائر اسٹینڈرڈ کا مقابلہ جاتی امتحان امتیازی نمبرات سے پاس کیا اور اس میں اول نمبر پر رہے، جس کی وجہ سے اسی سال محسن الملک کو مرزاپور کا کلکٹر بندوبست مقرر کر دیا گیا۔ آپ نے اپنی خدمات منصبی اتنی کامیابی کے ساتھ انجام دیں کہ مرزاپور کے کلکٹر نے ان کی بابت اپنی سالانہ رپورٹ میں لکھا کہ:

> ''میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مہدی علی سے زیادہ ذہین، مستعد اور ایمان دار ملازم صوبۂ ممالک مغربی و شمالی میں نہیں ہے۔'' [1]

1874 میں محسن الملک نے ڈپٹی کلکٹری کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور حیدرآباد منتقل ہو گئے جہاں انھیں ''مجوز کارروائی'' کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ آپ نے اپنی حکمت، تدبیر اور انتظامی صلاحیت کی وجہ سے اس پورے علاقے کے انتظام و انصرام کو بہتر بنا دیا۔ قحط کے زمانے میں بھی آپ نے اپنی بہترین انتظامی صلاحیتوں کا ثبوت دیتے ہوئے حالات پر قابو پانے میں کامیابی حاصل کی۔

اس زمانے میں قحط سے نمٹنے کا کوئی باقاعدہ انتظام نہیں تھا اور اس قدرتی آفت کی وجہ سے ہزاروں

---

[1] حیات محسن، مرتب محمد امین زبیری مارہروی، مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ، ۱۹۳۴، ص ۶

لاکھوں لوگ جاں بحق ہوتے تھے۔لہٰذا حکومت ہند نے یہ فیصلہ کیا کہ تمام قحط زدہ علاقوں کا دورہ کیا جائے اور تحقیقات کی بنیاد پر آئندہ کے لیے کوئی ایسی حکمت عملی تیار کی جائے جس سے لوگوں کی جان و مال کو تحفظ فراہم کیا جا سکے۔اس کے لیے انگریزی حکومت نے ایک کمیشن قائم کیا۔یہ کمیشن جب حیدرآباد پہنچا تو مولوی مہدی علی (محسن الملک) نے کمیشن کے جوابات نہایت شرح وبسط اور اعلیٰ قابلیت کے ساتھ دیے۔کمیشن کے صدر، سر چارلس ایلیٹ، جو بعد میں بنگال کے لفٹننٹ گورنر بھی ہوئے، نے اپنی رپورٹ میں مولوی مہدی علی کے ان جوابات کی تعریف کی۔اس کے علاوہ اس وقت کے ممتاز اخبارات نے اس رپورٹ پر ناقدانہ تبصرے بھی شائع کیے اور مولوی مہدی علی کے حسن انتظام کی داد دی۔سوانح نگار نے پانیر اور ٹائمز آف انڈیا کے تبصروں کے اقتباسات درج کیے ہیں جو کچھ اس طرح ہیں:

(پانیر)

''ایک دیسی حاکم کے لئے جو حقیقتاً قابل ہو، علاقہ نظام میدان عمل، میدان ترقی ہے، مثلاً مہدی علی ہیں جنہوں نے اس صوبے میں بیس سال کی ملازمت میں اپنے آپ کو محض بندوبست میں ڈپٹی کلکٹری (جنوبی مرزاپور میں) کے قابل پایا۔وہ دکن میں اترے اور ایسی کامیابی حاصل کی کہ حکومت حیدرآباد کے ریونیو سکریٹری ہو کر ایسی رپورٹ شائع کی جو شاید محکمۂ وضع قانون کی آتش رشک کو بھڑکائے گی۔انھوں نے مہربانی کر کے ہم کو دو مضمون بھیجے ہیں۔جن میں سے ایک تو ۷۸-۱۸۷۶ء والے قحط کی تاریخ ہے اور دوسرے میں کمیشن کے سوالات کے جوابات ہیں۔قحط محدود تھا اور 16 صوبوں سے صرف 6 صوبے اثر پذیر ہوئے تھے۔قحط کا مقابلہ بالکل انگریزی اصول پر کیا گیا۔غلّے کی برآمد بند نہیں کی گئی۔نحیفوں کے لئے دارالمساکین اور طاقت والوں کے لئے کارخانے قائم کئے گئے...اس قسم کے واقعات بیان کرنے میں جدت کی گنجائش نہیں ہے لیکن کمیشن کے سوالات کا جوابات دیتے ہوئے سید مہدی علی نے محض قابلیت اور ہوشیاری کا ثبوت دیا۔اس حصے کو سوالات و جوابات کی صورت میں ترتیب دیا گیا اور کہیں کہیں جوابات میں ''جیسا موقع ہو'' کا طرز اختیار کیا گیا ہے لیکن مختصراً یہ کہ امیدوار امتحان میں شان کے ساتھ

کامیاب ہوا ہے۔'' [1]

(ٹائمز آف انڈیا)

''اور مصنفین زیر بحث کے مقابلے میں مولوی مہدی علی سب سے بڑے ہوئے ہیں اور علاقہ حیدرآباد کے قحط کی پچھلی ڈھائی صدی کی تاریخ لٹریری نقطۂ نظر سے اس مضمون میں سب سے زیادہ دلچسپ تصنیف ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے قحط کے سلسلے میں ہندوستان کی سب سے بڑی دیسی ریاست نے کس قدر ترقی کی۔'' [2]

ریاست حیدرآباد کی ملازمت کے دوران ہی سید مہدی علی کو والی ریاست کی طرف سے 'منیر نواز جنگ بہادر' اور نواب محسن الدولہ محسن الملک' جیسے خطابات حاصل ہوئے۔ اس سے ان کی اہمیت، علمیت اور انتظامی امور سے متعلق صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

جہاں تک سرسید سے رشتوں کا تعلق ہے تو محسن الملک ابتدا میں سرسید کے شدید مخالف تھے۔ سرسید نے جب 'تفسیر تبیین الکلام' یعنی توریت اور انجیل کی تفسیر لکھی تو محسن الملک نے اس کی شدید مخالفت کی۔ مذہبی نظریات کے ساتھ ساتھ وہ سرسید کے قومی نظریات کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ لیکن بعد میں سرسید کے عزم مصمم اور قوم کے تئیں پکے سچے جذبے کو دیکھ کر وہ بھی سرسید کے رفقا میں شامل ہو گئے۔ اس کا ذکر سرسید کو لکھے گئے ایک خط میں وہ یوں کرتے ہیں :

''مجھے وہ دن خوب یاد ہے جب میں پہلے پہل علی گڑھ میں ملا تھا اور ہندوستان کے مسلمانوں کی ترقی تعلیم کی نسبت آپ کے خیالات اور ارادوں پر بحث ہوئی تھی، آج اس دن کو قریب قریب پچیس برس ہونے کو آئے یہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اس زمانہ میں میں آپ کا مخالف تھا اور اس تعلیم کے معاملہ میں آپ کے ارادوں کی بلند پروازیاں سن سن کر بہت ہنستا تھا، اس وجہ سے کہ مجھے معلوم تھا کہ جس قوم کی بہبودی اور ترقی کے لئے آپ فکر کر رہے ہیں وہ سستی اور لاپروائی کی مہلک بیماری میں مبتلا ہے۔

---

[1] [2] حیات محسن، مرتب محمد امین زبیری مارہروی، مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ، ۱۹۳۴، ص ۱۸۔۱۹

اس وقت میرا دل یہی کہتا تھا کہ آپ کو ہرگز کامیابی نہ ہو سکے گی، خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ آپ کے مذہبی عقائد کو ہندوستان کے اکثر مسلمان اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سمجھتے تھے مگر چند ہی عرصے میں میرے ان خیالات میں تغیر پیدا ہو گیا۔ اور مجھے یقین ہو گیا کہ آپ کا دل سچے جوش اور ہمدردی سے بھرا ہوا ہے۔ رفتہ رفتہ میرے اعتراضات رفع ہوئے اور میرا دل خود بخود آپ کی طرف مائل ہو گیا۔ اور میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا میں آپ کی مدد کروں گا۔'' [1]

یہ زمانہ 1862 کا تھا جب آپ سرسید کے زمرۂ رفقا میں شامل ہوئے۔ 1864 میں آپ کو سائنٹفک سوسائٹی کا ممبر منتخب کیا گیا اور یہیں سے آپ نے اپنی قومی خدمات کا سلسلہ شروع کیا۔ جن دنوں سرسید لندن میں ہوا کرتے تھے ہندوستان کے اندر ان کے کام کو محسن الملک ہی انجام دیا کرتے تھے کیوں کہ سرسید کو ان سے زیادہ کسی اور پر اتنا اعتماد نہ تھا۔ آپ نے مبسوط مقدمہ کے ساتھ 'خطبات احمدیہ' کی تالیف بھی کی۔ 1870 میں جب سرسید نے رسالہ 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا تو اس میں محسن الملک اور مولوی چراغ علی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور خوب مضامین لکھے۔ لوگ محسن الملک کے مضامین پڑھ کر سر دھنتے تھے۔ سرسید پر جو لوگ نکتہ چینی کرتے تھے ان کے جواب مولوی محسن الملک ایسی دلربا زبان اور ظرافت وفصاحت سے دیتے تھے کہ سرسید کے حریف دنگ رہ جاتے تھے۔ لیکن اس کا منفی اثر یہ ہوا کہ سرسید پر کفر کے فتوے تو صادر ہو ہی چکے تھے اب محسن الملک بھی ملحدانہ خطابات سے بچ نہیں پائے۔

لیکن بعد کے ایام میں سرسید اور محسن الملک میں سخت اختلافات پیدا ہو گئے جس نے عداوت اور دشمنی تک کی شکل اختیار کر لی۔ اس زمانے کے کاغذات کا مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ نواب محسن الملک کو سرسید کے طریق کار پر بہت اعتراض تھا۔ ایک طرف جہاں محسن الملک، سرسید کے اندر اصلاح کی کوشش میں لگے ہوئے تھے وہیں دوسری طرف سرسید ان سے اس قدر متنفر ہو گئے تھے کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ محسن الملک علی گڑھ اسٹیشن پر بھی قدم رکھیں۔ 1892 میں حیدرآباد کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد محسن الملک کی یہی خواہش تھی کہ وہ اپنی بقیہ زندگی علی گڑھ میں رہتے ہوئے قومی خدمات میں لگا دیں لیکن سرسید کے اندر بڑھتی

[1] حیات محسن، مرتب محمد امین زبیری مارہروی، مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ، ۱۹۳۴، ص ۶۳۔۶۴

ہوئی بدگمانیوں کو دیکھتے ہوئے آخر کار انھوں نے علی گڑھ چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا اور بمبئی میں جا کر سکونت اختیار کرلی۔ وہاں سے انھوں نے ''مراۃ الاخبار'' بھی نکالا جس نے بمبئی کے مسلمانوں کی زندگی میں ایک انقلاب برپا کردیا۔

زندگی کے آخری ایام میں طبیعت کافی خراب رہنے لگی۔ گردن، چہرہ، آنکھوں اور پیشانی پر ورم پڑ گیا تھا جس کی وجہ سے آنکھیں اکثر بند رہتیں۔ ایک دن اپنے دوستوں اور ملازموں کو جمع کر کے فرمانے لگے :

> ''مجھے اب زندگی کا اعتبار نہیں ہے۔ آپ سب صاحب گواہ رہیں میں صدق دل سے کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ پڑھتا ہوں۔ میں نے جو کچھ قومی خدمات کی ہیں وہ نیک نیتی کے ساتھ کی ہیں۔ اگر ان میں کوئی غلطی ہو تو میں بے قصور ہوں کیوں کہ میری نیت ہر حال میں نیک تھی، اور خدا میری نیکی کا شاہد ہے۔'' [1]

آخر کار سانسوں نے جواب دے دیا اور بنجولی میں عبدالاحد صاحب کی کوٹھی پر 16/اکتوبر 1907 کو آخری سانس لی، بعد میں لاش کو ٹرین کے ذریعے علی گڑھ لایا گیا جہاں پر مدرستہ العلوم کی جامع مسجد میں نماز جنازہ پڑھائی گئی اور تجہیز و تکفین کے مراسم ادا کیے گئے۔

محمد امین زبیری نے محسن الملک کے سوانحی حالات اور ان کی سیرت و شخصیت پر جامعیت سے روشنی ڈالی ہے۔ مختصر ہونے کے باوجود یہ سوانح عمری اہمیت کی حامل ہے۔

---

[1] حیات محسن، مرتب محمد امین زبیری مارہروی، مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ، ۱۹۳۴، ص ۱۹۳

بابِ پنجم

علی گڑھ میں سفر نامہ نگاری کا ارتقا

(بیسویں صدی کے سفر نامہ نگاروں کے حوالے سے)

سفرنامہ لطیف صنف ادب ہے، زبان وبیان کی چاشنی ولطافت کے ساتھ معلومات میں اضافہ اور منظرکشی اس کے امتیازات ہیں۔ سفرنامہ نگاری ایک خوبصورت تخلیقی تجربہ ہے۔ سفرنامہ سفر کے مشاہدات، کیفیات اور حالات پر مشتمل ہوتا ہے۔ فنی اعتبار سے وہی سفرنامہ زیادہ کامیاب تصور کیا جاتا ہے، جس میں حالات سفر کا بیان جزئیات نگاری کے ساتھ کیا گیا ہو۔ کیونکہ سفرنامہ محض کہیں آنے جانے اور دوران سفر پیش آنے والے واقعات کا بیان نہیں ہے، سفرنامہ تو دراصل روداد سفر، حالات سفر، کیفیات سفر، مشاہدات سفر اور جس ملک، علاقہ اور خطے کا سفر کیا جائے وہاں کے تاریخی، تہذیبی، ثقافتی، سیاسی، سماجی، معاشرتی، اقتصادی اور جغرافیائی مطالعہ اور ان کی روشنی میں سفر کی تفاصیل کو منطقی ترتیب میں قلم بند کیے جانے کا نام سفرنامہ ہے۔ فنی اور معلوماتی اعتبار سے اسی سفرنامہ کو کامیاب کہا جاسکتا ہے جس میں مذکورہ نکات کو ملحوظ نظر رکھا گیا ہوگا۔

سفرنامہ ایک بیانیہ صنف ادب ہے جس میں سفرنامہ نگار دوران سفر یا سفر سے واپسی پر اپنے مشاہدات، تجربات، قلبی واردات اور کیفیات کو رقم کرتا ہے۔

مشرق میں ''سفر وسیلۂ ظفر'' کا تصور قدیم زمانوں سے ملتا ہے۔ سفر یا ہجرت کامیابی کی پہلی سیڑھی کا تصور ہندوستان میں بھی عام ہے۔ اگر کوئی انسان کامیابی اور شہرت چاہتا ہے یا علم کی دولت سے مالا مال ہونا چاہتا ہے تو اسے سفر پر روانہ ہونا چاہیے یا ہجرت پر کیونکہ ''ہجرت میں برکت'' ہے یہ مثل بھی مشرقی خطوں میں کافی مشہور ہے۔

اردو ادب کے ناقد اور مصلح شعر وادب شمس العلما مولانا الطاف حسین حالی نے ''مقدمہ شعر وشاعری''

میں شاعری کی شرائط میں ایک اہم شرط ''مطالعۂ کائنات'' قرار دیا ہے۔ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو یہ ''مطالعہ کائنات'' کا رشتہ کسی نہ کسی طور پر سفر سے جڑ جاتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علم میں اضافے، مشاہدے و تجربے میں پختگی، افکار میں بالیدگی اور معلومات میں وسعت کے لیے سفر ایک ناگزیر عمل ہے۔

مشرق میں سفرنامے کی روایت مغرب کی بہ نسبت قدیم ہے۔ اہل مغرب نے مشرقی نامے سے کسب فیض کیا۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے خیال میں:

> ''مشرق میں سفرنامے کی روایت جو مغرب کے مقابلے میں قدیم تر ہے، دو حوالوں سے سامنے آتی ہے۔ اوّل عربی ادب میں مقامات کی روایت، جس کی ابتدائی صورت ہمیں مقامات حریری (عربی) اور بعد میں مقامات حمیدی (فارسی) میں دکھائی دیتی ہے۔ اس روایت کی تکمیلی صورت بوکاچیو کے ہاں پائی جاتی ہے۔ اس روایت کی اساس خطابت اور کھلنڈرا پن تھا۔''[1]

سفرنامہ کی تکنیکی و فنی تعریف کا تعین ابھی نہیں کیا جا سکا ہے، سفرنامے میں رپورتاژ نگاری، داستان طرازی، ناول نگاری اور خطوط نگاری کا امتزاج نظر آتا ہے۔ اور سفرنامہ نان فکشن ہوتے ہوئے بھی فکشن کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ غفور شاہ قاسم کی نظر میں سفرنامہ کی تعریف اور حدود یہ ہیں:

> ''سفرنامہ واحد نثری صنف اظہار ہے جس کی تکنیکی تعریف کا تعین ابھی تک نہیں ہو سکا۔ اصل میں یہ ایک بیانیہ ہے جس نے داستان طرازی کی ساری ادائیں چرا لی ہیں۔ داستان طرازی فطرت انسانی کا خاصہ ہے، اسی طرح سفر کرنے کی لگن بھی انسان آسمان سے لے کر زمین پر اترا۔ انسان فطرتاً متجسس ہے، نامعلوم چیزوں کو جاننے کا آرزومند رہتا ہے۔ سفرنامہ انسان کے اسی فطری تجسس کا ترجمان ہے۔ کچھ اور جاننا کچھ اور جان لینے کی دھن سوار ہو جانا، دنیا کو کسی نئی بات سے آشنا کرنا۔ نئی بات کر کے دکھانا اور حیرت زدہ کر دینا نوع بشر کی سرشت میں شامل ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ صنف سفرنامہ آج مقبول ترین صنف سخن ہے۔''[2]

---

[1] اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کلاسیک چوک، ریگل (مال) لاہور، دسمبر ۱۹۹۹ء، ص ۶

[2] پاکستانی ادب شناخت کی نصف صدی۔ غفور شاہ قاسم ریز پبلی کیشنز، راولپنڈی، دسمبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۵۷

سفرنامے میں فکشن کی تنظیم، آپ بیتی، رپورتاژ اور قوت متخیّلہ کی بھرپور آمیزش نظر آتی ہے۔ غفور شاہ قاسم کی نظر میں سفرنامہ، خطوط، افسانہ، ناول، رپورتاژ اور داستان کے اسلوب و تکنیک اور رنگ و آہنگ کے امتزاج سے عبارت ہے:

''سفرنامہ ایک ایسی غیر افسانوی صنف ادب ہے جس میں فکشن کی تنظیم، آپ بیتی کی ذاتیت رپورتاژ کی قوت متخیّلہ، انتھراپولوجسٹ کی انسان دوستی، جیالوجسٹ کی وسعت، مورخ کی تحقیقی بصارت، فطرت اور تخلیق کی جولانیاں شامل ہوسکتی ہیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ سفر اور آوارگی میں نمایاں فرق ہوتا ہے، سفر میں منزل متعین ہوتی ہے اور ہر اٹھنے والا قدم منزل سے قریب ہونے کی بشارت دیتا ہے۔ آوارگی میں کوئی منزل متعین نہیں ہوتی قدم اس میں بھی اٹھتے ہیں، جسم تھکن سے چور بھی ہوتا ہے مگر حاصل کچھ نہیں ہوتا۔'' [1]

سفرنامے کے فن پر ڈاکٹر مرزا حامد بیگ یوں رقم طراز ہیں:

''خارج سے متعلق بیانیہ اصناف ادب میں سفرنامہ سرفہرست ہے۔ لیکن شاید سفرنامہ واحد نثری صنف اظہار ہے جس کی تکنیکی تعریف کا تعین تا حال ممکن نہیں ہوسکا۔ کچھ یہی سبب ہے کہ ''سفرنامہ'' کبھی روزنامچے کے رنگ میں لکھا گیا اور کبھی خطوط کی شکل میں۔ اس میں مکالمے کی شمولیت بھی ممکن ہے اور اس میں خبر پہنچانے کے انداز بھی کھپ جاتا ہے۔ پیش منظر کا سفرنامہ اسلوبی سطح پر ''نان فکشن'' رہتے ہوئے بھی فکشن کا انداز اختیار کر گیا ہے۔ البتہ سفرنامے میں پیش آنے والے واقعات فکشن کی طرح ترتیب نو کے متحمل نہیں ہوتے اور جہاں کہیں بھی ایسا کیا گیا ہے سفرنامہ، ناول افسانہ بن گیا ہے۔ سفرنامہ نہیں رہا۔ البتہ سفرنامہ ایک ایسی نان فکشن ضرور ہے جس میں ابتدا، وسط اور اختتامیہ کی تعمیر میں فکشن کی جھلک ملتی ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ سفرنامے میں ابتدا، وسط اور اختتامیہ کی حد تک فکشن کے انداز کی انتخابیت کی اجازت ہے۔'' [2]

مذکورہ تعریف، حدود، فن، تکنیک اور اسلوب کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ سفرنامہ ادب کی ایک مستقل

---

[1] پاکستانی ادب شناخت کی نصف صدی۔ غفور شاہ قاسم، ص ۲۵۸ [2] اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، کلاسیک لاہور، ص ۷

بیانیہ صنف ہے، جس میں خارجی مشاہدے، تجربے، مطالعے کو قوت متخیّلہ پر فوقیت اور برتری حاصل ہے۔ سفرنامے میں مشاہدے و تجربے پر قوت متخیّلہ کی ملمع سازی نہیں کی جاسکتی۔ البتہ سفر سے متعلق ہونے کے سبب سفرنامے میں تحیر، تجسس، تدبر کا عنصر نمایاں ہوتا ہے لیکن ملحوظ نظر رہے کہ مستقل ادبی صنف ہونے کے ناطے سفرنامے کی پیش کش ادبی نوعیت کی ہوگی نہ کہ محض مسافر کا بیان۔ اس لیے بغرض مجبوری سفر اختیار کرنے والے ہر مسافر کی روداد سفر ادب کی ایک مستقل صنف سفرنامہ یا سیاحت نامہ نہیں کہلائے گی۔

سفرنامے کی کوئی متعینہ ہیئت نہیں ہے اور نہ ہی کوئی ایسی سرحد جس میں سفرنامے کو قید کیا جاسکے۔ کبھی کبھی سفرنامہ آپ بیتی، ناول اور افسانے کے دائرے میں بھی داخل ہوجاتا ہے اور کبھی اس میں آپ بیتی کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔ سفرنامے کی اپنی کوئی مخصوص ہیئت نہیں ہے، پھر بھی یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ سفرنامے میں تخیل سے زیادہ خارجی مشاہدے پر زور دیا جاتا ہے۔ بہرحال سفرنامے کی روایت بہت قدیم ہے، دنیا کی قدیم ترین زبانوں میں بھی سفرنامے کے کچھ ایسے نقوش ملتے ہیں جن سے بعض دوسری زبانوں نے رہنمائی حاصل کی۔ دنیا کا سب سے پہلا سفرنامہ نگار یونان کے پیروڈوٹس کو سمجھا جاتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک مورخ تھا جس نے یونان کی تاریخ وثقافت کو اپنی تحریروں کے ذریعے زندگی عطا کی اور دوسرے ممالک کے لوگوں کو یونان کی عظمتوں سے روشناس کرایا۔

اردو میں سفرنامے کی روایت عربی اور فارسی کی عطا کردہ ہے۔ پہلا سفرنامہ اردو کا یوسف خاں کمبل پوش کے ''عجائبات فرنگ'' کو قرار دیا گیا ہے۔ یوسف خاں کمبل پوش کے سفرنامے میں لندن کی داستان ہے اور اس میں وہاں کی طرزِ معاشرت کے علاوہ دیگر تفصیلات کا بیان ملتا ہے۔ اس کے بعد بہت سے سفرنامے لکھے گئے جن سے اردو میں سفرنامے کی روایت کی توسیع ہوئی اور سفرنامے میں کچھ نئے رنگ و نور داخل ہونے لگے۔

علی گڑھ نے بھی سفرنامہ کی روایت کی توسیع وتجدید میں اہم کردار ادا کیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا نام تو خود بانی درس گاہ سرسید احمد خاں کا آتا ہے جنھوں نے ''مسافران لندن'' کے نام سے اپنا سفرنامہ تحریر کیا اور اپنے مشاہدات وتجربات پر مشتمل ایک ایسی کتاب لکھی جس سے نہ صرف لندن کی تہذیب ومعاشرت کا علم

ہوتا ہے بلکہ سرسید کو اس سفر سے ایک نئی روشنی اور نئی تحریک بھی ملی اور لندن کے اس سفر نے نہ صرف ان کے طرز فکر و احساس کو بدلا بلکہ ان کے اندر ایک ایسا شعور و جذبہ پیدا کر دیا جس کی وجہ سے انھوں نے جدید تعلیم پر زور دینا شروع کیا اور انگلستان کے نظام تعلیم کو ہندوستان میں روبہ عمل لانے کی کوشش کی۔ اگر یہ کہا جائے کہ سرسید نے لندن کا سفر نہ کیا ہوتا تو شاید ان کے ذہن میں کیمبرج یونیورسٹی کی طرز پر ایک ایسے ادارے کی تاسیس کا خیال نہ پیدا ہوتا جو جدید تعلیم کا مرکز قرار پائے۔

سرسید کا یہ سفر دراصل ایک بڑی ذہنی تبدیلی کا باعث بنا اور اسی سفر کا رہین منت ہے وہ تعلیمی تصور جس کی بنیاد پر آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسی عظیم دانش گاہ قائم ہے۔ لندن کے اس سفر کی دین رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' بھی ہے جس نے مسلمانوں کے ذہن و فکر کی تبدیلی میں اہم رول ادا کیا۔ بہر حال اس سفر نے سرسید کے ذہن کو بہت سی روشنیوں سے معمور کر دیا۔

سرسید احمد خاں کے اس سفر نامے میں ان کے سوز دروں اور اپنی قوم کے تئیں مکمل طور پر بیداری کا جذبہ نظر آتا ہے۔ انھوں نے یہ سفر بلا مقصد نہیں کیا تھا بلکہ وہاں کے احوال اور وہاں کے نظام کی تفہیم کے لیے کیا اور پھر وہاں کے نظام تعلیم کو ہندوستان میں رائج کرنے کے لیے سوچا۔ سرسید نے سفر نامے میں وہاں کی عمارتوں سے زیادہ علمی احوال و مراکز پر روشنی ڈالی اور ایک طرح سے انگلستان سے تعلیمی سطح پر تحریک حاصل کی۔ ان کا مقصد وہاں کی سیاحت نہیں تھا اور نہ ہی وہاں کی عمارتوں کی تفصیل لینی تھی، بلکہ انگریزوں کی ترقی کا راز معلوم کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید کے اس سفر نامے میں نہ ادبی چاشنی ہے اور نہ ہی بے جا تخیل آرائی بلکہ وہ ٹھوس حقائق ہیں جن کے ذریعے کسی بھی قوم کو ایک نئی روشنی مل سکتی ہے۔ ان کے سفر نامے میں ایسا محسوس نہیں ہوتا جیسے وہ قاری کو لندن کی سیاحت سے محظوظ کرا رہے ہوں بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ قاری کو ایک نئے مشن سے آگاہ کر رہے ہوں۔

سرسید کے اس سفر نامے میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے ذہنی نظام کا موازنہ بھی ہے اور یہ احساس بھی کہ تعلیمی سطح پر انگریز ہندوستانیوں سے بہت آگے ہیں اور ان سے ہندوستانیوں کو روشنی حاصل کرنی چاہیے۔ یہ ایک مقصدی سفر نامہ ہے اور جب یہ سفر نامہ شائع ہوا، تو اس کے خلاف سخت ردعمل متشدد مسلمانوں

کی طرف سے سامنے آیا اور یہ بات مشہور کردی گئی کہ لندن جا کر سرسید احمد خاں ''کرسٹان'' ہوگئے ہیں۔ سرسید جستہ جستہ جو اپنے سفر کے احوال لکھتے تھے۔ وہ شروع میں اخبار ''سائنٹفک سوسائٹی'' میں شائع ہوتے رہے اور پھر بعد میں ''تہذیب الاخلاق'' میں شائع ہوا۔ اسے مکمل طور پر مولوی اسماعیل پانی پتی نے مرتب کیا پھر بھی یہ سفرنامہ مکمل اور مربوط نہیں ہے۔

سرسید کے اس سفرنامے سے بہت ساری حقیقتوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ حالی نے گویا سرسید کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ان کے لندن کے سفر کا ارادہ سیر و سیاحت کی غرض سے نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے قوم کی ترقی کا جذبہ پوشیدہ تھا حالی لکھتے ہیں:

> ''ان کے اصل مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد انگلستان کے طریقہ تعلیم کو دیکھنا اور اس پر غور کرنا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس غرض سے کیمبرج یونیورسٹی کو خود جا کر دیکھا اور بڑی سی بڑی اور چھوٹی سی چھوٹی چیز جو یونیورسٹی سے علاقہ رکھتی تھی غور کی اور اس کا تمام نقشہ ذہن نشین کرلیا۔ پھر ملک کی عام تعلیمی حالت کا اندازہ کیا۔ تعلیم نسواں کو غور سے دیکھا اور اس تعلیم کے مختلف طریقوں میں سے جو طریقہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کے مناسب سمجھا اس کو نگاہ میں رکھا۔'' [1]

اس سفر سے انھیں مادری زبان کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوا اور جسے انھوں نے اپنے سفرنامے میں لکھا۔ دراصل مادری زبان کی اہمیت کا احساس انھیں لندن کے سفر کی وجہ سے ہوا جہاں مادری زبان کی اپنی معنویت اور منطق ہے۔ چنانچہ انھوں نے انگلستان کے نظام تعلیم اور وہاں رائج مادری زبان میں طریقہ تعلیم سے تحریک پا کر یہ لکھا:

> ''پس جو لوگ حقیقت میں ہندوستان کی بھلائی اور ترقی چاہنے والے ہیں، وہ یقین جان لیں کہ ہندوستان کی بھلائی صرف اسی پر منحصر ہے کہ تمام علوم اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک انھیں کی زبان میں ان کو دیے جائیں۔ میری یہ رائے ہندوستان کے ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر نہایت بڑے بڑے حرفوں میں آئندہ زمانہ کی یادگاری کے لیے کھول دیے جائیں۔

---

[1] الطاف حسین حالی، حیات جاوید، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۸۵۸

اگر تمام علوم ہندوستان کی اسی کی زبان میں نہ دیے جائیں گے کبھی ہندوستان کو شائستگی و تربیت کا درجہ نصیب نہیں ہونے کا، یہی سچ ہے، یہی سچ ہے، یہی سچ ہے۔'' [1]

سرسید کے اس سفرنامے میں جہاں انھیں ہندوستانیوں کی کمتری کا احساس ہوا، وہیں انگریزوں کی برتری کا بھی پتہ چلا۔ سرسید احمد خاں کے اس سفر نے ان کے اندر جذبے کی روشنی پیدا کی گویا ان کے ہاتھ میں ایک نئے عزم کی اور ایک نئے مشن کی مشعل تھما دی۔ تہذیب الاخلاق کے اجرا کا فیصلہ بھی اسی سفر کا رہین منت ہے۔ انھوں نے اپنے سفرنامے میں ہندوستانی اور انگریزوں کا تقابل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''میں بلا مبالغہ نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ تمام ہندوستان کو اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک، امیر سے لے کر غریب تک، سوداگر سے لے کر اہل حرفہ تک، عالم فاضل سے لے کر جاہل تک انگریزوں کی تعلیم و تربیت اور شائستگی کے مقابلے میں درحقیقت ایسی ہی نسبت ہے جیسے نہایت لائق اور خوبصورت آدمی کے سامنے نہایت میلے کچیلے وحشی جانور کو قابل تعظیم یا لائق ادب کے سمجھتے ہو؟ کچھ اس کے ساتھ اخلاقی اور بداخلاق کا خیال کرتے ہو؟ ہرگز نہیں کرتے۔ بس ہمارا کچھ حق نہیں ہے (اگرچہ وجہ ہے) کہ انگریز ہم ہندوستانیوں کو ہندوستان میں کیوں نہ وحشی جانور کی طرح سمجھیں۔'' [2]

سرسید کے اس سفرنامے کو موجودہ تنقید کے معیار پر رکھا جائے، تو یقیناً اسے اچھا سفرنامہ نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ اس میں داستان کی سی داستان طرازی یا ناول کی سی فسانہ سازی یا ڈرامہ کی سی منظر کشی نہیں ہے، بلکہ اس میں ایک مقصدیت پنہاں ہے اور قاری کو معلومات کے خزانے سے آگاہ کرنا ہی اس کا مقصود نہیں ہے بلکہ ایک تحریک کو جنم دینا بھی ہے اور باطنی سطح پر پڑھنے والے کے ذہن و احساس کو مرتعش کر کے ایک ایسے مشن سے آگاہ کرنا ہے جس میں قوم کی ترقی کا راز مضمر ہے۔

اسی طرح سرسید کا ''سفرنامہ پنجاب'' بھی ہے، گوکہ یہ تقاریب کا مجموعہ ہے اسے مکمل طور پر سفرنامہ

[1] محمد اسماعیل پانی پتی۔ مسافران لندن، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۱ء، ص ۱۹۷-۱۹۸

[2] محمد اسماعیل پانی پتی۔ مسافران لندن، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۱ء، ص ۱۸۴

نہیں کہا جاسکتا۔ اس کی حیثیت سفرنامے سے زیادہ ایک تاریخی دستاویز کی ہے۔ اس میں سرسید کے وہی خیالات ہیں جو قوم کی تعلیم اور ترقی کے متعلق ہیں۔ اس میں انگریزی تعلیم کی افادیت اور مسلم قوم کی تنزلی کے حوالے سے سرسید کے جذبات وخیالات ہیں، بہرحال چونکہ یہ تقاریر پنجاب میں کی گئی تھیں اس لیے اسے ''سفرنامۂ پنجاب'' کا نام دے دیا گیا ہے۔ اسے باضابطہ طور پر سفرنامے میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ سرسید کے ہاں جو معروضیت اور منطقیت ہے اور تخیل کے بجائے حقیت کی بازآفرینی کا جذبہ موجود ہے، وہی ان کے ہم عصر سفرنامہ نگاروں اور ان کے رفقا کے سفرناموں میں نظر آتا ہے۔ چنانچہ اس دور میں علی گڑھ سے وابستہ سرسید کے معاصرین اور ان کے احباب میں جنھوں نے بھی سفرنامے لکھے اس میں تخیل کی رنگ آمیزی سے زیادہ حقیقت آفرینی اور جذباتیت کے بجائے سنجیدگی اور مقصدیت نمایاں ہے۔

ذیل میں علی گڑھ کے بہت سے سفرناموں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے جنھیں شاید سفرناموں کے معاصر معیار اور مزاج کے اعتبار سے سفرنامہ نہ سمجھا جائے مگر اس طرح کے سفرناموں سے نہ صرف قوم میں بیداری آئی بلکہ ان سفرناموں نے قومی وملی شعور کو مہمیز کیا ہے۔ ان سفرنامہ نگاروں کے پیش نظر اپنی تخلیقی جولانیوں کی نمائش نہیں تھی بلکہ ان حقائق کا اظہار تھا جن سے آگاہ ہوئے بغیر پوری قوم انحطاط کے دلدل میں دھنسی ہوتی اور خواب خرگوش میں محو رہتی۔ یہ سفرنامے انھیں خواب سے بیدار کرنے کا ایک ذریعہ بنے اور ان کے خفتہ ذہنوں وضمیر کے جگانے کا وسیلہ بھی۔

حاجی محمد سمیع اللہ خاں بہادر کے سفرنامے کا نام بھی ''سفرنامہ لندن'' ہے اور اس سفرنامے کا بھی مقصد وہی ہے جو سرسید احمد خاں کے سفرنامے کا۔ یہ سفرنامہ تہذیب الاخلاق کے دو شماروں میں پہلے شائع ہوا اور پھر کتابی شکل میں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ سفرنامہ کی افادیت، اہمیت اور معنویت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ کنور جوالا پرشاد بہادر نے ۱۸۸۲ء میں اس کا انگریزی ترجمہ کر کے کلکتہ سے شائع کیا۔ سرسید کے رفیق کار مولوی سمیع اللہ نے لندن کا یہ سفر انگلستان کی اعلیٰ تعلیمی صورت حال کا جائزہ لینے اور وہاں کی تہذیبی اور سیاسی زندگی کے مطالعہ کرنے کے لیے کیا تھا اور اس کے پیچھے بھی یہی ایک جذبہ کارفرما تھا کہ ہندوستانیوں میں انگلستان کی طرز پر اعلیٰ تعلیم کا شوق پیدا کیا جائے، گویا سرسید احمد خاں اور مولوی سمیع اللہ کے سفرناموں کا

بنیادی مقصد تعلیمی ترقی سے جڑا ہوا تھا۔

سرسید اور مولوی سمیع اللہ نے لندن سے اس سلسلے میں روشنی حاصل کی اور جدید تعلیم کی اہمیت کے پیش نظر لندن کو اپنا محور و مرکز بنایا، تو وہیں شبلی نعمانی نے روم مصر و شام کا ارادہ کیا جو اپنی مشرقیت کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ مگر یہاں بھی شبلی نعمانی نے عیسائیوں کی علمی فتوحات اور مسلمانوں کی تعلیمی تنزلی اور پس ماندگی کا ذکر کیا ہے اور ان کے ذوق علمی کا ذکر کر کے مسلمانوں کی جہالت کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ شبلی نعمانی نے گویا اپنے اس سفرنامے کے ذریعہ سرسید کے تعلیمی مشن کو ایک اور جہت عطا کی۔

کنور عبدالغفور خاں کا ''سفرنامہ عالم'' گو کہ اب دستیاب نہیں ہے لیکن یہ پہلا سفرنامہ ہے جو ۳۴ ملکوں کی سیاحت پر مشتمل ہے۔ زبان و بیان اور مواد کے اعتبار سے انتہائی متاثر کن ہے۔ امریکہ، آسٹریلیا، جرمنی، اسپین تمام ممالک کا نہایت ہی دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کنور صاحب کو زبان و بیان پر مکمل عبور تھا اور ان کے اسلوب میں روانی بھی تھی۔ ان کے سفر کا مقصد بھی شاید مختلف قوموں کی تعلیمی، تہذیبی اور سیاسی صورت حال سے آگہی تھی اور اس آگہی کے ذریعہ وہ بھی ہندوستانی قوم کو بیدار کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ حاجی مولوی محمد اسحاق خاں مائل کے ''سفرنامہ مائل'' اور راحل شروانیہ بنت حاجی محمد عیسیٰ خاں شیروانی، رئیس دتاولی علی گڑھ کی ''زادالسبیل'' اور ''رحلۃ الراحل'' کے سفرنامے کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ یہ سفرنامے حج اور زیارت سے متعلق ہیں۔ اس طرح کا ایک اور سفرنامہ محمد زبیر کا بھی ہے، جس کا نام ہے ''چند دن حجاز میں'' اس میں بھی زبان و بیان کا حسن ہے۔ اسی ضمن میں سید علی نقوی کے سفرنامہ حج کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

انیسویں صدی کے بعد بیسویں صدی کے آغاز سے ہی علی گڑھ میں سفرنامہ نگاری کو ایک نئی جہت ملی اور سفرنامے کے فنی معیار کو ملحوظ رکھتے ہوئے سفرنامے تحریر کیے گئے۔ یہ سفرنامے لندن کے علاوہ دوسرے ممالک اور مراکز سے متعلق تھے، گویا سرسید کے ہاں لندن کو جو مرکزیت حاصل ہے اس مرکزیت سے انحراف کرتے ہوئے دوسرے ممالک کو بھی محور بنایا گیا اور وہاں کی صورت حال کے مشاہدے کے لیے سفر کیے گئے اور پھر سفرناموں کی تشکیل عمل میں آئی۔ پروفیسر ثریا حسین کا سفرنامہ ''پیرس و پارس'' اس اعتبار سے

اہمیت کا حامل ہے کہ انھوں نے بھی سرسید کی طرح مغربی ممالک کے مسائل کا سنجیدگی سے تجزیہ پیش کیا ہے۔ ان کا یہ سفرنامہ فرانس، اٹلی، جرمنی، انگلستان اور ایران کے اسفار کا مجموعہ ہے اور سفرنامے میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ رواں دواں ہے۔ گویا پورا تحرک علی گڑھ کی نسل نے سرسید احمد خاں سے حاصل کیا اور انگلستان کے علاوہ دوسرے ممالک کی سیاحت کر کے وہاں کی تعلیمی اور تہذیبی اور معاشرتی صورت حال کا ایک منظرنامہ پیش کیا۔

حکیم سید ظل الرحمٰن کا ''ایران نامہ'' بھی ایک اہم سفرنامہ ہے، جس کا انداز علمی اور تحقیقی ہے۔ زبان میں وہ روانی نہیں ہے پھر بھی اس سفرنامے کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے ایران جیسے ملک کی عمارتوں کے علاوہ وہاں کی سماجی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ سفرنامے نے آہستہ آہستہ علی گڑھ کے ارباب اہل علم کو متاثر کیا اور ان لوگوں نے اردو سفرنامہ نگاری کی روایت کی توسیع میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ اس طرح سفرنامہ نگاری کے باب میں علی گڑھ نے اپنے امتیازی نقوش مرتسم کیے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ اساتذہ نے بہت سے ملکوں کے اسفار کیے اور سفرنامہ نگاری کی نئی تکنیک سے سفرنامہ لکھ کر اسے ایک نئی جہت سے بھی آشنا کیا۔

ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی کا سفرنامہ ''مشاہدات حرمین'' بھی اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس کی زبان میں صفائی ستھرائی کے ساتھ منظرکشی کا حسن بھی ہے گو کہ یہ سفرنامۂ حج ہے مگر اس میں ادبیت ہے اس لیے سفرنامے کا جو فنی معیار ہے اس پر یہ پورا اترتا ہے۔

عبیداللہ فہد فلاحی کا سفرنامہ ''دیوار چین کے سائے میں'' بھی ایک قابل ذکر سفرنامہ ہے کہ اس سے ایک ایسے ملک کے طرز فکر اور طرز احساس سے آشنائی ہوتی ہے جو کمیونزم کا مرکز و محور ہے اور جہاں کی سیاست بہت سے ملکوں کے سیاسی نظام کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اسی طرح منظر عباس نقوی کا سفرنامہ ''ذوق نظر'' بھی کیا خوب ہے۔ منظر عباس نقوی چونکہ ادیب و نقاد ہیں اور ان کے ہاں مشاہدے کی تیزی بھی ہے اور زبان و بیان پر عبور بھی، اس لیے انھوں نے خوبصورت منظرنگاری کی ہے۔

ایران نامہ: حکیم سیّد ظل الرحمٰن

پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن کی شخصیت طب وحکمت کے حوالے سے محتاج تعارف نہیں ہے۔ انھوں نے طب یونانی کے میدان میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ طبی دنیا میں قدر کی نگار سے دیکھی جاتی ہیں۔ رسالہ جودیہ کی ترتیب وتدوین اور دیگر طبی مخطوطات کی تحقیق وتدوین ان کے کارہائے نمایاں ہیں۔ ان کا طب کے علاوہ ادب سے بھی گہرا رشتہ ہے اور ان کی تحریر سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ادبیات پر ان کی نظر گہری ہے۔ طبیہ کالج میگزین کا ''شیخ الرئیس'' نمبر ان کی محنت کا مظہر ہے اور ابن سینا اکیڈمی علی گڑھ میں قائم کر کے انھوں نے ایک ایسی مثال قائم کی ہے جس سے دوسرے لوگ بھی روشنی حاصل کر سکتے ہیں۔

''ایران نامہ'' ان کا ایک بیش قیمت سفر نامہ ہے اور اس میں ان کے دو سفر ناموں کی مکمل روداد ہے۔ ۱۹۹۲-۱۹۹۵ء کیے گئے ایران کے اسفار کی یہ سرگذشت ہے جس سے ایران سے متعلق ادبی تاریخی اور دوسری حیثیتوں سے آگاہی کے ساتھ ساتھ وہاں کے اہم مضافات تاریخی عمارتیں طبی ادارے اور وہاں کے اہم شعرا، ادبا، علما، فضلا سے شناسائی ہوتی ہے۔

یوں تو انگلستان کے بعد سب سے زیادہ سفر نامے میں اردو میں ایران ہی سے متعلق لکھے گئے ہیں جن میں محمد حسین آزاد کا سفر نامہ ''سیر ایران'' (۱۸۸۶) شجاع منامی کا سفر نامہ ''ایران'' (۱۹۳۷)، محمد باقر کا ''چھ مہینے ایران میں'' (۱۹۶۱)، سید وجاہت علی کا ''جب میں نے شاہ کا ایران دیکھا'' (۱۹۷۰) مرزا مقبول بیگ درخشانی کا ''سرزمین حافظ وخیام'' (۱۹۷۹)، محمد عباس قمر زیدی کا ''پانچ مہینے خمینی کے دیش میں'' (۱۹۷۹)، افضل علوی کا ''دیکھ لیا ایران'' (۱۹۸۳)، اسعد گیلانی کا ''سفر نامہ ایران'' (۱۹۸۳)، شعیب اعظمی کا ''صحبت یار آخر شد'' (۱۹۸۷) جیسے قابل ذکر سفر نامے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے سفر نامے ایران سے متعلق لکھے گئے ہیں مگر ''ایران نامہ'' کی خوبی یہ ہے کہ اس میں صرف مشاہدات نہیں ہیں بلکہ تحقیقات بھی ہیں۔ پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن نے جن مقامات اور فضلا کا ذکر کیا ہے ان کے بارے میں پوری تفصیل بھی درج کی ہے۔ اس سفر نامے میں دو خاص مقامات ہیں جن کا نہایت تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں ایک خراسان ہے

اور دوسرا شیراز۔ خراسان کا صوبہ اس اعتبار سے مشہور ہے کہ اسی صوبے میں ''مشہد'' جیسا شہر بھی ہے اور ''بلخ'' جیسا شہر بھی۔ ''مشہد'' زیارت اہل تشیع ہے تو ''بلخ'' اپنے آتش خانے کی وجہ سے مشہور ہے۔ اور اسی خراسان میں نیشاپور بھی ہے جہاں سے مشہور شاعر نظیری کا تعلق ہے، یہیں بایزید بسطامی کا مزار ہے یہیں عطار کا اور عمر خیام کا مسکن ہے۔ اور یہیں شہر طوس بھی ہے جو فارسی کے سب سے بڑے شاعر فردوسی کی آرام گاہ ہے۔ اور یہیں امام غزالی کی قبر بھی ہے اور یہیں نظام الملک بھی مدفون ہیں۔ پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن نے صوبہ خراسان کے حوالے سے ساری تفصیلات درج کی ہیں۔ آرام گاہ خیام، آرام گاہ عطار، مسجد گوہر شاد اور دیگر اہم مقامات کے حوالے سے انھوں نے نہایت ہی تحقیقی انداز میں لکھا ہے اور گویا سفرنامے کی عام روش اور روایت سے ہٹ کر انھوں نے وہ تمام تحقیقات بھی درج کر دی ہیں جو مشاہدے نہیں بلکہ مطالعے کا ثمرہ ہوتی ہیں۔ آرام گاہ خیام کے تحت لکھتے ہیں:

> ''آرام گاہ عمر خیام عطار کے مقبرہ سے زیادہ دور نہیں ہے۔ حکیم ابوالفتح عمر خیام پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں سلجوقی عہد کا مشہور فلسفی اور ریاضی داں تھا۔ ۵۱۷-۱۱۲۳ء میں ۷۰ برس سے اوپر عمر پا کر فوت ہوا۔
>
> عمر خیام نیشاپوری خاندان سے تھا۔ صاحبان نظر نے تمام علوم حکمت وفلسفہ میں مہارت کے سبب اسے یگانہ عصر اور ہم مرتبہ ابن سینا لکھا ہے۔ مگر اس کے بارے میں ملتا ہے کہ علم وفضل کے باوجود بہت بدخلق، بدمزاج اور بخیل تھا۔ اپنے تلامذہ اور مستفیدین سے مہربانی اور شفقت سے پیش نہیں آتا تھا۔ تصنیف وتالیف اور افادہ ودرس میں بھی بخل سے کام لیتا تھا۔ چنانچہ طبعیات میں ایک مختصر کتاب، وجود کے مسئلہ میں ایک رسالہ اور ''کون وفساد'' پر ایک رسالہ کے سوا اس کی کوئی یادگار نہیں ہے۔ قوت حافظہ اور تیز فہمی کا یہ عالم تھا کہ ایک بہت ضخیم کتاب جس کا اصفہان میں اس نے سات مرتبہ مطالعہ کیا تھا، نیشاپور میں آ کر اپنے حافظہ سے طلبہ کو نقل کرا دی تھی۔ مقابلہ پر زیادہ فرق نہیں نکلا۔ علم عقلیہ کے ساتھ علوم نقلیہ میں بھی مہارت تھی اور لغت، فقہ اور تاریخ میں بے مثل سمجھا جاتا تھا۔ ملک شاہ سلجوقی نے دوسرے ماہرین کے ساتھ اسے ۴۶۷-۱۰۷۴ء میں ایرانی تقویم کی

اصلاح کے لیے مقرر کیا تھا۔'' [1]

اسی طرح انھوں نے آرام گاہ فردوسی کے حوالے سے لکھا ہے:

''مشاہیر ایران میں کسی کی آرام گاہ فردوسی سے زیادہ شان دار نہیں ہے۔ بہت وسیع و عریض رقبہ تقریباً ۶ ہیکٹر حدود میں پھیلا ہوا، آرام گاہ کے سامنے خوبصورت فوارے اور شان دار مجسمہ ہے۔ بلند مقبرے پر فردوسی کے اشعار کندہ ہیں۔ سب سے اوپر ہخامنشی دور کے ریگورایت کی شبیہ بنی ہوئی ہے۔ نیچے قبر اور اوپر بہت بلند سنگ مرمر کی عمارت ہے۔ بالائی عمارت پر شاہنامہ کا ابتدائی حصہ کندہ ہے۔ ایک شعر میں کہا ہے کہ ہر وہ شخص جو مذہب کو عزیز رکھتا ہے اسے چاہیے کہ میری قبر پر فاتحہ پڑھے۔ ہم لوگوں نے بھی فاتحہ پڑھ کر اس کی روح کو ایصال ثواب کیا۔

مقبرہ کی اندرونی دیواروں پر، داریوش اور ساسانی عہد کے دوسرے بادشاہوں کے مجسمے سنگ تراشی کا اچھا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ جنگ رستم با اژدہا، سیمرغ، زن جادوگر، جنگ رستم با دیو سفید، نوشیرواں وغیرہ کی سنگ تراشی سے شاہنامہ کے مختلف مناظر کو خوبصورتی سے نمایاں کیا گیا ہے۔ مقبرہ میں کاشی کاری کا کام بہت عمدہ ہے۔ رنگا رنگ کاشی ہائی سفید، لاجوردی و فیروزی سے مزین اور چشم نواز۔ اس کے ذریعہ شاہان عجم کی تاریخ اور خاص طور پر ہخامنشی عصر سامنے آتا ہے۔ دیواروں کی تزئین میں فردوسی کے ابیات سے بھی کام لیا گیا ہے۔ آرام گاہ کی ہر چیز میں حسن و نفاست ہے۔ اس کے حدود میں تقریباً ایک ہزار برس پرانی دیوار شہر محفوظ ہے۔ دیوار کے آثار دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ فردوسی کا جنازہ جس دروازہ سے نکلا تھا اسے باب رزاں کہتے ہیں (رز بمعنی انگور) یہ ایک بڑے چوڑے راستہ کی شکل میں باقی ہے۔'' [2]

دوسری جگہ جس کا ذکر خاص طور پر انھوں نے بڑی والہانہ عقیدت اور سرشاری کے ساتھ کیا ہے۔ وہ مقام شیراز ہے، جس کا ذکر فارسی ادب میں بکثرت ملتا ہے۔ شیراز بہت ہی معروف اور ممتاز شہر ہے اور ہندوستان

[1] ایران نامہ۔ پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن، طباعت لیتھو کلر پرنٹرس، علی گڑھ، ۱۹۹۸، ص ۳۸

[2] ایران نامہ۔ پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن، طباعت لیتھو کلر پرنٹرس، علی گڑھ، ۱۹۹۸، ص ۶۶-۶۵

میں اس حوالے سے مشہور ہے کہ ''گلستاں'' اور ''بوستاں'' کے خالق شیخ سعدی شیرازی اور حافظ شیرازی کا مولد ومدفن یہی شہر ہے۔ مصنف نے شیراز کا ذکر کرتے ہوئے جو طرز تحریر اختیار کیا ہے اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے حافظ شیرازی اور شیخ سعدی کی روح ان میں تحلیل کر گئی ہے۔ پوری نثر شاعری میں ڈھل گئی ہے۔ لکھتے ہیں:

''شیراز طلسم وخواب کا شہر ہے۔ علم وفن اور شعر ونغمہ کا شہر ہے۔ اس کے نام میں ایسی غنائیت، ایسی دلکشی اور ایسی رعنائی ہے جو کسی دوسرے شہر کے نام سے پیدا نہیں ہوتی۔ حافظ وسعدی کی سرزمین شاعروں اور ادیبوں کا گہوارہ علما ومشائخ کا مسکن، طبیبوں اور ہنرمندوں کا مرکز۔'' [1]

شیخ سعدی کے تعلق سے انھوں نے بہت تفصیل سے لکھتے ہوئے ان کی شیریں کلامی اور ناصحانہ حکمت آمیز اشعار پر روشنی ڈالی ہے۔ شیخ سعدی شیرازی کے مقبرے کی تفصیل بھی وہ بہت ہی والہانہ انداز میں لکھتے ہیں:

''ہم لوگوں نے پہلے مزار سعدی پر حاضری دی۔ مزار سے پہلے چہار راہ سعدی پر دور سے اس کا مجسمہ نظر آتا ہے۔ سعدی کا مقبرہ بہت خوبصورت ہے۔ شہر کے ایک کنارہ سعدیہ اور دوسرے کنارے کنارہ حافظیہ ہے۔ دونوں شاعروں نے شہر کو اپنے دامن میں اس طرح سمیٹ رکھا ہے کہ پوری فضا میں حسن وجمال، رنگ وشفق اور ساز وآہنگ جلوہ طراز ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

عقل وفہم شاعراں در عجز وحیرت آورند　　سعدی معجز بیان و حافظ سحر آگین

سعدی کے مزار پر شاندار گنبد ہے۔ گلستاں، بوستاں، طیبات اور بدائع کے اشعار آرام گاہ کی دیواروں پر لکھے ہوئے ہیں۔ انھیں خطاطی کے فن پارے قرار دیا جا سکتا ہے۔ مزار کے ٹھیک اوپر قیمتی فانوس آویزاں ہے:

ز خاک سعدی شیراز بوی عشق آید　　ہزار سال پس از مرگ اوگرمش بوئی [2]

اسی طرح حافظ شیرازی کے مزار پر پہنچتے ہیں تو ان کے دل اور ذہن کی دنیا بدل جاتی ہے اور وہ گویا حافظ کے لہجے میں ہی گفتگو کرنے لگتے ہیں۔ مزار حافظ کے عنوان سے حافظ کی پوری شخصیت کا نقشہ کچھ اس

---

[1] حکیم سید ظل الرحمٰن حیات وخدمات۔ مرتبین ڈاکٹر سید حسن عباس، ڈاکٹر عبداللطیف، مرکز تحقیقات اردو وفارسی، گوپال پور باقر گنج، سیوان، بہار، ۲۰۰۵ء، ص ۲۱۲

[2] ایران نامہ۔ حکیم ظل الرحمٰن، ص ۱۰۹

طرح کھینچتے ہیں کہ جیسے مزار حافظ پر نہ ہوں بلکہ خود حافظ شیرازی سے محو گفتگو ہوں:

''مزار حافظ پر پہنچ کر عجیب کیفیت مسرت اور سرشاری کی پیدا ہوئی۔ پورا احاطہ پرنور اور دلکش ہے۔ حافظ کا یہ شعر حسب حال تھا:

بگرد مرقد حافظ کہ کعبہ سخن است　　در آمدیم بعزم طواف در پرواز

''حافظ کے مقبرہ کے گرد جو کہ کعبہ سخن ہے، طواف کے ارادہ سے ہم نے اڑنا شروع کیا۔''

حکیم صاحب جن کے ہاں ظاہری نمود اور نمائشی جذبات نہیں، لیکن جذبہ کی گرمی، سوز دروں اور شوق بے پایاں موجود ہے، مزار حافظ پر بے خود ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ اوصاف صاحب حافظ کے اشعار سے حظ اٹھاتے رہے، مسرت وشادمانی ان کے چہرہ سے نمایاں تھی۔ عبدالودود اظہر اتنی بار ایران آچکے ہیں کہ خود ایرانی فضلا کے بقول وہ ایران ہی کے فارسی استاد معلوم ہوتے ہیں، ماحول کی رنگینی میں کھوئے ہوئے تھے۔

مزار کا خوبصورت گنبد حافظ کے اشعار سے مزین ہے۔ دیواروں پر بھی اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ آرامگاہ میں داخل ہوتے ہی خوبصورت سنگ ریزوں سے مرصع حافظ کا یہ شعر خوب ہے:

برسر تربت ماچوں گزری ہمت خواہ　　کہ زیارت گہ رندان جہان خواہد بود

آرام گاہ کی سنگ مرمر کی لوح کے درمیان میں حافظ کی یہ غزل کندہ ہے:

مژدہ وصل تو کو کز سرجان بر خیزم　　طائر قدسم و ازدام جہان بر خیزم

بولائے تو کہ گر بندہ خویشم خوانی　　از سر خواجگی کون و مکاں بر خیزم

یارب از ابر ہدایت برسان بارانی　　پیشتر زانکہ چو گردی ز میان بر خیزم

بر سر تربت من بامے و مطرب بنشین　　تا بہ بویت ز لحد رقص کناں بر خیزم

خیزد بالا بنمای بت شیریں حرکات　　کز سر جان و جہان دست فشان بر خیزم

گرچہ پیرم شبے تنگ در آغوش گیر　　تا سحر گہ ز کنار تو جوان بر خیزم

روز مرگم نفسی مہلت دیدار بدہ　　تا چو حافظ از سرجان و جوان بر خیزم

ان دو مقامات کے علاوہ اس سفرنامے میں تہران، قم، اصفہان اور قرمان شاہ جیسے مقامات کا بھی ذکر ہے۔ یہ سارے وہ شہر ہیں جن کی اہمیت مسلم ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کی نظر میں ان کی بڑی اہمیت ہے۔ ان مقامات سے مسلمانان ہند کی ذہنی وابستگی بھی رہی ہے۔ فارسی ادبیات پر ان کی نظر بہت گہری رہی ہے۔ اس لیے وہاں کے شعرا کے حوالے سے انھوں نے طول کلامی کا بھی ثبوت دیا ہے۔

پروفیسر سید حکیم ظل الرحمٰن چونکہ طب یونانی کے ماہر ہیں اور ایران کا علاقہ طب یونانی کے نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے اپنے سفرنامے میں ان جڑی بوٹیوں کا ذکر بھی کیا ہے جو ایران میں موجود ہیں اور ان کی طبی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی ہے اور یوں بھی ایران میں نباتی دواؤں سے دلچسپی اور نباتی علاج کا نظام بھی رائج ہے ایک ادارہ ''گیاہ شناسی'' کا بھی قائم ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے طب یونانی کے تعلق سے ایران کافی بیدار ہے۔

ایران میں طب یونانی کا تعارف اور اس کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں امکانات کے جائزے کے ساتھ ساتھ یونانی ادویات وادبیات کے ذخائر کی جستجو کے پیش نظر جو سفر کیا گیا تھا وہ انتہائی کامیاب ثابت ہوا اور پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن کے اس سفرنامے کی وجہ سے قارئین کو نہ صرف ادویات سے آگہی حاصل ہوئی بلکہ ادبیات سے بھی آشنائی حاصل ہوئی۔ بہرحال یہ سفرنامہ ایران شناسی میں ایک اہم اضافہ ہے اور اسے ایک علمی سفرنامے کی حیثیت سے یاد رکھا جائے گا۔

لندن میں دو دن: پروفیسر مختار الدین احمد آرزو

پروفیسر مختار الدین احمد ماہر غالبیات اور محقق کی حیثیت سے عالمی سطح پر اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ تحقیق وتدوین کے میدان میں ان کے کارہائے نمایاں سے اہل نظر بخوبی واقف ہیں۔ وہ بنیادی طور پر عربی زبان وادب سے وابستہ رہے ہیں مگر اردو ادب میں بھی ان کی خدمات مسلّم ہیں۔ بعض ایسے قدیم مخطوطات کی جستجو انھوں نے کی جو اردو تحقیق میں ایک مثال قرار پائی۔ پروفیسر مختار الدین نے مختلف ممالک کے اسفار کیے اور وہاں کی معاشرتی ثقافتی معنویت کے حوالے سے لکھا بھی۔ انھوں نے عرب ممالک کے دورے کیے اور وہاں

بہت سے علما، فضلا، ادبا سے ان کی ملاقاتیں رہیں اور علمی ادبی اداروں میں ان کو جانے کا موقع بھی ملا، وہاں کی علمی، ادبی اور تحقیقی سرگرمیوں کو جاننے کے مواقع بھی ملے۔ انھوں نے باضابطہ کوئی سفرنامہ نہیں لکھا، مگر یادداشت کے طور پر ان کے بعض سفرنامے مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں جن میں مصر اور دیگر ممالک کے سفرنامے قابل ذکر ہیں۔ مصر میں احمد امین سے ملاقات کا ذکر ہو یا لندن میں وہاں کی شخصیات سے، ان کا انداز ہمیشہ تحقیقی اور معلوماتی رہا ہے۔ ان کی تحریر میں بڑی شگفتگی ہوتی ہے اور ساتھ میں معروضیت اور منطقیت کو بھی وہ بالائے طاق نہیں رکھتے۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنی تحریروں کے ذریعے قارئین کی معلومات میں اضافہ کریں۔ ''لندن میں دو دن'' ان کا مختصر سفرنامہ ہے، جس میں انھوں نے قیام لندن کے بارے میں تفصیلات اور وہاں کی کچھ اہم شخصیات سے ملاقات کا ذکر کیا ہے۔

لندن میں دو دن کے ایک اقتباس سے ان کی طرز فکر اور طرز تحریر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

''میں مشرق میں بھی آداب سحر خیزی کا پابند نہیں رہا اور یہ تو مغرب ہی ہے، لیکن آج بہت سویرے جاگ اٹھا، دریچے کے پاس آ کر پردہ کھینچا تو پورا لندن دھند کی سیاہ چادر میں لپٹا ہوا نظر آیا۔ ہر طرف کہر ہی کہر تھی۔ پتا نہیں یہ دودھ والے اور اخبار کے ہاکر اس تاریکی اور ٹھنڈک میں کس طرح اپنا کام کرتے جاتے ہیں۔ رات بھر ٹھنڈک رہی۔ کمرہ گرم کرنے کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ حیرت ہے اس کمرے میں اور اس مختصر بستر پر کوئی کس طرح گزر کر سکتا ہے۔ شباب الدین مغنی صاحب جب اس مکان میں پہلے دن مجھے لائے اور مالکہ مکان نے جو ایک پولیس خاتون ہیں بتایا کہ یہاں ایک کمرہ خالی ہے جس میں عرصہ تک مشہور افسانہ نگار قرۃ العین حیدر رہ چکی ہیں۔'' [1]

''چائے ختم کر کے اور مسز حق کا (جن کا پالش نام اس وقت مجھے یاد نہیں) مہربانی اور میزبانی کا شکریہ ادا کر کے میں دوسری منزل پر ساجد علی خاں صاحب رازؔ مرادآبادی کے فلیٹ میں پہنچا۔ اطلاع ملتے ہی ڈرائنگ روم میں (جسے وہ بار بار دیوان خانہ کہتے تھے) آ گئے۔ انگلستان کا انھوں نے کوئی اثر نہیں لیا تھا، اس طرح کرتے پاجامے میں بستر سے نکل کر آ گئے۔ بہت دن کے

[1] لندن میں دو دن (نصف صدی پہلے) پروفیسر مختار الدین، تمثیل نو، دربھنگہ، جلد ۲، شمارہ ۷، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۲، ص ۱۷

بعد ملاقات کر آ گئے۔ بہت دن کے بعد ملاقات ہوئی تھی باتیں شروع ہو گئیں۔ علی گڑھ، ڈاکٹر ذاکر حسین، اردو ادب، قرۃ العین حیدر، پاکستان، BBC، فیروز جبیں، خواجہ ناظم الدین سبھوں کا ذکر آیا۔ عندلیب شادانی سے شاکی نظر آئے اور جگر مرادآبادی کے بڑے مداح جگر پر ایک کتاب لکھنی چاہتے تھے۔ پرانے علی گیرین ہیں ایک خاص قسم کی لیکن بے ضرر سی گالی ہر وقت بلا ارادہ استعمال کرتے رہتے ہیں۔ 'اللہ معاف کرے' ان کا تکیہ سخن ہے۔ علی گڑھ سے بہت مختلف نظر آئے۔ کہتے ہیں اب میں نے اپنے کو بہت ٹھیک کر لیا ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے یہ کیا اپنے کو ٹھیک کرتے ان کی بیگم انھیں راہ راست پر لے آئی ہیں۔ کھانے پینے میں بھی بڑے مشرقی ہیں۔ انھیں یہاں کی غذا بالکل پسند نہیں بی بی سی کے انگریز دوستوں سے کہتے ہیں تمہاری غذا بھی کوئی غذا ہے یہ تو قوت لایموت ہے۔ گھر پر چپاتی اور قورمہ پکواتے ہیں۔ ذبیحہ کا بڑا خیال ہے انھیں۔ یہودیوں کی دکان سے بلکہ زیادہ تر ایک وحشی مسلمان رمضان کے یہاں سے گوشت منگواتے ہیں۔ اللہ کی شان اسی مکان میں ایک طرف مشرف جیسا رندلا ابالی اور دوسری طرف راز صاحب جیسا حامل لوائے شریعت۔ ایک چھت کے نیچے پوری دو دنیائیں آباد ہیں۔'' [1]

مسافر کی ڈائری: خواجہ احمد عباس

خواجہ احمد عباس علی گڑھ کے فرزند تھے۔ جنھوں نے صحافی، افسانہ نگار اور ناولسٹ کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ فلم سازی کے میدان میں بھی ان کی خدمات کم نہیں ہیں۔ ''بلٹز'' کا آخری صفحہ ان کی بے باکی اور جرأت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ وہ ترقی پسند نظریے کے حامل تھے اور اپنی کہانیوں اور ناولوں میں اپنے اشتراکی نظریات کو مکمل طور پر بیان کیا ہے۔ انھوں نے جہاں اردو ادب کو بہت سے بیش قیمت افسانے دیے ہیں وہیں سفرنامے کے میدان میں بھی انھوں نے اپنی جولانی کا ثبوت دیا ہے۔ ان کے سفرنامے کا نام ''مسافر کی ڈائری'' ہے۔ یہ ان کے ان مشاہدات و تجربات پر مشتمل ہے جو ۱۹۳۸ء ورلڈ یوتھ کانفرنس نیویارک

[1] لندن میں دو دن (نصف صدی پہلے) پروفیسر مختار الدین، تمثیل نو، دربھنگہ، جلد ۲، شمارہ ۷، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۲، ص ۱۷-۱۶

میں شرکت کے دوران انھیں حاصل ہوئی۔ انھوں نے اس وقت ۷ ملکوں کا سفر کیا تھا جس میں کولمبو، ہانگ کانگ، ٹوکیو، کنیڈا، لاس انجلسز، نیویارک، انگلستان، فرانس، ترکی، عراق اور ایران شامل ہیں۔ ان ہی اسفار کے دوران انھوں نے ان ممالک کے معاشرتی حقائق اور تضادات کا کھل کر بیان کیا ہے اور اپنے اشتراکی نظریے کا اظہار بھی کیا ہے۔ ہر جگہ ان کی اشتراکیت ان کی تحریر پر حاوی رہتی ہے۔ ''مسافر کی ڈائری'' میں بھی ان کا یہی انداز نمایاں ہے۔ خواجہ احمد عباس چونکہ الگ اسلوب کے حامل تھے اور ان کے اندر بے پناہ تخلیقیت تھی، اس لیے ان کی تحریر میں جادو کی کیفیت بھی تھی اور اثر بھی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بے باکی ان کا طرۂ امتیاز تھا اور اسی بے باکی کی وجہ سے ان کے قارئین کا ایک حلقہ بھی تھا، چاہے صحافت ہو، سیاست ہو یا معاشرت ہو، انھوں نے کبھی بھی اپنے اشتراکی نظریے سے انحراف نہیں کیا۔ انھوں نے ہر چیز کو اپنی نظر اور نظریے سے ہی پرکھا چنانچہ جب لندن کا ذکر کیا تو اس طرح:

> ''مجھے لندن آئے ہوئے پورا ایک مہینہ گزر گیا۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ مجھے نہ تو یہ شہر پسند آیا اور نہ میں نے اس کو اچھی طرح دیکھنے کی کوشش کی۔ ممکن ہے لندن کی زندگی میں بہت سی دلچسپ خصوصیات ہوں مگر میں اس کو کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ جب کہ زیادہ تر وقت میں نے اپنے کمرے میں گزارا۔'' [1]

یہ اس لندن کے بارے میں خواجہ احمد عباس کا خیال ہے جس کی مدح میں اکثر سفرنامے لکھنے والے ہندوستانی سیاح مبالغہ آرائی کی تمام حدوں کو پار کر جاتے ہیں اور اس طرح بے جا تعریف و توصیف کرتے ہیں کہ جیسے لندن کے علاوہ اس کائنات کے نقشے پر کوئی اور ملک ہے ہی نہیں۔

خواجہ احمد عباس نے لندن کو بھی ایک دوسرے زاویے سے دیکھا، یہی دوسرا زاویہ ان کی شناخت بھی ہے اور ان کا اپنا الگ اسلوب بھی۔ یہی الگ زاویہ انھیں امتیاز و انفرادیت بھی عطا کرتا ہے اور ان کی مشاہداتی قوت کا بھی ثبوت ہے۔ شاید دوسرے ممالک کے بارے میں بھی ان کی رائے کچھ اسی قسم کی ہو کہ جہاں اشتراکی نظریے کی حکومت نہیں ہے۔ بہر حال خواجہ احمد عباس اپنے اس سفرنامے میں بھی الگ اور مختلف انداز میں سامنے آتے ہیں اور یہی خواجہ احمد عباس کی خوبی ہے جو انھیں قاری کے ذہن میں زندہ کیے ہوئے ہے۔

---

[1] خواجہ احمد عباس۔ مسافر کی ڈائری، حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۴۰، ص ۵۹

(۱) دکھلایئے لے جا کے اسے مصر کا بازار (۲) جہان دگر: قرۃ العین حیدر

قرۃ العین حیدر بھی علی گڑھ کی فیض یافتہ ہیں۔ عالمی سطح پر شناخت اور شہرت کی حامل قرۃ العین حیدر نے بہت سے سفر کیے ہیں اور بہت سے ممالک کے تہذیبی وثقافتی رنگ سے آشنا ہیں۔ خارجی طور پر ان کے اسفار کی تعداد بے شمار ہے۔ لیکن ان کا سب سے بڑا سفر باطن کا سفر ہے وہ اپنی کہانیوں، افسانوں اور ناولوں میں اکثر حال سے ماضی اور ماضی سے حال میں سفر کرتی رہتی ہیں۔ ان کی بیشتر کہانیاں ماضی اور حال کے سفر کی داستان ہیں۔ بنیادی طور پر وہ اپنے ماضی میں سفر کرتی رہتی ہیں اور دیکھا جائے تو ان کی بیشتر تحریریں ماضی کا سفر نامہ ہیں۔ انھوں نے اپنے بہت سے اسفار کو اپنی کہانیوں اور ناولوں میں سمو دیا ہے اور ان کے سفر نامے ان کی داستان اور ناول کی سرحدوں میں پہنچ جاتے ہیں ان کی تحریروں میں جو تجربے ہیں وہی تجربے ان کے تخیل اور تخلیق کو توانائی اور تابندگی بھی عطا کرتے ہیں۔ وہ کسی بھی ملک کا سفر کرتے ہوئے اس کے باطن کو مکمل طور پر اپنے اندر جذب کر لیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سفر ناموں میں بھی تہذیب اور تاریخ کے روشن نقوش ملتے ہیں۔ وہ سرسری طور پر کسی چیز کا مشاہدہ نہیں کرتیں، بلکہ اس کی تمام جزئیات پر نظر رکھتی ہیں اور تمام تر لوازمات پر ان کی نگاہ رہتی ہے۔ وہ انسانوں کے چہروں سے بھی ملکوں کی تہذیب، تاریخ اور ان کے رویوں سے وہاں کی حسیت اور ثقافت کا انکشاف کرتی ہیں۔

ان کے سفر ناموں میں ''جہان دگر'' اور ''دکھلایئے لے جا کے اسے مصر کا بازار'' شامل ہیں۔ اسی طرح ان کے رپورتاژ بھی سفر نامے کے ذیل میں ہی آئیں گے۔ دیکھا جائے تو ان کے ناولوں میں سفر نامے کے عناصر بھی ملتے ہیں اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقوام وملل کی تہذیب وتاریخ کا انھیں کتنا ادراک ہے اور جغرافیہ اور تاریخ سے ان کی کتنی گہری دلچسپی ہے۔ ان کے ایک اقتباس سے ان کے لسانی اور فکری نظام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

> ''صحن کے شمالی سرے پر ایک بے حد حسین اٹھارہ، انیس سال کی لڑکی سبز رنگ کے فراک میں ملبوس سبز ہیٹ لگائے بہت سے مردوں کے ہجوم میں گھری بیٹھی تھی۔ لمبا ایجنٹ بھی ہوا پہنچا ہوا تھا اور اس

کی کرسی کا طواف کر رہا تھا۔ کس قدر خوبصورت لڑکی ہے؟ اورنگ دھتی نے کہا...لگتا ہے جیسے وگ کے صفحوں سے نکل کر آئی ہے، الویرا نے کہا...وہ بڑی تمکنت کے ساتھ گویا تخت پر بیٹھی تھی اور اس کے عشاق اس کے سامنے درباریوں کی طرح کھڑے تھے، لیے ایجنٹ سمیت کئی ایک نے جھک جھک کر اسے پیار بھی کیا۔ مڈل ایسٹ میں بے ہودگی کی انتہا ہے۔ واقعی شارمین نے کہا...سن رسیدہ اور خاموش طبیعت ڈاکٹر رائے چودھری جو اپنی نوجوان بیوی کی سہیلیوں میں بہت کم بات کرتے تھے شفقت سے مسکرائے ''میں اس خوشگوار نتیجے پر پہنچا ہوں'' انھوں نے کہا کہ ''تم ہندوستانی عورتیں کتنی ہی جدید اور آزاد خیال کیوں نہ بن جاؤ اصل میں رہو گی وہی ہندوستانی عورت——''[1]

مغرب میں رشتے داروں کی اجنبیت ہم لوگوں کو ہمیشہ متحیر کرتی ہے، میں مغربی جرمنی کے ایک ایسے میاں بیوی کو جانتی ہوں، میاں ہندوستانی ہیں، بیوی جرمن، جب کبھی وہ لڑکی اپنی ماں کو اپنے بچے کے لیے چند گھنٹے کی بے بی سٹنگ کے لیے بلاتی تھی بطور معاوضہ ماں کے لیے قیمتی تحائف رکھ جاتی تھی، اس کے برعکس ہمارے یہاں نانیاں، دادیاں خود تحائف لے کر بے تکان بے بی سٹنگ کرتی ہیں۔''[2]

ان دو اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرۃ العین حیدر کے سوچنے کی روش کیا ہے اور وہ کس طرح باطن میں سفر کرتی ہیں۔ بہر حال ایک سفر نامہ نگار کی حیثیت سے بھی ان کی شناخت تسلیم شدہ ہے یہ اور بات ہے کہ ان کے سفر نامے کے اجزا ان کی کہانیوں اور ناولوں میں بھی بکھرے پڑے ہیں۔

اعمال نامہ*: سر رضا علی عابدی

سر رضا کی کتاب ''اعمال نامہ'' بنیادی طور پر خود نوشت سوانح حیات ہے لیکن اس میں سفر نامے کے عناصر بھی ہیں۔ اس لیے ایک سفر نامہ نگار کی حیثیت سے بھی سر رضا کی شناخت قائم کی جا سکتی ہے۔ سر رضا علی

[1] دکھلائیے لے جا کے اسے مصر کا بازار۔ قرۃ العین حیدر، مکتبہ اردو ادب، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۵۸

[2] جہان دیگر۔ قرۃ العین حیدر، مکتبہ اردو ادب، لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۱۴۴

* قومی پریس لکھنؤ، ۱۹۴۴ء

ایک بہت بڑے دانشور تھے اور انگریزوں کے زمانے میں اہم عہدوں پر فائز رہے۔ انھوں نے بھی انگلستان کا سفر کیا اور جنوبی افریقہ بھی گئے اور وہاں قیام بھی کیا ''اعمال نامہ'' دراصل جنوبی افریقہ میں گزارے ہوئے ایام کی تفصیل ہے۔ انھوں نے جنوبی افریقہ میں جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اسے رقم کر دیا، اس میں ان کی آپ بیتی بھی ہے اور سفر کا احوال بھی۔ ان کی تحریر میں برجستگی تھی اور شاعری سے خاصا شغف تھا، اس لیے ان کی کتاب ''اعمال نامہ'' چاہے اسے خودنوشت سوانح کہا جائے یا سفرنامہ بہرحال ایک ایسی کتاب ہے جو کسی نہ کسی حوالے سے ضرور تاریخ ادب میں زندہ رہے گی۔

پیرس و پارس: ثریا حسین

پروفیسر ثریا حسین کا سفرنامہ ''پیرس و پارس'' کئی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے نام میں جو حسن ہے اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ''پیرس و پارس'' گو دو تہذیبوں کا وصال ہے، مشرق و مغرب۔ جدو جدیم دو متضاد لہروں اور سمتوں کا یہ حسن امتزاج بھی ہے۔ گویا ثریا حسین نے ''پیرس و پارس'' کے ذریعے دو مختلف اور متضاد دنیاؤں سے عوام کو روشناس کرانے کی کوشش کی ہے اور ان دونوں دنیاؤں کے تضادات اور مماثلات کو بھی روشن کیا ہے۔ ثریا حسین کے اس سفرنامے میں ان کی مشاہداتی قوت اور تجزیاتی صلاحیت کے سارے نقوش موجود ہیں۔ انھوں نے تمام تر جزئیات کا مطالعہ نہایت باریک بینی سے کیا ہے اور اپنے مطالعے مشاہدے اور تجربے میں سبھی کو شامل رکھا ہے۔ ہر طرح کی معلومات بھی دی ہیں اور لوگوں کے ذہنوں میں بہت سے تجربات اور انکشافات کے در بھی کھول دیے ہیں۔ ثریا حسین کا یہ سفرنامہ بنیادی طور پر ان کے پیرس کے قیام پر محیط ہے، انھوں نے فرانسیسی سیکھی اور مزید فرنچ زبانیں جاننے کی خواہش پیدا ہوئی تو ان کے لیے راہیں مزید آسان ہوتی گئیں۔ فرنچ میں ڈپلوما کرنے کے بعد انھیں گارساں دتاسی پر ریسرچ کرنے کے لیے وزارت تعلیم کے ذریعے فرنچ گورنمنٹ کا وظیفہ مل گیا اور اس طرح سوربون یونیورسٹی میں ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری کے لیے گئیں اور پھر وہاں پیرس میں جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا جس طرح کے افراد سے ملاقاتیں ہوئیں، جیسے جیسے مقامات آنکھوں کے دائرے میں آئے، جیسے جیسے افکار و خیالات کے جزیروں سے آشنائی ہوئی، ان

سب کو انتہائی خوبصورت پیرائیمیں ڈھال کر اسے سفرنامے کی شکل عطا کردی۔ اس میں جہاں پیرس کی تہذیبی، ثقافتی، علمی، ادبی صورت حال سے آشنائی ہوتی ہے وہیں وہاں کے رنگ و بو سے بھی ذہن کو نئی روشنی ملتی ہے۔ انھوں نے ہر چیز کو انتہائی تحقیقی نظر سے دیکھا اور اسے اس طرح بیان کردیا کہ پیرس کی پوری تاریخ اور تہذیب اجمالی طور پر کتاب میں سمٹ آئی ہے۔ اس کے لیے جس دقت نظر اور تجزیاتی نگاہ کی ضرورت ہے وہ ان کے پاس موجود ہے، وہاں کے دریا، محلات، مصوری اور گیت ہر چیز کا ذکر تمام تر تفصیلات کے ساتھ موجود ہے اور ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ کتاب محض جغرافیائی اور تاریخی معلومات کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہے بلکہ پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اس ملک کا سفر کررہے ہیں اور ایک ایک ذرّے سے آشنا ہورہے ہیں۔ وہاں کے جتنے تاریخی مقامات ہیں ان کا بھی ذکر ہے۔ چونکہ پیرس مصوری کا مرکز رہا ہے اس اعتبار سے بھی وہاں کے مصوروں کی تفصیلات بھی درج ہیں۔

شہر دل ربا سے ایک داستان کا آغاز ہوتا ہے۔ شہر دل ربا پیرس کے بارے میں وہ لکھتی ہیں:

''رات کے دو بجے پیرس سے پندرہ میل دور ''اورلی'' ایرپورٹ طیارہ کی کھڑکی سے دیکھا اور دور دور تک پیرس چمک رہا تھا۔ دل کی شکل کا یہ سحر آفریں، روشنیوں کا شہر! پیرسیائی نام کے کیلٹک قبیلہ نے پہلی صدی قبل مسیح دریائے سین کے کنارے ایک گاؤں آباد کیا جو لوٹیشیا کہلاتا تھا، بعد میں اسی جگہ رومن سپاہیوں نے اپنی چھاونی چھائی۔ تیسری صدی عیسوی میں جرمن قبائل کے حملوں سے بچنے کے لیے لوٹیشیا کے باشندے دریائے سین کے جزیروں پر چلے گئے۔ ان کی یہ بستی بہت جلد پیرسیوں کا شہر کہلانے لگی اور اس قبیلہ نے Sle De La Cite جزیرے کے شہر کو قلعہ بند کیا (اسی جزیرہ پر آج نوتر دام کا کلیسا اور پولیس کا ہیڈ کوارٹر موجود ہے)۔ پیرس بہت جلد ایک اہم مسیحی مرکز بن گیا اور یہاں بہت سی خانقاہیں قائم ہوئیں۔ کئی بادشاہوں نے اس شہر کو اپنی راجدھانی بنایا۔ نویں صدی میں نارو تجین حملہ آور اپنے جہاز لے کر سین پر اُترے لیکن جزیرہ کے قلعہ کو فتح نہ کرپائے۔'' [1]

---

[1] پیرس و پارس۔ پروفیسر ثریا حسین، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، اگست ۱۹۸۴، ص ۱۵

سین کے کنارے واقع اس شہر کے بارے میں ان کے جو مشاہدات ہیں وہ انھوں نے بڑی تفصیل سے قلم بند کیے ہیں۔ امریکن ہاؤس، سوربون یونیورسٹی، نیشنل تھیٹر، دریائے لوط اور دریائے دوغ دوں، اوینیو، زیورش اور اس جگہ کا بھی ذکر کیا ہے جو گارساں دتاسی کا مولد و مدفن ہے۔ اس کا نام مارسیلز ہے۔ مارسیلز کے بارے میں پروفیسر ثریا حسین لکھتی ہیں:

''بحیرۂ روم کی خلیج لیون پر آباد یہ دوسرا بڑا شہر فرانس کی اہم ترین بندرگاہ ہے، جس کو دریائے رون کے نزدیک ایشیائے کوچک سے آئے ہوئے یونانیوں نے ۶۰۰ ق م میں آباد کیا تھا اور مسیلیا اس کا نام رکھا۔ دوسری صدی قبل مسیح سلطنت روما سے اس کا الحاق ہوگیا۔ فرانس رومن ایمپائر کا ایک حصہ تھا اور گال Gaule کہلاتا تھا۔ چوتھی صدی عیسوی میں جان کیسیانوس نے یہاں مسیحیت پھیلائی۔ جزائر غرب الہند، شمالی افریقہ پر فرانس کے تسلط اور ۱۸۶۹ء میں سویز کنال کے کھلنے سے مارسیلز کی اہمیت میں اضافہ ہوگیا اور یہ بندرگاہ ''بحیرۂ روم کی ملکہ'' کہی جانے لگی۔ فرانس کا ولولہ خیز قومی ترانہ ''لا مارسیز'' (La Marsailles) اسی شہر کی دین ہے۔ یہ کورس گیت دراصل ۱۷۹۲ء میں انقلاب فرانس کے دوران لکھا گیا۔ اس کا خالق اسٹراسبرگ میں مقیم فوجی افسر ''کلود جوزف روژے'' جو شاعر اور سنگیت کار بھی تھا۔ اس جوشیلے گیت کے ذریعے وادی رائن میں تعینات فرانسیسی سپاہیوں کے جذبۂ حب الوطنی کو ابھارا گیا تھا۔ مارسیلز کے سپاہیوں نے اس کو پیرس میں رائج کیا اور ۱۷۸۵ء میں انقلابیوں نے اس کو اپنا قومی ترانہ بنالیا۔ [1]

انھوں نے بہت سے ادیبوں کا بھی ذکر کیا ہے جس میں موپاساں، برگ ساں، موزاٹ اور فرائڈ شامل ہیں۔ ان ممالک میں ہندوستانی طلبا کی ملاقات کا بھی ذکر ہے۔ وہ حصہ جو پیرس پر مشتمل ہے اس میں وہ ہر چیز کو حیرت کی نگاہوں سے دیکھتی نظر آتی ہیں۔

اکتوبر ۱۹۶۰ء میں وہ علی گڑھ واپس آگئی تھیں اور پھر اکتوبر ۱۹۸۲ء میں انھیں پیرس جانے کا دوبارہ موقع ملا۔ اتنے عرصے میں جہاں ثریا حسین کی ذہنی دنیا بدل چکی تھی وہیں پیرس بھی بہت کچھ بدل گیا تھا۔ یہ

[1] پیرس و پارس۔ پروفیسر ثریا حسین، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، اگست ۱۹۸۴، ص-۶۶-۶۵

قیام دو ماہ کے لیے تھا اور جس میں انھیں مستشرقین سے ملاقاتیں کرنے کا بھی موقع ملا۔ اتنے لمبے عرصے میں پیرس بہت حد تک بدل گیا تھا۔ لکھتی ہیں:

''سوربون کا نقشہ ہی بدل چکا ہے۔ وہاں اب محض کلاسیکل زبانیں، فرنچ ادبیات اور فلسفہ و جمالیات کی تدریس ہوتی ہے۔ انڈولوجی کا انسٹی ٹیوٹ بالکل علاحدہ عمارت میں چلا گیا ہے۔ پہلے ہم سوربون میں ہر وقت سیڑھیوں سے اترا چڑھا کرتے تھے اب ہر طرف لفٹ لگ گئے ہیں۔ پہلے لائبریری میں بیٹھنے کی جگہ مشکل سے ملتی تھی۔ اب طالب علموں کی بھیڑ چھٹ گئی ہے کیونکہ وہ دوسرے مقامات پر پڑھ رہے ہیں۔ کیمپس کھلا کھلا معلوم ہوتا ہے۔

سوربون کے عقب میں کولیژ فرانس کی عمارت ہے۔ وہاں جمالیات پر ڈیڑھ مہینے کا شارٹ ٹرم کورس چل رہا تھا جس میں سوربون کے فرانسیسی ادبیات کے پروفیسر اور ایک کینیڈین ماہر جمالیات کے لیکچرز جاری تھے۔ فرانسیسی استاد نے استھیٹکس کو فنون لطیفہ بالخصوص فرنچ ادب کے حوالے سے واضح کیا۔ کینیڈین پروفیسر نے انگلش لٹریچر کے جمالیاتی عناصر کا ذکر کیا۔ وہ شستہ فرنچ بول رہا تھا۔ کولیژ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہاں لیکچرز سننے کے لیے عام پبلک بھی شرکت کر سکتی ہے۔ جمالیات کے اس کورس میں قابل ذکر بات یہ تھی کہ پہلے دن لیکچر تھیٹر سامعین سے پُر تھا۔ ڈیڑھ مہینے تک اسی طرح بھرا رہا۔ اس مجمع میں اساتذہ اور طالب علموں کے علاوہ باہر کے لوگ بھی شامل تھے۔ بحث ومباحثہ میں وقت کا اندازہ نہ ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے خیال آتا تھا کہ ہمارے ہندوستان میں ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ یونیورسٹیوں میں مختلف مضامین پر جو لیکچر دیے جاتے ہیں انھیں سننے کے لیے باہر کے لوگ بھی آئیں۔ عام فرانسیسی کی علم دوستی کا مظاہرہ ان ہی چیزوں سے ہوتا ہے۔

کتابوں کا شوق، فلسفیانہ موشگافیوں سے دلچسپی، آرٹ پر مباحثے ریستورانوں میں ادبی گفتگو، مصوروں کے اسٹوڈیوز کی کثرت، پیرس بلاشبہ ایک نمائندہ ذہن پرست شہر ہے۔

اسی زمانہ یعنی نومبر ۱۹۸۲ء میں اخبارات اس بحث سے پُر تھے کہ سارتر کی جگہ اکیڈمی فرانسیسز کا اگلا رکن کون ہو؟ ہماری ہندوستانی پبلک محض فلم اسٹارز کے متعلق اس ذوق وشوق کا مظاہرہ کرتی ہے

یہاں ایک فلسفی ادیب ژاں پال سارتر کی وفات کے دو سال بعد بھی اہل فرانس اس کے جانشین کی تلاش میں منہمک تھے۔'' [1]

انھوں نے اپنے اس سفرنامے میں وہاں کے ادبی منظرنامے کے حوالے سے بھی عالمانہ گفتگو کی ہے۔ اردو اور فرنچ کے تعلق سے بھی روشنی ڈالی ہے اور اردو ادب پر فرنچ کے اثرات کا بھی ذکر کیا ہے:

''اردو دنیا عرصہ دراز سے انیسویں صدی کے دو فرنچ ناول نگاروں یعنی بالزاک اور زولا سے واقف ہے۔ فرنچ ریل ازم نے انگریزی تراجم کے ذریعے اردو فکشن کو بھی متاثر کیا۔ پچھلی صدی کے عہد ساز فرنچ شاعر بودلیر کا چرچا بیس پچیس سال قبل ہی ہوا اور اسی طرح ملارمے، رمبو اور پال ورلین وغیرہ کو عزیز احمد اور محمد حسین عسکری مرحوم نے اپنے تنقیدی مضامین کے ذریعہ متعارف کیا۔ اِسی زمانے میں سارتر کی وجودیت اور کامیو کی لایعنیت کی دھوم مچی۔ رومن، رولاں، مارسل، پروست آندرے ژید، سیمون دبوار اور فرنسواز ساگاں کے نام بھی اجنبی نہ رہے۔ لیکن چونکہ ہمارے یہاں انگریزی رائج ہے۔ ہمارے ادب کا ناطہ انگلستان اور امریکہ کی ادبیات سے ہی رہا ہے۔ ان فرانسیسی ادیبوں کی بیشتر تخلیقات کا ہمارے یہاں ترجمہ نہیں کیا گیا۔

اردو میں پچھلے دنوں جدیدیت کا بہت غلغلہ رہا۔ جدیدیت کیا ہے؟ اس کی کوئی جامع و مکمل تعریف نہیں کی جاسکتی۔ یہ ضرور ہے کہ ۱۸۸۰ء کے لگ بھگ جو تحریکیں فرانس میں شروع ہوئیں اور جنھوں نے سارے مغربی فنونِ لطیفہ بالخصوص ادب کو متاثر کیا، ان کو ''جدید'' اس لیے کہا گیا کہ وہ اس وقت کی رائج کلاسیکیت سے متاثر تھیں اور ان کا رجحان بنیادی طور پر رومانی اور وجدانی تھا۔ سوسائٹی کی عکاسی کے بجائے اندرونِ ذات کی سیاحی، فرنچ سمبلزم، لفظوں کا نئے ڈھنگ سے استعمال، سماجی اقدار سے بغاوت یہ سب اس جدیدیت میں شامل تھے جن کا اظہار آج سے تقریباً سو برس قبل یورپ میں شروع ہوا۔

افراط و تفریط محض ہمارے یہاں کی ہی خصوصیت نہیں ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ میں بھی پکاسو اور جیمس

[1] پیرس و پارس۔ پروفیسر ثریا حسین، ص ۱۳۳-۱۳۲

جوائس وغیرہ پر بھی بے حد لے دے ہوئی۔ سب سے بڑا الزام ان کے اوپر یہ تھا کہ وہ جو تصویریں بنا رہے ہیں یا جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ سمجھ میں نہیں آتا۔ یعنی مسئلہ ترسیل وابلاغ کا۔ پھر کچھ عرصے بعد ان کی حد سے زیادہ تعریف کی گئی۔ ان کی تخلیقات کی توضیح وتنقید پر پورا لٹریچر تیار ہوگیا۔ اسی طرح ہمارے یہاں بھی پچھلے دنوں جدیدیت کے نقیبوں کو مطعون کیا گیا یا ان کی مبالغہ آمیز ثنا خوانی ہوئی۔ ڈبلن کے جیمس جوائس کی طرح پیرس کا مارسل پروست بھی انسان کی نفسیاتی اور جذباتی زندگی کا ترجمان تھا۔ اس ترجمانی کے لیے ان دونوں نے الفاظ کو نئی شخصیت بخشی۔'' [1]

پروفیسر ثریا حسین اپنے اس سفرنامے میں وہاں کے سیاسی حالات پر بھی گفتگو کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ وہاں کے ادبا قومی، عالمی مسائل پر اپنا نقطہ نظر ضرور پیش کرتے ہیں، وہ معاشرے سے الگ تھلگ نہیں ہیں بلکہ وہ معاشرے کا ضمیر سمجھے جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں یہ صورت حال نہیں ہے، یہاں زیادہ تر ادیبوں کے لب سلے ہوتے ہیں اور خاموشی میں ہی وہ اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ عصری سیاسی مسائل میں ان کی دلچسپی برائے نام ہوتی ہے جب کہ فرانس کے معاملات اس سے مختلف ہیں۔ لکھتی ہیں:

''فرنچ ادیب سیاست میں بہت اہم سمجھے جاتے ہیں۔ بلند پایہ مصنفین سے پبلک یہ توقع رکھتی ہے کہ وہ قومی اور عالمی مسائل پر اپنا نقطہ نظر پیش کریں گے۔ وہاں ادیب درحقیقت معاشرے کا ضمیر سمجھا جاتا ہے۔ جنگ الجیریا کے زمانے میں آندرے مالرو وزیر اطلاعات تھے لیکن فرنچ کابینہ کا ایک رکن ہوتے ہوئے بھی انھوں نے ضمیر کی آزادی کی ایک درخشاں مثال پیش کی۔ انھوں نے تجویز کیا کہ تین نوبل انعام یافتہ ادیب روجر مارتین دوگار، فرانسوا موریاک اور کامیو خود الجیریا جائیں اور اس بات کی تحقیق کریں کہ فرنچ آرمی وہاں جنگی قیدیوں کو اذیت پہنچا رہی ہے یا نہیں؟ جان کروک شینک لکھتا ہے کہ ''یہ اسی قسم کی بات تھی گویا اگر ہیمنگوے امریکن حکومت کے ایک وزیر ہوتے اور وہ امریکن نوبل پرائز یافتہ ادیبوں جان اسٹائن بیک، فوکنر اور پرل بک سے کہتے کہ وہ ویت نام جائیں۔'' ایسی شدید اصول پرستی ہمیں زیادہ تر فرانس کے دانشوروں کے یہاں ہی ملے گی۔ فرانسیسی ادبا کے

---

[1] پیرس و پارس۔ پروفیسر ثریا حسین، ص ۱۴۲-۱۴۱

لیے سیاسی مسائل پر تفصیل سے بے باک رائے دینا فطری بات ہے۔ ولیری، موریاک، مولرو، سارتر اور کامیو نے مختلف زاویوں سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ عصر حاضر کے اہم ترین مصنفین سارتر اور کامیو حالانکہ متضاد سیاسی نظریات رکھتے تھے لیکن ان کے بیانات اور تحریروں کو نہایت غور سے پڑھا جاتا تھا۔ ان دونوں کے درمیان سیاسی مباحثہ میں پوری قوم نے اپنے آپ کو شامل سمجھا۔'' [1]

البرٹ کامیو اور سارتر اس کی نمایاں مثال ہیں۔ انھوں نے سیمون دبوار کا بھی ذکر کیا ہے جو اپنے نسائی خیالات کی وجہ سے بہت مشہور ہیں ان کے بارے میں لکھتی ہیں:

سیمون کا پہلا ناول ۴۳ء میں چھپا اور فوری شہرت حاصل ہوئی۔ ان ناول میں پہلی مرتبہ عورتوں کی روزمرہ زندگی اور ان کے سنجیدہ مسائل کو نہایت جسارت کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔ مصنفہ کی ہیروئن بورژوا قوانین سے بغاوت کر کے بغیر یہ جانے ہوئے کہ وہ کیوں ایسا کر رہی ہے۔ جبلی طور پر آزاد اور خودمختار زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ یہی رویہ آگے چل کر وجودی ناولوں میں بار بار پیش کیا گیا۔ سیمون دبوار کا مشہور ترین ناول Les Mandarin ہے جس میں اس نے بعد از جنگ فرانس کے بفٹ ونگ دانشوروں کے ذہنی مسائل پر قلم اٹھایا۔ سیاسی کمٹمنٹ، آزادیٔ انتخاب، ضمیر پرستی اور قدم قدم پر مایوسیوں کا سامنا کرتے ہوئے اس کہانی کے کرداروں میں سارتر اور کامیو کی زندگی کا عکس ملتا ہے۔ ''دوسری جنس'' (سیکنڈ سیکس) ایک اور شہرۂ آفاق تصنیف جو مغرب میں عورتوں کی تحریکِ آزادی یعنی ''ویمنز لبریشن'' کے لیے بائبل کا درجہ رکھتی ہے۔

سیمون دبوار سے قبل ایک اور مقبول مصنفہ کولیت (۱۸۷۳ء-۱۹۵۴ء) تھی جو معاشرہ نگاری میں یدطولیٰ رکھتی تھی۔ اس نے ناول Cheri (۱۹۲۰ء) میں ایک پختہ کار عورت کی پریشان حالی کی تصویر کشی کی ہے جب اس کا ایک بہت کم سن عاشق اسے چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔

فرانسواز ساگاں جس نے ۱۷ سال کی عمر میں اپنا پہلا ناول Bon Jour Tristesse لکھ کر بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی تھی۔

---

[1] پیرس و پارس۔ پروفیسر ثریا حسین، ص ۱۴۶-۱۴۵

اردو کی طرح فرانس میں بھی بعض نقاد مرد اور عورت مصنّفین میں تفریق کرتے ہیں۔ان کے نزدیک فرانسواز غیر معمولی فنکار نہیں لیکن خواتین میں اچھا لکھنے والی ہے۔فرانسواز ساگاں کا پسندیدہ موضوع محبت ہے،لیکن دوسری عورتوں کے برعکس اس کے ناولوں میں جذباتیت اور جارحانہ انداز نہیں۔معاشقوں کی روداد قلم بند کرتے ہوئے وہ ایک واضح اسٹائل، پرسکون مایوسی اور لاتعلقی کا اظہار کرتی ہے۔فرانسواز ساگاں کے ناول نوعمر لڑکیوں کے جذباتی مسائل کی نمائندگی کرتے ہیں۔پلاٹ سیدھے سادے اور طرزِ بیان میں کلاسیکل ضبط و تمکنت نمایاں ہے۔اس سادگی کے پردے میں مصنفہ نے اپنے عہد کی سماجی حقیقت نگاری کی ہے اس وقت فرانس اور تمام یورپ میں نئی نسل اپنے بزرگوں کی بنائی ہوئی اقدار سے بغاوت کر چکی تھی۔جنگ عظیم کے بعد کی دنیا کے متعلق وہ اب کسی قسم کی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھی۔اسی زمانہ میں نوجوانوں کی باغیانہ تحریک شروع ہو چکی تھی جس کا میں پہلے ذکر کر چکی ہوں۔

فرنسواز ساگاں کے ناول گویا اس سماجی تبدیلی کے نقیب ثابت ہوئے حالانکہ ان میں سیاسی مسائل کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ان کے دوسرے ناول اچھے خاصے ہیں لیکن نقش اوّل سے بہتر نہیں۔ان ناولوں کے انگریزی ترجموں کی بنیاد پر فلمیں بھی بنائی گئیں۔اردو ادیب رام لعل نے فرانسواز ساگاں کے ایک ناول کو ہندوستانی قالب میں ڈھال کر ''نیل دھارا'' کے عنوان سے شائع کیا ہے۔

سیمون دبوآر بلاشبہ فرنچ ادب کی High Priestess ہیں۔''تخلیقی عمل اور ادیب'' کے موضوع پر اکتوبر ۸۲ء میں ایک انٹرویو ''لوفگارو'' اخبار میں چھپا تھا جو علمی حلقوں میں کافی دنوں تک موضوعِ بحث رہا۔''[1]

فرانسیسی شاعری کے حوالے سے بھی انھوں نے بڑی اچھی بحث کی ہے بودلیر ملارمے، زولرو، چارلس پیگوئی، پالویل، پال والیری وغیرہ کا ذکر خاص طور پر ہے۔اسی طرح مارسل پروستھ، آندرے ژبد، پال کلوویل، آندرے بریتوں فراس سوامدریاک وغیرہ کا بھی ذکر ہے۔گویا اس کتاب میں پیرس کی تاریخ، تہذیب، ثقافت، معاشرت اور سیاست کا پورا منظر نامہ ہے۔یہ کتاب ہر اعتبار سے لوگوں کو پیرس کے تعلق سے مکمل معلومات

[1] پیرس و پارس۔پروفیسر ثریا حسین، ص ۱۵۰-۱۴۸

فراہم کرتی ہے۔

پارس کا ذکر بھی بہت ہی خوبصورت انداز میں میں کیا گیا ہے اور وہاں کی تاریخ کو چھوتے ہوئے آج کی صورت حال کا نہایت خوبصورت جائزہ لیا گیا ہے۔ یہاں کے مختلف مقامات کا ذکر اس کی جزئیات کے ساتھ ہے، خاص طور پر قم تو ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے جو تہران سے غالباً اسّی کلومیٹر کے فاصلے پر ہے جہاں حضرت رضا علیہ السلام کی بہن حضرت معصومیہ کا روضہ ہے۔ انھوں نے شاہ عباس کبیر کے شہر کا ذکر بھی کیا ہے یعنی اس اصفہان جو نصف جہان کہلاتا تھا۔ یہیں انھوں نے قصر چہل ستون بھی دیکھا، جو شاہانِ صفویہ کی جائے رہائش تھی، یہاں وہ ندی ہے جس کا ذکر فارسی شعر و ادب میں آیا ہے یعنی زندہ رود۔ انھوں نے شیراز کا بھی ذکر کیا ہے جہاں حافظ و سعدی مدفون ہیں۔ انھوں نے اس علاقے کی رومانیت کا اور دلکشی کا ذکر یوں کیا ہے:

> ''شیراز پہنچے۔ یہ شہر حافظؔ اور سعدیؔ کے پرستاروں کے لیے زیارت گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مرزا رسعدیؔ کو بھی دوبارہ تعمیر کروایا گیا تھا اور چاروں طرف وسیع باغ۔ یہ پورا علاقہ سعدیا کہلاتا ہے۔ مقبرہ کی دیواروں پر بوستاں کے اشعار اور گلستاں کی حکایتیں کندہ ہیں۔'' [1]

انھوں نے فردوسی کے شہر طوس کا بھی ذکر کیا ہے جو ایران کے قومی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہے۔ انھوں نے ماژندراں، گل افیون کے کھیت کا بھی ذکر کیا ہے۔ انقرہ، استنبول اور مصطفیٰ کمال پاشا وغیرہ کا بھی ذکر اس کتاب میں موجود ہے۔ انقرہ کا ذکر بھی کیا ہے اور حلب کا بھی۔ بغداد کا بھی۔ نجف اشرف، الکاظمیہ، المدائن اور سلویسیہ اس کے علاوہ قصر شیریں اور ''کوہ بے ستوں'' کا بھی ذکر ہے۔ قصر شیریں اور کوہ بے ستوں کے حوالے سے انھوں نے بڑی اچھی معلومات عطا کی ہیں۔ لکھتی ہیں:

> کرمان شاہ سے ۲۵ میل دور ''کوہِ بے ستوں'' فرہاد کے عشق بلاخیز کی یاد دلاتا ہے۔ یہاں گائڈ نے ہمیں فرہاد سے منسوب پہاڑی دکھائی صاف معلوم ہوتا تھا کہ تیشے سے اس کے پتھر کاٹے گئے ہیں وہیں کی ایک اور چٹان پر خط میخی میں کندہ کتبے موجود ہیں۔ یہ کتبے ۱۹۳۶ء میں پہلی بار پڑھے گئے وہ ایسی کلید ثابت ہوئے جن کی وساطت سے قدیم ہخامنشی زبانوں کا انکشاف کیا گیا۔

---

[1] پیرس و پارس۔ پروفیسر ثریا حسین، ص ۹۳-۲۹

کرمان شاہ ہخامنشی دور کے بعد شاہانِ ساسانیہ کی شکارگاہ بھی رہا کیونکہ یہاں جانوروں کی بہتات تھی۔

ایران پر اسلامی تسلّط کے بعد عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے بھی اس پرفضا مقام پر موسم گرما کے لیے رہائش گاہ تعمیر کروائی جس کے کچھ کھنڈرات بھی موجود ہیں۔'' [1]

ہمدان میں بوعلی سینا کے مقبرے کا بھی ذکر ہے اور نیشاپور جیسی جگہ کا بھی جو عمر خیام کی آرام گاہ ہے جس کا مقبرہ ایک سنسان پہاڑی پر استادہ ہے۔ اس کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کے مقبرے کے آس پاس فیروزے کی پہاڑیاں ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے وادی ہری روت اور کوہ سفید کا بھی مشاہدہ کیا۔ وادی ہری روت زرخیزی کے لیے مشہور ہے جہاں کپاس پیدا ہوتی ہے۔

پیرو پارس پروفیسر ثریا حسین کا نہایت معلوماتی اور مشاہداتی سفرنامہ ہے۔ انھوں نے مختلف ممالک کے اسفار کے دوران جو کچھ بھی دیکھا ہے اور جو چیزیں انھیں تحیر خیز یا معلوماتی لگیں، ان کا ذکر کر دیا ہے۔ بہت سارے ممالک کا ذکر اس کتاب میں ہے۔ تمام ممالک کے متعلق تفصیلات درج نہیں کی جا سکتیں پھر بھی ہلکا ہلکا ہر ایک کا تعارف اس طور پر کر دیا گیا ہے کہ قارئین کا تجسس بھی برقرار رہے اور اس کی تشنگی بھی مٹ جائے۔ پروفیسر ثریا حسین نے یہ سفرنامہ، سفرنامے کے فنی معیاروں کے مدنظر نہیں لکھا ہے اور نہ ہی کسی طرح کا التزام کیا ہے۔ انھوں نے کوئی خاص متعینہ فورم کو اختیار نہیں کیا، بلکہ جس طور پر ان کے ذہن میں چیزیں روشن ہوتی گئیں، یادیں لہریں بنتی گئیں انھیں اپنے خوبصورت اور دل نشیں پیرایے میں بیان کر دیا۔ ویسے بھی سفرنامے کی کوئی متعینہ ہیئت نہیں ہے۔ ان کی زبان میں سلاست اور وضاحت بھی ہے اور وہ تہذیب و شائستگی بھی جو اردو کی خصوصیت ہے۔ ایسا کہیں نہیں لگتا کہ انھوں نے غیر ضروری طور پر قاری کو بور کیا ہو یا اپنی زبان و بیان سے اس کے ذہن کو مکدر کیا ہو۔

ان کی نثر بڑی خوبصورت ہے اور منظر نگاری بھی نہایت دلکش۔ ایک اقتباس سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

---

[1] پیرو پارس۔ پروفیسر ثریا حسین، ص ۱۱۵

''وہاں جب میں اور کیتھرین پہنچے تو پارٹی عروج پر تھی۔لڑکے لڑکیاں ناچ رہے تھے۔آرکیسٹرا بج رہا تھا۔میزیں فرانسیسی کھانوں اور مشروبات سے لدی تھیں۔جارڈن کی لڑکی ہالہ وہاں ہماری منتظر تھی۔ کئی طالب علموں سے تعارف ہوا۔سب ایک برادری معلوم ہو رہے تھے۔حالانکہ مشرق و مغرب کے دور دراز ملکوں سے آئے تھے اور پیرس میں خود کو موجود پا کر بے حد مسرور دکھائی دیتے تھے۔

مجھے گھر کی یاد ستا رہی تھی۔نیم تاریک علی گڑھ اس منور ہال سے کتنا دور رہ گیا تھا!

پارٹی ۱۲ بجے رات تک چلتی رہی مگر ہم وہاں سے جلد نکل آئے کیونکہ مجھے مونپرناس کی ایسی سڑکوں سے گزرنے کا خوف دامن گیر تھا جن کو اس وقت میں بہت مخرب الاخلاق اور خطرناک سمجھتی تھی۔

ہوٹل کے کمرے میں واپس آ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔دروازہ اچھی طرح بند کیا اور سو رہی۔

صبح اٹھ کر نیچے آئی۔نعل نما کراساں (فرنچ نمکین بسکٹ) اور سیاہ کافی پی جو بہت گاڑھی اور کڑوی لگی۔سوچا کہ نہ جانے کیسے یہ فرانسیسی اتنا تلخ مشروب شوق سے پیتے ہیں؟ میں پندرہ روز اس ہوٹل میں ٹھہری مگر سوائے ضروری کاموں کے اپنے کمرے سے نہیں نکلی۔شام کے وقت مونپرناس کے علاقے میں ایسی گھبراہٹ ہوتی کہ بگیت (فرنچ بریڈ) مکھن اور پھل سے کام چلاتی۔ڈنر کے لیے کسی ریستوران میں نہیں گئی حالانکہ کیتھرین برابر اصرار کرتی کہ چلو باہر کھانا کھائیں گے۔'' [1]

ثریا حسین کا یہ سفرنامہ زبان و بیان، اسلوب، انداز نگارش اور اپنی معروضیت کی وجہ سے بھی یاد رکھا جائے گا۔وہ چونکہ جمالیات کی پروفیسر رہی ہیں اور جمالیاتِ شرق و غرب پر ان کی نظر ہے اس لیے ان کی تحریروں میں جمالیاتی عناصر کی جستجو بھی کی جا سکتی ہے۔

رہ نوردِ شوق: عابد حسین

''رہ نوردِ شوق'' ڈاکٹر عابد حسین صاحب کا سفرنامہ ہے۔یہ بنیادی طور پر صالحہ عابد حسین کے نام لکھے گئے خطوط پر مشتمل ہے۔ڈاکٹر سید عابد حسین ایک دانشور اور مفکر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔وہ اپنی دانشورانہ

[1] پیرس و پارس۔پروفیسر ثریا حسین، ص ۱۹-۱۸

اور عالمانہ تحریروں کی وجہ سے علمی حلقوں میں ہمیشہ اعتبار کی نظر سے دیکھے گئے۔ ان کی تصنیف ''ہندوستانی قومیت اور قومی تہذیب'' آج بھی ایک اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔ انھوں نے جرمن زبان میں اپنا تھیسس لکھا جہاں انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے ساتھ ایک بہت بڑا اعزاز اے اے ملا تھا۔ عابد حسین گو کہ انگریزی اور جرمنی زبان کے ماہر تھے مگر اردو زبان سے انھیں گہرا لگاؤ تھا۔ انھوں نے ہی جرمنی سے ''دیوان غالب'' کا ایک ایڈیشن شائع کیا تھا جو آج بھی اہمیت کا حامل ہے۔ عابد حسین صاحب نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تعلیمی اور تہذیبی افادیت کو ایک نئی وسعت عطا کی۔ ''اسلام اینڈ ماڈرن ایج'' جیسے اہم رسالے کے ایڈیٹر رہے اور اسی کا اردو ایڈیشن ''اسلام اور عصر جدید'' کے نام سے شائع کیا یہ رسالہ آج بھی اپنے تحقیقی مقالات کی وجہ سے حوالہ جاتی حیثیت کا حامل ہے۔ اردو زبان و ادب کی خدمات کے حوالے سے ان کا نام ہمیشہ لیا جاتا رہے گا۔ ''رہ نورد شوق'' میں انھوں نے اپنے سفر کے احوال لکھے ہیں گو کہ انھیں مکمل طور پر سفر نامہ نہیں کہا جا سکتا، مگر چونکہ اس میں بھی بہت سے عناصر سفر سے متعلق ہیں، اس لیے اس کا شمار بعض لوگوں نے سفر نامے میں کیا ہے۔ یہ سفر نامہ اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں بہت ساری معلومات ہیں، بہت سے اہم اشخاص کے حوالے ہیں۔

ان کی شخصیت چونکہ علمی تھی اس لیے ان کے سفر میں زیادہ تر علمی باتیں ہی ہیں۔ بائڈل رگ، ہالینڈ، پیرس، لندن، گنگسٹن، نیویارک، نیو ہیوین، ہمسلٹن، مانٹریاڈ سے لکھے گئے ان خطوط میں ان ممالک کے تعلیمی تہذیبی اور ثقافتی احوال کے علاوہ بہت سے ایسے اشخاص کا ذکر ہے جو علمی اعتبار سے بہت ہی اہمیت کے حامل ہیں۔

صالحہ عابد حسین نے لکھا ہے کہ وہ سفر سے بہت گھبراتے تھے اور بچپن میں تو ان کے سفر کا دائرہ بھوپال سے دائی پور تک، لکھنؤ اور موہان تک محدود تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ ان کی روش بدلی اور انھوں نے مختلف ممالک کا سفر کیا۔ اور انہی اسفار کو انھوں نے اپنے خطوط کے ذریعے قارئین تک پہنچایا۔

عابد حسین کی زبان نہایت ہی سلیس اور شستہ تھی اور نہایت معروضی نثر لکھتے تھے۔ ایسی نثر کہ جس سے لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہو۔ جہاں بھی گئے انھوں نے اس کے بنیادی مسائل پر توجہ کی اور وہاں کی

خوبیاں اور خصوصیات تحریر کیں۔ ''رہ نوردِ شوق'' میں جہاں ان کی علمیت روشن ہوتی ہے وہیں ان کے اسلوب کی شگفتگی کا اندازہ بھی ہوتا ہے:

''میں نعیم صاحب کے ساتھ وہاں پہنچا۔ اس خلوص اور محبت سے ملے جیسے برسوں کی دوستی ہو۔ بہت اصرار کیا کہ آج آپ نماز پڑھائیے۔ میں نے کہا، میں شیعہ ہوں۔ کہا اس میں کیا حرج ہے۔ غرض بڑی مشکل سے اس شرط پر پیچھا چھوڑا کہ میں نماز کے بعد مصلّیوں سے کچھ کہوں۔ نماز میں ستر اسّی کے قریب پاکستانی، افریقی، امریکی گورے، امریکی حبشی مرد عورتیں تھیں۔ خطبے اور نماز کے بعد (منبر نما سیٹ پر) کھڑا کر دیا۔ میں نے ۶ کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کا سلام پہنچایا اور بتایا کہ مسلمان کس طرح اپنی مشکلوں کا مقابلہ کر رہے ہیں، کچھ مسلمانوں کے صبر و استقلال سے اور اچھی مثال کے اثر سے دوست تو دوست دشمنوں کے دل بھی متاثر ہوئے ہیں، اس کا ایک ثبوت ایک مسلمان کا صدرِ جمہوریہ منتخب ہونا ہے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ اقلیت اپنی اخلاقی صفات کی بدولت اکثریت کے دل میں گھر کر سکتی ہے۔ پانچ منٹ اُلٹی سیدھی باتیں کر کے تقریر ختم کر دی۔ بہت سے لوگوں نے آ کر ہاتھ ملایا۔ کچھ لوگوں نے ہاتھ چومے۔ ایک گراں ڈیل افریقی نے گلے لگا کر دونوں گالوں کو بوسہ دیا۔ غرض مشکل سے جان چھوٹی اور نعیم صاحب کے دفتر واپس آئے وہاں سے ایئر انڈیا کے دفتر جا کر اپنے ٹکٹوں کا معاملہ ٹھیک کیا۔ شام کو سوا چھ بجے گھر پہنچے... آج سنیچر اور کل اتوار کو سب دفتروں میں چھٹی ہوگی۔ کسی سے ملنا ملانا ممکن نہیں۔ اس لیے صبح دیر میں ناشتہ کر کے قریب کے پارک میں سیر کی۔ چند ضروری خط لکھے۔ آپ کو خط لکھنا شروع کیا اور بہت لمبا خط لکھنا چاہتا تھا مگر گھر والے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ قریب کے کسی ریستوران میں جا کر دوپہر کا کھانا کھانا ہے۔ اس لیے یہ سطریں گھسیٹ کر ختم کرتا ہوں...!'' [1]

ان خطوط میں اپنے سفر کی روداد لکھتے ہوئے انھوں نے اپنی بیگم صالحہ عابد حسین کو بھی اچھی طرح اپنے ذہن و دل میں رکھا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں:

---

[1] رہ نوردِ شوق، ڈاکٹر سید عابد حسین، مرتبہ صالحہ عابد حسین، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ص ۷۶-۷۵

''بمبئی سے آپ کو خط لکھا تھا اور وہاں آپ کا خط ملا، جس میں دیدہ و دل ملفوف تھے۔ سچ مچ آپ کے دیدہ و دل میرے ہمراہ ہیں۔ آپ ہی کی آنکھوں سے دیکھتا ہوں آپ ہی کے دل سے محسوس کرتا ہوں۔'' [1]

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ صالحہ عابد حسین گو کہ ان کے ساتھ نہیں تھیں، لیکن ان کی آنکھیں ان کے ہمراہ تھیں۔ رہ نوردِ شوق یقینی طور پر ایک ایسا سفر نامہ ہے جس سے مختلف ملکوں کے تعلیمی، ثقافتی احوال کے علاوہ دانشوروں کے ذہنی رویے، رجحانات، ان علمی اور تحقیقی دلچسپیوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس سفر نامے سے عابد حسین کی شخصیت کے بہت سے نقوش اجاگر ہوتے ہیں۔ خطوط سے ہی کسی انسان کی باطنی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ خطوط عابد حسین کی شخصیت کی تفہیم میں بھی معاون ہیں۔ رہ نوردِ شوق میں ان کی ملاقات جن شخصیات سے ہوئی وہ سب اپنے اپنے میدان کے ماہر ہیں۔ کہیں کہیں انھوں نے اچھی منظر نگاری بھی کی ہے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''راستہ اس قدر خوبصورت تھا کہ میں آپ سے کیا کہوں۔ مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ مشرقی امریکہ کے دیہات اس قدر خوش منظر ہو سکتے ہیں۔ مغربی علاقے کیلیفورنیا کی البتہ بہت تعریف سنی تھی، راستے بھر سبزہ زار کھیت، صاف ستھرے گاؤں، جن میں چھوٹے چھوٹے مکانات، جو ہمارے شہروں کے اکثر مکانات سے زیادہ آرام دہ اور جدید ترین تکلفات (ریڈیو، ٹیلی ویژن، سنٹرل ہیٹنگ اور (Vacuum Cleaners) سے آراستہ اور قریب قریب ہر مکان کے ساتھ گیراج میں یا باہر کھڑی ہوئی کار۔ راستہ کبھی اوپر پہاڑی پر چڑھتا ہے کبھی نیچے وادی میں اُترتا ہے، جھیلوں کے قریب سے گزرتا چلا جارہا تھا۔ غرض بہت لطف آیا۔'' [2]

''رہ نوردِ شوق'' چونکہ ان کے انتقال کے بعد شائع ہوئی اور ان کی بیگم صالحہ عابد حسین جیسی ادیبہ ناول نگار نے اسے مرتب کیا ہے اس لیے یقینی طور پر یہ بہت ہی معنی خیز ہے۔

عابد حسین صاحب کے نثر کے حوالے سے صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں کہ:

''عابد صاحب کی نثر کی تمام خوبیاں ان خطوط میں مل سکتی ہیں، جچے تلے جملے، حشو زوائد سے پاک

---

[1] رہ نوردِ شوق، ص ۴۵، [2] رہ نوردِ شوق، ص ۶۹

بے ریا، بامحبت، پرخلوص دل کی جھلکیاں بھی اس میں دیکھی جاسکتی ہیں۔'' [1]

دنیا میرا گاؤں: خواجہ غلام السیدین

خواجہ غلام السیدین کی فکر ونظر کی کائنات بہت وسیع تھی اوراس وسعت میں ان کے مشاہدات اور تجربات کا عمل دخل ہے جومختلف ممالک کے اسفار کے دوران انھیں حاصل ہوئے۔انھوں نے اتنے ممالک کے سفر کیے کہ دنیاان کے لیے ایک گاؤں میں تبدیل ہوگئی۔ ماہر تعلیم کی حیثیت سے بھی ان کی ایک الگ پہچان ہے۔ مالک رام نے لکھا ہے کہ ان کی اردو نثر بڑی جاندار اور شگفتہ ہے۔ بظاہر ایسی سہل ممتنع کہ قاری خیال کرے کہ ایسی نثر لکھ لینا مشکل نہیں ہے،لیکن جب لکھنے بیٹھے تو دانتوں پسینہ آجائے اوراسے معلوم ہو کہ یہ کتنا مشکل کام ہے۔''دنیا میرا گاؤں'' کی نثر اس کا بین ثبوت ہے۔اس کے علاوہ ان کے وہ تمام مضامین جو تعلیمی موضوعات پر ہیں، وہ ان کی تحریر کی شگفتگی اور روانی کی دلیل ہیں۔انھوں نے انتہائی سادہ زبان میں اورمعلوماتی انداز میں مضامین تحریر کیے ہیں تاکہ قارئین کے خالی اور غیر آباد ذہن کو اپنے افکار وخیالات اورجذبات واحساسات سے اس طرح آباد کردیں کہ اسے کسی طرح کے خلا کا احساس نہ ہو۔ان کے پیش نظر عوام کی بیداری اوران کی فکر ونظر کی بالیدگی رہی ہے۔ وہ دراصل جس مشن یا تحریک سے وابستہ تھے اس کا مقصد ہی الگ تھا۔انھوں نے کہیں بھی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا بلکہ حقیقت پسندانہ اسلوب اختیار کرتے ہوئے عوام کوان تمام احوال وحقائق سے روشناس کرایا،جن سے اقدار کے تحفظ میں مدد مل سکے۔ان کے لیے سب سے بڑا مسئلہ تعلیم کے فروغ اور جہالت کے خاتمے کا تھا اس لیے انھوں نے نظام تعلیم اور تعلیمی مسائل کے تعلق سے مختلف ملکوں کے سفر کیے اور وہاں کی تعلیم وتہذیب کا جائزہ لیا اوران انسانی اقدار کی جستجو کی جو کائنات کی فلاح وبقا کے لیے ضروری ہیں۔ دراصل ان کا بنیادی ارتکاز اقدار کی تبلیغ واشاعت پر تھا۔ وہ قدریں جن سے آدمی میں انسانیت پیدا ہوتی ہے،ان کے لیے انسانیت سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ساری دنیا کو وہ اپنا گاؤں یا وطن مالوف سمجھتے تھے اورساری دنیا کے انسانوں سے ان کا لگاؤ تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں

[1] رہ نورد شوق، ڈاکٹر سید عابد حسین، مرتبہ صالحہ عابد حسین، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۹، ص ۴۱

میں انسانی اقدار کی جستجو ملتی ہے۔ ''دنیا میرا گاؤں'' ان کا غیر مربوط سفر نامہ ہے۔ اسے فنی اعتبار سے شاید سفر نامہ نہ کہا جائے مگر یہ ان کی وہ یادداشتیں ہیں جو مختلف ممالک کی تہذیب و معاشرت اور تمدن کی بابت معلومات فراہم کرتی ہیں۔ یہاں صرف مصنف کی سیاحت کا بیان نہیں ہے بلکہ متعلقہ ممالک کی تہذیب و معاشرت کے حوالے سے ہندوستانی ذہنوں کو مہمیز کرنے کی ایک کوشش بھی ہے۔ وہ تعلیمی کانفرنسز میں جہاں جہاں شریک ہوئے وہاں کے افراد کا نفسیاتی مطالعہ بھی کیا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان اسفار کے دوران انھوں نے زیادہ کتابوں کے ساتھ وقت گزارا۔ دراصل کتابوں کا مطالعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان میں ہندوستانی معاشرے کو کتابوں سے مربوط کرنے کا جذبہ پنہاں تھا اور وہ اس راز سے واقف تھے کہ کتابوں کے ذریعہ ہی ہندوستانی عوام کے ذہنوں کی دنیا تبدیل کی جا سکتی ہے۔ دراصل جس تعلیمی تحریک سے وہ جڑے ہوئے تھے اس میں کتابوں کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ اس لیے جہاں بھی گئے انھیں مقامات سے زیادہ دلچسپی کتابوں سے رہی اور ان کتابوں کے مطالعے سے انھوں نے بہت سے ایسے نتائج اخذ کیے جس کا فائدہ پوری قوم اور ملک کو پہنچا۔ انھوں نے انگریز مصنّفین کی کتابوں کے مطالعے سے ان کی ذہنی کائنات کو سمجھنے کی کوشش کی اور احساس دلایا کہ کتابوں کے مطالعے کے ذریعے بہت سے ملکوں کے نظام معاشرت اور تہذیب و تمدن کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ چنانچہ ہر سفر نامے میں انھوں نے کچھ ایسی اہم کتابوں کا ذکر ضرور کیا ہے جس سے وہ بہت متاثر ہوئے یا جن کتابوں کے ذریعے انھیں کچھ نئی معلومات حاصل ہوئیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''اس عرصے میں کئی قابل ذکر کتابیں پڑھیں جن میں سے صرف چند کے نام یاد ہیں! Stamps:Live Learn تعلیمی خطبات ہیں۔ لکھنے کا انداز پرزور اور خیالات میں جدت اور شگفتگی ہے۔ اس میں ایک Layman کے نقطہ نظر سے تعلیمی مسائل پر اچھا تبصرہ کیا گیا ہے۔ James Barrie کے ڈراموں کا ایک مجموعہ چھوٹے بڑے ایک ایکٹ کے ڈرامے ہیں اور حسب معمول اس کے خیال کی لطافت اور اندازِ بیان کی نزاکت سے مالا مال ہیں اور انسانی فطرت کے کسی نہ کسی پہلو کی نقاب کشائی کرتے ہیں اس میں ایک ڈراما ''سات عورتیں'' ہیں جس کو پڑھ کر مجھے باچھو کی کہانی ''تین عورتیں'' یاد آئیں۔ اس پر خیال آیا کہ اس کی کہانیوں کا مجموعہ ''ایک لڑکی'' کے

نام سے شائع ہوگیا ہے اور بحیثیت مجموعی قابل مبارک باد ہے۔ Dougias Reed کی کتاب All our Tomorrows جس میں انگلستان کی موجودہ زندگی اور سیاسی اور سماجی تحریکوں پر ایک بے پناہ تنقید ہے اور ایک ایسے اثر آفریں، طنز آمیز، ظرافت نما انداز میں تنقید کی گئی ہے کہ انسان اسے پڑھ کر بے حد متاثر ہوتا ہے۔ کتاب کا اصل موضوع یہ ہے کہ انگلستان میں بعض ایسے گروہ اور بااثر افراد ہیں خصوصاً گزشتہ چیمبرلین کی حکومت کے اراکین (جواب بھی انگلستان کے سر پر مسلط ہیں) جو اپنے ذاتی اقتصادی مفاد کی وجہ سے حکومت کو نہ جنگ جیتنے دیتے ہیں، نہ جرمنی کی ہار اور روس کی واقعی کامیابی کے خواہش مند ہیں، نہ جنگ کے بعد کسی انقلابی پروگرام کے حامی ہیں اور جب تک ان لوگوں کو دور نہ کیا جائے گا اور رائے عامہ کو صحیح قسم کی تنقید سکھانے والی اور اپنے حقوق و فرائض سے آگاہ کرنے والی تعلیم نہ دی جائے گی، ملک کے لیے جنگ اور امن دونوں کا جیتنا ناممکن ہے۔ اس نے بالکل بے خطر ہو کر نہایت مقتدر، دولت مند اور جماعتوں پر نہایت زبردست تنقید کی ہے اور اس طرح میرا خیال ہے انگلستان میں کافی اثر پیدا کر لیا ہے۔ ہندوستان میں تو شاید ایسی کتاب لکھنا ممنوع ہی ہو۔ اس میں وہ تمام بے ایمانیاں اور غداریاں اور طرف داریاں Neptosim جو قوم کی بہتری کو روک رہی ہیں اور اس کے مستقبل کو خطرے میں ڈال رہی ہیں بے نقاب کی گئی ہیں۔'' [1]

میں راستے میں ایک کتاب پڑھ رہا ہوں جس کا نام ہے Belled and its service ایک عورت Rosamond Lehme کی لکھی ہوئی ہے۔ اس قدر مبصرانہ نفسیاتی مطالعہ ہے، بالخصوص عورتوں کی فطرت کا (بلکہ ایک خاص اور غیر معمولی اور انفرادیت رکھنے والی عورت کی فطرت کا) کہ میں نے کم کتابیں اس کی ٹکر کی پڑھی ہیں۔ اور برخلاف بیشتر انگریز مصنفین کے اس عورت کو زبان اور اس کی لطافتوں اور الفاظ کے Senemons حسن سے عشق ہے اور نہایت اثر آفریں اور انفرادی امتیاز رکھنے والی زبان استعمال کرتی ہے۔ بصرے سے میں نے ایک کتاب Democracy on the Road خریدی ہے جس میں امریکہ کی مشہور T.V.A. پروجکٹ کا

---

[1] دنیا میرا گاؤں۔ خواجہ غلام السیدین، مرتب ڈاکٹر سید فرحت، سیدین میموریل ٹرسٹ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵، ۱۹۸۵، ص ۱۱۳-۱۱۲

بیان ہے جس نے وہاں کے ایک مقابلتاً پس ماندہ علاقے میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے۔
مجھے اس مضمون سے اس لیے دل چسپی ہے کہ ہندوستان کو بھی اپنی صنعتی اور سوشل ترقی کے لیے اس
قسم کے منصوبے چلانے ہوں گے۔ (بلکہ خود اس نے بھی اس چیز کا ذکر کیا ہے)'' [1]

ان کتابوں کے ذکر کا مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ وہ کتابوں سے اپنی بے پناہ دلچسپی کا مظاہرہ کر رہے ہوں بلکہ اس کا مقصد ترغیب دینا بھی ہے اور کتابوں کے ذریعے ذہنی نظام کی تبدیلی کی طرف اشارہ کرنا بھی مقصد تھا۔ ظاہر ہے کہ اس نوع کی کتابیں نہ ہر ایک کی رسائی میں ہیں اور نہ ہی ہر ایک کی معلومات کے دائرے میں۔ اس لیے اہم کتابوں کے ذکر کے ذریعہ انھوں نے جہاں کتاب کلچر کے احیا کی طرف اشارہ کیا وہیں دنیا کی بدلتی ہوئی صورت حال سے آگہی کے لیے لوگوں کو مطالعے کی طرف راغب کرنے کی کوشش بھی کی، گویا انھوں نے اپنے مطالعے اور مشاہدے دونوں میں ہی قاری کو شریک کر لیا ہے۔ اس طرح پڑھنے والے کی ذہنی دنیا جہاں وسیع ہوتی ہے وہیں فکر و نظر کے افق کو نئی وسعتیں بھی ملتی ہیں۔ خواجہ غلام السیدین نے تاریخی مقامات اور یادگار عمارتوں کے حوالوں سے بھی بہت کچھ لکھا ہے مگر ان کا بنیادی ارتکاز افراد کے نفسیاتی مطالعے اور ان کے ذہنی رویے کی تفہیم پر رہا ہے۔ جس ملک کا بھی سفر کیا وہاں کے نظام تعلیم و تمدن کو سمجھنے اور وہاں کے ارباب علم سے ملاقات کر کے وہاں کے تعلیمی مسائل پر تبادلہ خیال کو زیادہ ترجیح دی ہے۔ دراصل وہ عصری اور جدید نظام تعلیم کے فوائد اور اس کے امکانات کے حوالے سے بہت کچھ سوچ رہے تھے جس کے نفاذ سے ہندوستانی عوام کی تقدیر تبدیل کی جا سکتی ہے۔

''دنیا میرا گاؤں'' میں ایران، عراق، انگلستان، آسٹریلیا، فرانس، چین، یورپ، سوئیڈن، ڈنمارک، لبنان، دمشق، پاکستان، ناروے، نیویارک، واشنگٹن جیسے ممالک کے ساتھ سری نگر، ممبئی، رامپور، اندور، علی گڑھ، اودے پور جیسے ہندوستانی مقامات کا ذکر بھی کیا ہے۔ یہ تمام اسفار انھوں نے کسی نہ کسی تعلیمی پروجیکٹ کے تحت کیے ہیں اور وہاں کی تمام تفصیلات تاریخ وار درج کی ہیں اور اپنے مشاہدے اور تجربے میں قاری کو شریک کرنے کے لیے اپنے سفر کے اہم واقعات کو تحریر کر دیا ہے، تاکہ آنے والی نسلیں ان سے روشنی حاصل کر

[1] دنیا میرا گاؤں، ص ۱۹۷-۱۹۶

سکیں۔انھوں نے ہندوستان اور دوسرے ممالک کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا اور مختلف سطحوں پر تضادات کا حال بھی لکھا ہے۔جن ممالک کا سفر کیا ہے وہاں کے بارے میں قابل ذکر باتیں بھی درج کردی ہیں اور پورے سفر کے دوران جہاں انھوں نے اپنی آنکھیں کھلی رکھی ہیں وہیں روزمرہ کے سیاسی حالات پر بھی ان کی نظر گہری رہی ہے، وہ جس ملک میں بھی گئے ہندوستان کے سیاسی حالات سے باخبر رہے۔۲۶ر ستمبر کے تحت لکھتے ہیں:

''پنڈت جی کل نیویارک پہنچے۔آج اخبار میں ان کے ہوائی اڈے کے انٹرویو کی (اور اچکن اور سرخ پھول کی!) خبر تھی۔کس قدر فرق ہے ان کے انک اور انسانیت کے لہجہ میں اور صدر امریکہ کے اندازِ خداوندی (''ہم سب ملکوں کو مالی مدد دے کر ان کی روح اور جسم کا علاج کرلیں گے'') اور کرشچیف کی کڑک اور گرج میں کہ (''اگر ہماری بات نہ مانی جائے گی تو نہ دنیا چل سکے گی نہ ہم اس کو چلنے دیں گے'') پنڈت جی نے تو بس اتنا کہا کہ مجھے آنے میں تامل تھا، لیکن اس لیے آیا ہوں کہ شاید میری شرکت سے صورتِ حال میں کچھ تھوڑی بہت بہتری پیدا کرنے کی صورت بنے۔''اگر میری موجودگی سے ذرا سا فائدہ بھی پہنچنے کا امکان ہے تو میں دنیا کے پرلے سرے تک جانے کو تیار ہوں۔''اور یہ وہ شخص ہے جس کا سب کو انتظار ہے، جس کی قدر سب کے دلوں میں ہے۔ جس کی طرف مشرق اور مغرب کے نمائندوں کی نظریں ہیں اور جس کی قیادت کے لیے غیر جانب دار قومیں خود تیار ہیں!۔''کون کہہ سکتا ہے کہ میں مشرق اور مغرب میں Mediation کا فرض انجام دے سکوں گا...'' کیا تہذیب ضبط وانک کا نام ہے! کیا بحیثیت پالیسی کے بھی یہ اندازِ عمل وسخن، قوت اور قیادت اور خداوندی کے دعووں سے بہتر نہیں؟''[1]

انھوں نے ہندوستان اور دیگر ممالک کی ذہنیت کے حوالے سے بھی لکھا ہے۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

ہمارے ہاں کے برخلاف یہاں بھی انگلستان کی طرح ہاتھ کا کام کرنے میں کسی کو عار نہیں۔ بڑے، بچے، مرد، عورتیں سب ہر طرح کا کام حسب ضرورت کرنے کو تیار ہیں۔اعلیٰ تعلیم پر بہت خرچ

[1] دنیا میرا گاؤں، ص۳۵۶-۳۵۵

ہوتا ہے اس لیے تقریباً سب طلبا ہی کچھ نہ کچھ کام کر کے ایک حصہ خرچ کا خود اُٹھاتے ہیں اور جن طلبا کے والدین آسانی سے خرچ اٹھا سکتے ہیں وہ بھی اکثر اس پر راضی نہیں ہوتے بلکہ اخبار بیچ کر، پڑوسیوں کے گھر کے سامنے سے برف صاف کر کے، برتن مانجھ کر ڈالر کماتے ہیں اور کبھی کبھی تو اتنا بچا لیتے ہیں کہ ہائی اسکول سے نکلتے ہی موٹر خرید لیں! اپنے کام کے سلسلے میں سابق امریکن ایجوکیشنل کمشنر ڈاکٹر Studebaker سے ملاقات ہوئی جو اپنے عہدے سے سبک دوش ہونے کے بعد ایک بہت بڑے پبلشنگ ہاؤس میں Scholestic Magazine کے ایڈیٹر ہو گئے ہیں۔ (یہ پبلشنگ ہاؤس اسکول کی مختلف جماعتوں کے لیے ایک درجن سے زیادہ تعلیمی رسالے اور سیکڑوں اسکول کی درسی کتابیں Paper Backs شائع کرتا ہے جس کی تیاری میں ماہرین تعلیم، کمپنی کے تنخواہ دار ملازم اور مشورتی حیثیت سے سیکڑوں استاد شامل ہیں جو اشاعت سے پہلے ان کتابوں کے مسودوں کو اپنے ہاں آزما کر دیکھتے ہیں اور پھر سالانہ کانفرنسوں میں ان کے بارے میں مشورہ دیتے ہیں۔

انھوں نے بہ سبیل تذکرہ (بلکہ بغیر کسی عذر ہی کے!) بتایا کہ وہ کسی گاؤں میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے اور جب اسکول میں پڑھتے تھے تو اینٹیں ڈھونے کا کام کر کے فیس ادا کرتے تھے پھر اس شخص کو جس کے ہاں کام کرتے تھے۔ ان میں دل چسپی پیدا ہو گئی تو اس نے راج کا کام انھیں سکھایا جس کو یہ کالج کے دورانِ تعلیم میں برابر کرتے رہے۔ سیشن کے دوران میں بھی اور تعطیل میں بھی یہاں تک کہ انھوں نے اس میں باضابطہ پیشہ وری کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لی۔ جب کالج میں پروفیسر ہوئے اس وقت بھی تعطیل میں جا کر راج کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ ''جانتے ہو کیوں؟ علاوہ کام میں دلچسپی کے، لیکچرر کی تنخواہ سے زیادہ میں اس کام میں کما لیتا تھا۔ کام کی عزت میں ہڈیوں کے گودے میں پیوست ہے۔(It has been lived in the morrow of my bone)''[1]

بہت سارے ممالک کو انھوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے اور قوموں کے عروج و زوال کے راز کو بھی جاننے کی کوشش کی ہے۔ بغداد کے حوالے سے انھوں نے لکھا ہے:

[1] دنیا میرا گاؤں، ص ۳۴۰-۳۳۹

''بغداد بہت رونق کا شہر ہے۔ اس کی آبادی آٹھ اور دس لاکھ کے بیچ میں ہے۔ مغرب زدگی کا اثر بہت کافی معلوم ہوتا ہے۔ مردوں میں بہت بڑی تعداد سوٹ پہنتی ہے اور (شعائر اسلامی کے خلاف) شراب، جوا لحم خنزیر کا استعمال عام ہے۔ اس کو برا نہیں سمجھتے! عورتیں مغربی فیشن کے فراک پہنتی ہیں اور بہت زیادہ غازہ اور پوڈر کا استعمال کرتی ہیں۔ زیادہ تر سیاہ رنگ کی عبا اس لباس کے اوپر پہنتی ہیں۔ لیکن چہرہ اور ہاتھ وغیرہ نہیں ڈھانپتیں۔ پرانی نسل اور زیادہ عمر کی عورتیں (یا شاید زیادہ تر ''قدامت پسند'' خاندانوں اور مذہبی لوگوں کی عورتیں) چہرے پر بھی نقاب ڈالے رہتی ہیں۔ سنا ہے کہ وہ بھی گھروں میں بیٹھ کر جوا خوب کھیلتی ہیں اور کام کرنے میں زیادہ مستعد نہیں! کام میں مستعدی (معلوم ہوا) یہودی عورتوں کا حصہ ہے۔ جو گھر کا سارا کام خود کرتی ہیں اور اس کو بہت کفایت سے چلاتی ہیں۔'' [1]

مجموعی طور پر خواجہ غلام السیدین کا سفرنامہ ہمیں ایک نئی کائنات سے روشناس کراتا ہے۔ وہ ہمارے اندر ایک ایسے جذبے کو جنم دیتے ہیں جس کے زندہ ہونے سے زندگی سنور سکتی ہے۔ فرحت حسین نے ان سفرناموں کی خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ان میں صرف تہذیبی، معاشرتی اور دیگر معلوماتی جھلکیاں ہی نہیں ہیں بلکہ ان میں اپنی قوم اور دوسری قوموں کے فکری اور ذہنی رجحان اور معیار کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ سیدین صاحب کے زیادہ تر سفر تعلیم کے سلسلے میں ہوئے لیکن انھوں نے زندگی کے ہر پہلو کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ جہاں بھی گئے وہاں کے لوگوں میں شرافت، انسانیت اور ہمدردی کے جذبات تلاش کیے۔ عجیب اتفاق ہے کہ انھیں یہ اقدار ملتی بھی رہیں۔ ان سفرناموں میں غیر ملکوں کی چلتی پھرتی زندگی بھی ہے اور غور و فکر کرتے دماغ بھی نظر آتے ہیں۔ ان میں جغرافیائی اور تاریخی معلومات اور سفر میں پیش آنے والی دوسری معلومات بھی کچھ ہے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کا فاصلہ، وقت اور ذرائع وغیرہ کی تفصیل بھی ان میں مل جاتی ہے۔ سیدین صاحب ہمیں اپنے وقت کے پانی پر سے پرواز کرنے

---

[1] دنیا میرا گاؤں، ص ۲۷۰

والے ہوائی جہاز بھی دکھاتے ہیں، بازاروں میں بھی گھماتے ہیں اور کانفرنس ہال میں مفکروں سے بھی ملواتے ہیں۔ان سفرناموں میں وہ ہمہ گیری، جامعیت اور معنویت ہے جسے اردو کے جدید دور میں وسعت فکر، وسعت نظر اور وسعت مشاہدہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ سفرنامے سیدین صاحب کی شخصیت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں اور ان کے افکار وخیالات کو سمجھنے میں بھی مدد دیتے ہیں۔ یہ ایسی دستاویز ہیں جن سے دوسرے ملکوں کے تہذیبی، معاشرتی اور تمدنی آثار وکوائف کے بارے میں معلوم فراہم ہوتی ہیں۔'' [1]

خواجہ غلام السیدین کا نثری اسلوب سب سے الگ ہے ان کی سادگی میں بھی اتنا حسن ہوتا ہے کہ قاری اس اسلوب کا اسیر ہو جاتا ہے۔ بقول سیّد فرحت حسین:

''سیدین صاحب کی نثر میں ان کی طبیعت کی معصومیت، مزاج کی سادگی، دل گدازی وشگفتگی اور فکرونظر کی بلندی ووسعت پائی جاتی ہے جس کا اظہار ان کے سفرناموں میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ سفرناموں کے اسلوب کا امتیاز یہ ہے کہ سیدین صاحب نے ایک سچی تصویر کشی سے بیان میں واقعیت کا رنگ بھر کر معنویت اور دل کشی پیدا کی ہے۔عبارت کی سادگی وسلاست اور دل کشی قابل دید ہے۔سفر کی تمام تر جزئیات کو حقیقت کے روپ میں سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے جس کی وجہ سے بیان کی روانی، رعنائی اور اثر آفرینی میں قدم بہ قدم اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ان سفرناموں میں جو وضاحتی احساس پایا جاتا ہے اس سے کسی رکاوٹ کا احساس نہیں ہوتا بلکہ آگے بڑھنے کی کشش محسوس ہوتی ہے۔شروع سے آخر تک یہی کیفیت اور دلچسپی برقرار رہتی ہے۔

ان کی ایک خاص بات، بیان کا دھیما پن ہے جو سیدین کی دوسری تحریروں میں نہیں۔سفرناموں سے یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ سیدین فطرت کے حسن سے اتنے متاثر نہیں ہوتے جتنے سیرت کے حسن سے۔ان کی جمالیاتی حس پر تہذیب وتمدن اور انسانی اقدار کا پہرہ تھا۔وہ ناپائیدار حسن کے لیے صرف خیال کے بجائے صرف نگاہ کو کافی سمجھتے تھے۔اسی لیے ان سفرناموں میں تاثرات کا رنگ اتنا گہرا نہیں ہے جتنا

[1] دنیا میرا گاؤں، ص ۱۴

کہ واقعات کے بے کم وکاست بیان کی لطافت کا حظ ہے۔ حالات وواقعات اور نثری اسلوب کے اعتبار سے یقین ہے کہ یہ سفرنامے، اردو سفرناموں کے سرمائے میں ایک اہم اضافہ ثابت ہوں گے۔'' [1]

آوارگی: جاوید دانش

جاوید دانش نے ہوش کلکتے میں سنبھالا، لیکن ان کے ذہنی وفکری نظام کی تشکیل وتعمیر علی گڑھ میں ہوئی۔ علی گڑھ سے کسب فیض کے بعد وطن انھوں نے مالوف (کلکتہ) کی طرف مراجعت کی، ان کی فطرت میں چونکہ تحرک بیداری اور اضطرار تھا۔ اس لیے کسی ایک جگہ کھونٹے کی طرح گڑے رہنا یا ٹھہرنا مشکل تھا۔ کائنات کے اسرار ورموز سے واقفیت اور انگلستان ویورپ کے تہذیبی، ثقافتی، سیاسی، معاشرتی مطالعے کے شوق نے انھیں پیرس، لندن، نیویارک اور امریکہ وغیرہ کی سیاحت کے لیے اکسایا۔ وہاں انھوں نے جو کچھ دیکھا اسے من وعن، بلا کم وکاست قارئین کی عدالت میں پیش کر دیا۔ ۱۹۸۲ء میں اخبار مشرق کلکتہ کے سنڈے ایڈیشن میں پچیس تیس قسطوں میں یہ سفرنامہ شائع ہوا جس کا اظہار جاوید دانش کتاب کے مقدمے میں یوں کرتے ہیں:

''دوستوں کی دیگر جابے جا فرمائشوں کے ساتھ ایک فرمائش تھی کہ خاص خاص چیزیں اور کام کی باتیں نوٹ کرتے جانا۔ بس میں نے جو دیکھا رقم کرلیا اور رفتہ رفتہ یہ روداد آوارگی تیار ہوتی گئی۔ تین مہینے اور کچھ دنوں کی آوارگی میں میں نے جو کچھ دیکھا اور تجربہ کیا وہ آپ کے سامنے من وعن حاضر ہے۔ ایک سیٹ پروگرام کے باوجود جہاں مجھے ایک دن رکنا تھا وہاں چار دن رُکا اور جہاں ایک ہفتہ ٹھہرنا تھا وہاں ایک ماہ پڑا رہا! جو روز لکھتا رہا وہ جمع ہوتا گیا۔ جو رہ گیا وہ بھول گیا۔ کچھ مضامین کاہلی اور کچھ ڈاک کی نذر ہوئے۔ جتنا گھر والوں کو ملا جمع کر کے ''اخبارِ مشرق'' کلکتہ کے حوالے کیا جو ۱۹۸۲ء میں ہی تقریباً پچیس تیس قسطوں میں سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوتا رہا۔'' [2]

---

[1] دنیا میرا گاؤں۔ ص ۱۶-۱۵

[2] آوارگی۔ جاوید دانش علیگ، مقدمہ، پرنٹ ویل آفسیٹ میکلوڈ اسٹریٹ، کلکتہ، ۱۹۸۷

جاوید دانش تخیل کی بے پناہ قوتوں اور وسعتوں کے مالک ہیں۔ ان کے سینے میں ایک باخبر اور حساس دل بھی ہے جس کے لیے دنیا کی وسعت اور خلا کی پہنائی بھی ناکافی ہے۔ جاوید دانش کی یہ سیاحت اور سفر مغربی تہذیب وثقافت سے شناسائی اور علم وادب کے تئیں ان کی دلچسپی سے عبارت ہے۔ ''قید مقام'' سے گزر کر انھوں نے اس ''جہان دیگر'' کی جستجو کی، جس میں خارجی اور باطنی وجود کی آمیزش ہے، جس میں زمان ومکان کی کوئی قید نہیں۔ یہ ایک باطنی سیاحت Inner Journy ہے عرفان اور شعور کا سفر ہے۔

سیاحت بھی ایک تخلیقی تجربہ ہے، اس کے لیے بھی وہی آشفتگی، وہی جنون، وہی محنت، وہی یکسوئی انہماک، وہی آشفتہ سری وہی چاک دامانی، وحشت کا جذبہ اور حوصلہ چاہیے۔ کیونکہ سفر نام ہے حادثات، نادیدہ خطرات اور آفات کو دعوت دینے کا اور جنھوں نے آمدروفت کی دشواریوں اور سفر کی صعوبتوں کو خوش آمدید کہا انھوں نے دوسری تہذیب اور کلچر سے آگہی حاصل کی۔ دوسرے ممالک کے اسرار ورموز سے واقفیت میں کامیاب ہوئے یہی آشفتہ سری تھی جس نے جاوید دانش کو پیرس ولندن، نیویارک وامریکہ کی سیاحت اور صحرانوردی کے لیے مجبور کیا۔

سفرنامہ میں تخیل اور تفتیش کا امتزاج ہوتا ہے، سفری بیانیہ کی تشکیل میں ان دونوں عناصر کی قوت کارفرما ہوتی ہے۔ اس لیے آج تک اس کی ہیئت، فارم، تکنیک اور اسلوب کی تخصیص نہیں کی جاسکی۔ ہر سفرنامہ نگار اپنی صلاحیت، زبان وبیان پر دسترس، تفتیش وجستجو کے جذبے کی بنیاد پر اپنے اسفار کی روداد کو ضبط تحریر میں لاتا ہے۔ سفرنامہ نگار کے لیے تخلیقی صلاحیت کا حامل ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ سفرنامہ نگار اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر روداد سفر کو لفظوں کا پیرہن عطا کرتا ہے۔ اس میں تنقیدی شعور کا ہونا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ لفظوں کی تراش خراش بناؤ سنگھار، آرائش وزیبائش میں تنقید کی کارفرمائی اس کے حسن وجمال میں چار چاند لگا دیتی ہے۔

جاوید دانش نے اپنے سیاحت نامہ آوارگی میں اس تخلیقی کیفیت کو برقرار رکھا ہے اور تنقیدی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ انھوں نے اس سفرنامہ میں مختلف اقوام وملل، ممالک وامصار، اماکن وآثار، تاریخ، تہذیب و معاشرت کی تصویریں اس طرح کھینچ دی ہیں کہ یہ بہت سی جغرافیائی، سماجیاتی، تاریخی، تہذیبی اور عمرانیاتی

کتابوں کی مغز ماری اور ورق گردانی سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

شوق سفر اور جذبۂ سیاحت نے جاوید دانش کو پیرس بھی پہنچایا اور بینکاک بھی، فرینکفرٹ کی سیر بھی کرائی اور لندن کی بھی۔ جاپان بھی دکھایا اور ہانگ کانگ بھی۔ اور جس ملک کی سرحد میں قدم رکھا اس کا مطالعہ گہرائی سے کیا، اور اپنے ''سوز دروں'' کو ٹھنڈا نہیں ہونے دیا اور نہ ہی مطالعے و مشاہدے کے جذبے کو ماند پڑنے دیا۔

پیرس میں صرف پکاسو، پگالے اور پرفیوم ہی نہیں ایسے عجائب ونوادرات ہیں کہ جنھیں دیکھ کر دل حیران اور آنکھیں ششدر رہ جاتی ہیں۔ جاوید دانش نے صرف یہ نہیں بتایا کہ پیرس میں پانی مہنگا اور شراب سستی ہے، بلکہ اس شہر کی زندگی کا راز بھی فاش کیا اور یہ بتایا کہ وہاں کی زندگی کیسی ہے۔ وہاں کے عوام کی مصروفیات کیا ہیں۔ ان کی دلچسپی کن چیزوں میں ہے اور یہ بھی بتایا کہ وہاں کی راتیں دن سے زیادہ روشن اور بارونق ہیں۔ دن کی چہل پہل سے زیادہ رات، رات کی مستیاں اور بجلی کے قمقموں کی جگمگاہٹیں دلکش معلوم ہوتی ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''جیسے جیسے رات ڈھل رہی تھی راستہ کی رونق بڑھ رہی تھی۔ لوگ اتنے آرام سے ٹہل رہے تھے کہ گھر واپس جانے کا سوال ہی نہیں۔ میں اپنے وطن ہندستانیوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ ہم لوگوں کی آدھی زندگی اماؤں کے اس سوال کے جوب میں کٹ جاتی ہے کہ کہاں جا رہے ہو؟ اور بقیہ زندگی بیگم کے سوال میں گزر جاتی ہے کہ کہاں سے آ رہے ہو؟ یہ پیرس ہے یورپ کا دل۔ یہاں کوئی کسی سے کسی طرح کا سوال نہیں کرتا۔ گر کرتا ہے تو کوئی جواب دینے کی زحمت نہیں کرتا۔ ہر کوئی اپنے میں مگن ہر فرد آزاد۔'' [1]

پیرس آرٹ کے لیے مشہور ہے۔ جاوید دانش نے اس شہر سے ہماری آنکھوں سے ایسا رشتہ قائم کر دیا کہ ژاں پال سارتر، مولیر، لیونارڈو دی ونچی مونالیزا، سبھی زندہ اور متحرک کردار کی صورت میں دکھائی دینے لگتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ جرمن زبان سے ناآشنائی کے باوجود جاوید دانش نے تمام طرح کی معلومات کا خزانہ، آرٹ و کلچر کا نمونہ اس میں پیش کر دیا ہے۔

---

[1] آوارگی۔ جاوید دانش، پرنٹ ویل آفسیٹ میکلوڈ اسٹریٹ، کلکتہ، ۱۹۸۷ء، ص ۱۵

ساتھ پڑا ہو، لیکن اپنی حسیت اور حسیاتی کیفیت کے سہارے جاوید دانش نے تمام معرکہ سر کر لیا جسے سر کرنا واقعی سے سر سنگ پاش پاش کرنا ہے۔

گوئٹے کا شہر فرینکفرٹ یا کوپن ہیگن کے جگولوز ہوں، یا یہاں کا Graffity آرٹ، والٹ ڈزنی کی خیالی جنت ہو یا بالی ووڈ کی Hotties، سن سیٹ بلوارڈ جیسی عالی شان جگہ ہو سبھی مقامات کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ وہاں کی تصویر نگاہوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے۔

جاوید دانش نے سیاحت نگاری کی روایت کی تجدید کی ہے اور سفر نامہ نگاری کے فن، اسلوب، اصول و آداب کی ایسی پاسداری کی ہے کہ اس تجدید میں بھی روایت کی پابندی نظر آتی ہے۔

جاوید دانش نے پیرس، فرانس اور دیگر ممالک میں جو کچھ دیکھا، غور سے دیکھا اور پھر اسے بغیر کسی نمک مرچ مسالے کے کتاب میں تحریر کر دیا۔ پیرس کے ایک طوائف خانہ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

> ''گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ہم نے دیکھا کہ سامنے ایک مرکری سائن چم چم کر رہا ہے۔ وہ Lido تھا۔ پال نے بتایا کہ یہ اس علاقے کا بہت مشہور قحبہ خانہ ہے۔ گاڑی اب چل پڑی تھی۔ شانزالیزے کو واقعی لاہور کا مال روڈ یا پھر کلکتے کی چورنگی کہا جا سکتا ہے۔ اس علاقے سے نکلتے ہی ایک اور سائن بورڈ پر نظر اٹکی۔ میں مسکرا دیا Crazy Horse Saloon بہت خوب! مسٹر پال کیا یہاں گھوڑوں کی حجامت کا انتظام ہے۔ نام سے ایسا ہی لگتا تھا۔ پال نے ہنس کر کہا۔ گھوڑوں کی نہیں ہاں قیس کے ہم زاد اور دل جلوں کی حجامت ضرور ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک مشہور بار اور شبینہ کلب تھا۔ اس سے پہلے کہ ہماری حجامت کا نمبر آتا گاڑی کافی آگے نکل چکی تھی۔''[1]

امریکہ جو بہتوں کے لیے خواب تو بہتوں کے لیے باعث رشک ہے۔ کیونکہ انھیں امریکہ کی ظاہری چمک دمک، گلیمر، کشش اور ظاہری حسن متاثر کرتا ہے۔ لیکن انھیں اس ملک کی بے حیائی، عریانیت، فحش اور ننگے پن اور صنف نازک کے ساتھ استحصالی رویے کی خبر نہیں ہے۔ اہل مغرب نے صنف نازک (جو پردہ کی چیز ہے) کو آزادی کے فریب اور مساوات کے جال میں ایسا پھانسا کہ وہ اس کے مکر و فریب کا شکار ہوئی اور اس

[1] آوارگی۔ جاوید دانش، پرنٹ ویل آفسیٹ میکلوڈ اسٹریٹ، کلکتہ، ۱۹۸۷، ص ۵۰

نے بنت حوا کی ایسی درگت بنائی کہ جو صرف فیشن، ایڈ اور جسموں کی نمائش تک محدود ہو کر رہ گئی۔

اس لحاظ سے سب سے مسکین اور قابل رحم قوم وہی ہے جو دنیا پر اپنی برتری و فضل کا ڈھنڈورا پیٹ رہی ہے اور جس نے پوری دنیا میں ظلم و جبر کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ اس کے مکر و فریب اور نمود و نمائش پر جاوید دانش کاری ضرب لگاتے ہیں:

''دنیا کی سب سے ترقی یافتہ قوم جب فخریہ اعلان کرتی ہے کہ دنیا کی ساری آسائشیں، دنیا کا سب سے بڑا دریا مسی سپی، دنیا کی سب سے بڑی جھیل گریٹ لیکس، سب سے بڑا آبشار نیاگرا، سب سے وسیع تفریحی مرکز ڈزنی لینڈ، سب سے بڑی سرنگ آئزن ہاور، سب سے بڑا سیرس ٹاور ان کی ملکیت ہے تو وہ وقتی طور پر یہ بھول جاتی ہے کہ دنیا کی سب سے مسکین اور قابل رحم قوم بھی امریکی ہے۔

واپسی کے تمام راستے کھلے ہیں مگر اس قوم نے اپنی کشتی جلا دی ہے۔ مغربی سوسائٹی میں سب سے زیادہ بگاڑ یہاں کی پبلسٹی اور ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں نے کیا ہے۔ ٹوتھ پیسٹ سے لے کر ہوائی جہاز تک کے اشتہار میں عورت کی وہ درگت بنائی گئی ہے کہ بس... ہر جگہ، موڑ پر، اخبار میں، میگزین اور پوسٹر میں نسوانی جسم کے خدوخال کا وہ حشر کیا ہے کہ اللہ اللہ ـــــ فیض جیسے کہنہ مشق بھی کہہ اٹھے:

اٹھ ہی جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجیے

ان تمام شوریدہ سری کے باوجود امریکی ماہر نفسیات کو اس کا اعتراف ہے کہ قوم پستی کی طرف جا رہی ہے۔ خود قوم کو اس کا احساس ہے اور اب وہ نئے راستوں کی تلاش میں سرگرداں ہے اور خود کو نئے سانچوں میں ڈھال رہی ہے۔ مجھے بھی امید ہے کہ ذہنی کشادگی کو وہ تعمیری کاموں میں لگائیں گے!!!'' [1]

جاوید دانش ان کی تہذیب اور کلچر پر بھی طنز کرتے ہیں اور ان کی روشن خیالی، جدت پسندی، بے راہ روی اور اخلاقی زوال پر بھی روشنی ڈالتے ہیں، کیونکہ ان کا پورا معاشرہ اخلاقی دیوالیہ پن کا شکار ہے اس حمام

[1] آوارگی۔ جاوید دانش، پرنٹ ویل آفسیٹ میکلوڈ اسٹریٹ، کلکتہ، ۱۹۸۷، ص ۱۷۳-۱۷۲

میں سبھی ننگے ہیں۔ جو خود کو انٹلکچلول اور باشعور کہتے ہیں اور سارے امتیازات کا تمغہ خود لینا چاہتے ہیں وہ اخلاقی اعتبار سے کس حد تک پستی کے شکار ہیں۔ لکھتے ہیں:

''ان شاہراہوں پر سے ہوتے ہوئے فلمی ستارے شہرت کی بلندیوں کو چھوتے ہیں یا پھر اکسٹرا بن کر گمنامی کے اندھیروں میں گم ہو جاتے ہیں۔ سیکس نے اب نہ صرف ہالی ووڈ بلکہ پورے امریکہ کے ذہنوں کو ''نئی پرواز'' عطا کر دی ہے۔ فری سیکس کو اس سوسائٹی میں اب مرد اور عورت کے روایتی کردار اور محبت رفتہ رفتہ ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ مرد عورتوں سے بیزار اور عورتیں مردوں سے ناخوش۔ یہی علاقہ Gay لوگوں کے لیے مشہور ہے۔ پورے امریکہ میں سب سے زیادہ خواجہ سرا کیلیفورنیا اور پھر اس علاقے میں ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ بڑے بڑے ذہین لوگ، ڈاکٹر سے لے کر فلم اسٹار تک اس نفسیاتی مرض کے شکار ہیں۔ عورتیں بھی کم کم نہیں۔ انھوں نے بھی ''خود کفیل'' ہونا سیکھ لیا ہے۔'' [1]

آوارگی کو یوں بھی امتیاز حاصل ہے کہ اس سفرنامے میں ہندوستان کی تہذیب وثقافت اور جرمن کی تہذیب وثقافت میں مماثلت اور ہم آہنگی دکھائی گئی ہے۔ ہندوستانی آرٹ اور کلچر کو جرمن میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ فکری ونظری اختلاف کے باوجود ہندوستان اور جرمن کی تہذیب کلچر اور آرٹ میں قدرے یکسانیت ومماثلت پائی جاتی ہے۔ اسی اشتراک نے جاوید دانش کو جرمن کی خاک چھاننے کے لیے مجبور کیا۔ لکھتے ہیں:

''جس طرح جرمن میں ہندوستانی دارجلنگ چائے ہر فرد بشر کے لیے ایک ضرورت بن چکی ہے۔ اسی طرح ہندوستانی رقص بھارت ناٹیم، کتھاکلی وغیرہ کلاسیکی موسیقی اور آرٹ فلمیں جرمن شائقین کے دلوں میں گھر کر چکی ہیں۔ اہل جرمن بنگالیوں کی طرح کلچر اور آرٹ کے دلدادہ نظر آئے۔ فرینکفرٹ فلم کلب میں جرمن فلم دیکھنے کے ارادے سے گیا۔ مجھے چند تازہ دم اور جوان جرمن فلم ڈائریکٹروں کے نام پتے یاد رہ گئے تھے جیسے Herzoy Schloendorff وغیرہ

[1] آوارگی۔ جاوید دانش، پرنٹ ویل آفسیٹ میکلوڈ اسٹریٹ، کلکتہ، ۱۹۸۷ء، ص ۲۰۷

مگر وہاں اس دن کسی خاص ہندستانی فلم کی نمائش ہے جسے جرمن زبان میں ڈب کر کے دکھایا جانا تھا۔ پوسٹر سے لگا کہ فلم کچھ جانی پہچانی ہے۔ ذہن پر زور دیا اور یاد آ گیا۔ بڑی حیرت ہوئی اور خوشی بھی۔ مرنال سین کی فلم ''پرسورام'' دکھائی جا رہی تھی۔ لوگ کافی تعداد میں جمع تھے۔ آج کے شو کا اہتمام وی سی آر (V.C.R.) پر تھا۔ فلم میری دیکھی ہوئی تھی پھر بھی وہاں رک گیا اور شو کے بعد کلب کے سکریٹری سے ملاقات کی اور جب اسے پتہ چلا کہ میرا تعلق کلکتہ سے ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کلکتے کی معاشی اور سماجی زندگی آپ نے ابھی دیکھی، آپ کا اس فلم کے بارے میں کیا خیال ہے۔ مسٹر سام ہمبولٹ (Sam Hambolut) نے بتایا کہ اس فلم کو دیکھ کر میرا دل بے اختیار کلکتہ جانے کے لیے مچل اٹھا۔ مگر کیا واقعی آپ کا شہر دم توڑ رہا ہے۔ کاش میں کچھ کہہ سکتا۔ میری خاموشی دیکھ مسٹر سام نے بات آگے بڑھائی اور بتایا کہ ستیہ جیت رے، مرنال سین وغیرہ جرمنی میں کافی پسند کیے جاتے ہیں اور فلم ''پرسورام'' دو سال پہلے Manherim Festival میں آئی تھی جس کے ویڈیو کیسٹ خاص طور پر آج کے شو کے لیے منگوائے گئے تھے۔ اس فلم فیسٹول میں بمل رائے کی ''دو بیگھا زمین'' رے کی ''آرانیر دن راتری'' مرنال کی ''پرسورام'' اور مظفر علی کی ''گمن'' بہت سراہی گئی تھیں۔

ہمارے مصور مقبول فدا حسین بھی جرمنی میں بہت مشہور ہیں اور اکثر ان کی مصوری کی نمائش ہوتی رہتی ہے۔ ہندوستانی کتھک اور اوڈیسی (Odissi) رقص کے بخار میں جرمنی والے بری طرح مبتلا نظر آئے۔ جس طرح ہمارے شہر میں انگریزی بات چیت (Spoken Englhish) کے تین اور چھ ماہ والے کورس کی بھرمار ہے اسی طرح جرمنی نازنینوں کے لیے ہندوستانی رقص سیکھنے کے لیے ہر جگہ دو مہینے اور چھ مہینے کی ٹریننگ کلاس جاری ہیں۔'' [1]

''آوارگی'' صرف جاوید دانش کا وجودی سفر نامہ ہی نہیں ہے بلکہ جن اماکن و امصار، سے وہ گزرے ہیں وہاں کے موسموں، ماحولیات، ماکولات و مشروبات کے اثرات بھی ان کی نثر میں در آئے ہیں۔ ان کی

[1] آوارگی۔ جاوید دانش، پرنٹ ویل آفسیٹ میکلوڈ اسٹریٹ، کلکتہ، ۱۹۸۷، ص ۷۶-۷۷

نثر میں حیاتین کی تلاش بہ آسانی کی جاسکتی ہے کہ ان کی نثر کا حیاتین سے بھی مستحکم رشتہ قائم ہوگیا ہے۔ جن ممالک کا انھوں نے سفر کیا ہے وہاں کے ''فوڈ کلچر'' کے بارے میں بھی اتنی ساری معلومات اکٹھا کردی ہیں کہ کتاب اچھی خاصی Foodies Paradies بن گئی ہے۔

جاوید دانش کی نثر میں تموج وطغیانی ہے، ان کی نثر میں رنگوں کا حسین امتزاج ہے، نثر میں ملاحت بھی ہے اور صباحت بھی۔ تازگی بھی ہے اور شگفتگی بھی۔ ان کی نثر میں ابہام نہیں وضاحت ہے اس لیے قارئین کو اس کے مطالعے کے وقت ترسیلی دشواریوں سے نہیں دوچار ہونا پڑتا۔ ان کی نثر میں بہاؤ اور روانی کے ساتھ جادو بیانی ہے۔

''آوارگی'' کلچر گیلری بھی ہے جس میں ادیب، شاعر، مصور، آرٹسٹ کی تصویر اور ان کے شاہکار بھی شامل ہیں جس کی وجہ سے کتاب کی اہمیت ومعنویت بڑھ جاتی ہے۔

روزنامچہ سیاحت: خواجہ غلام الثقلین

خواجہ غلام الثقلین کا تعلق علی گڑھ کی اس نسل سے ہے، جس نے سرسید احمد خاں کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ سرسید کی صحبت سے فیضیاب ہوئے تھے، سرسید کی علی گڑھ تحریک سے فکر وعمل کی روشنی اور علم کی بصیرت حاصل تھی۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے زمانے میں شبلی، حالی، محسن الملک وقار الملک، سرسید کی جدوجہد اور تحریک سے فیض حاصل کرکے اپنی علمی وادبی کائنات کو وسیع کررہے تھے۔ اور یہی عہد اردو کے عناصر خمسہ کا عہد کہلاتا ہے۔ علی گڑھ کے اسی علمی ماحول سے خواجہ غلام الثقلین اپنے افکار کی دنیا منور کررہے تھے۔

خواجہ غلام الثقلین دور بینی اور دروں بینی کی صفت سے متصف تھے اور سماجی علوم سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کی نگاہ کسی شے، مقام اور ملک کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے سیاق وسباق تک چلی جاتی تھی۔ اور اس وقت ان کا زرخیز اور گہربار قلم جو کچھ اگلتا وہ گنجینہ معانی ہوتا تھا۔ روس، قسطنطنیہ، عراق، ایران، عرب (مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ) کے انھوں نے کئی اسفار کیے اور ان اسفار میں انھیں جو تجربے ومشاہدے حاصل ہوئے ''روزنامچہ سیاحت'' میں انھوں نے بیان کردیے۔ ایک سیاح جن چیزوں کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا

خواجہ صاحب کی دوررسی ان میں حیرت واستعجاب کے ساتھ خوشی ومسرت کے پہلو تلاش کر لیتی ہے۔

''روزنامچہ سیاحت'' کے نام سے ظاہر ہے کہ یہ کسی ملک کا مکمل سفرنامہ نہیں بلکہ کئی ممالک کے مختصر سفر کی روداد پر مشتمل ہے۔ خواجہ صاحب تاریخ، سماجیات اور عمرانیات میں مہارت رکھتے تھے۔ چنانچہ جب وہ کسی ملک کا سفر کرتے ہیں تو وہاں کے تاریخی، جغرافیائی اور معاشرتی پہلوؤں پر خاص توجہ دیتے ہیں۔ وہ سفرنامے کو پرکشش اور دلچسپ بنانے کے لیے چھوٹے چھوٹے دلچسپ واقعات کا بیان خاص طور پر کرتے ہیں تاکہ اس سے قاری کی دلچسپی قائم رہے۔ تحیر وتجسس ان کے سفرنامے کی نمایاں خوبی ہے۔ وہ واقعات سفر کا تجزیہ کرنے اور کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی ذمہ داری قارئین کے سر ڈال کر خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔

> ''کل شام جب میں باکو میں ریل کے ویٹنگ روم میں تھا تو میرے جوتے دیکھنے کے لیے روسی سپاہیوں اور افسروں کا ہجوم آتا تھا وہ اس کو ہاتھ سے دیکھتے تھے، اٹھاتے تھے، قیمت دریافت کرتے تھے اور مثل بچوں کے بیتاب تھے۔ یہ جوتا سفید اور سیاہ چمڑے کے رسیوں سے مثل چارخانے کے خوبصورت بنا تھا۔ اور کسی ترکی افسر نے بصرہ میں ایک موچی سے بنوایا تھا۔ بعد میں اس کے پاؤں میں ٹھیک نہ آیا، دوکان دار سے میں نے خرید لیا۔ ایران میں اس کا تماشہ ایک دو آدمیوں نے کیا مگر روس میں عام ہجوم تھا۔'' [1]

''روزنامچہ سیاحت'' میں مرقع کشی کی عمدہ تصویر ملتی ہے۔ چونکہ خواجہ صاحب کو مرقع کشی اور تصویر کشی میں کمال حاصل ہے۔ ''روزنامچہ سیاحت'' میں بہت سے ایسے دلچسپ واقعات کا بیان ملتا ہے جس کا مطالعہ قاری کے لیے کئی معنوں میں اہمیت اور دلچسپی کا حامل ہے۔ دوران سفر خواجہ صاحب نے جہاز پر بینائی سے محروم ایک شخص کو دیکھا جو پڑھنا لکھنا جانتا تھا۔ اس ماڈرن اور سائنسی عہد میں یہ بات تعجب خیز نہیں معلوم ہوتی۔

اس زمانے میں کسی نابینا شخص کا پڑھا لکھا ہونا یقیناً عجوبہ سے کم نہ تھا۔ لکھتے ہیں:

> ''ایک نئی بات جہاز پر دیکھی یعنی ان لوگوں (مسیحی مشنری) نے ایک نابینا عیسائی عرب دکھایا، جس

[1] روزنامچہ سیاحت۔ خواجہ غلام الثقلین، تجارتی پریس، میرٹھ، ۱۹۱۲، ص ۲۸۴

نے بغداد میں اندھوں کے مدرسے میں معلّمی کی ہے۔ یہ شخص لکھتا ہے اور پڑھتا بھی ہے۔ ایک فرانسیسی نے اس کو نوشت وخواند کی تعلیم دی ہے۔ اور ایک سوئی سے ہر آواز پر کچھ نقطے بناتا ہے اور پھر انگلی سے مس کر کے ان کو پڑھتا ہے۔ چنانچہ میں نے عبارت بتائی۔ ''خواجہ غلام الثقلین، ساکن پانی پت از مضافات دہلی ملک ہندوستان'' اس نے اپنے لفظوں میں عبارت لکھی۔ پھر انھیں لفظوں میں مگر قدرے بدلے ہوئے تلفظ اس کو پڑھ دیا یہ طریقہ اٹھارہویں صدی کے آخر میں فرانسیسی پادری نے نکالا تھا۔'' [1]

پاکستان میں ڈھائی ہفتے: مولانا عبدالماجد دریآبادی

مولانا عبدالماجد دریآبادی صاحب طرز ادیب، منفرد انشا پرداز، بے باک صحافی اور بے مثال نثر نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ علمی، ادبی اور صحافتی مشاغل میں مصروفیت کی وجہ سے مولانا عدیم الفرصتی کے شکار ہمیشہ رہے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے سیاحت اور سفر کے لیے وقت نکالا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ سفر پہ نکلنا نادیدہ آفتوں کو دعوت دینا اور خود کو ہلاکت کے منہ میں ڈالنا تھا، کیونکہ اس وقت آمدورفت کے وسائل نہیں تھے اور نہ ہی لوگوں میں سفر کا چلن عام تھا۔ اس کے باوجود مولانا پاکستان کے سفر پر روانہ ہوئے اور وہاں ڈھائی ہفتے قیام کیا۔ اس کے علاوہ بھی مولانا نے ملک و بیرونِ ملک کے کئی سفر کیے۔ تاثرات دکن، سفر حجاز اور ''ڈھائی ہفتہ پاکستان میں'' مولانا کے سفر کی روداد، کیفیات اور مشاہدات پر مشتمل ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریآبادی اردو کے مشہور اور معتبر اخبار سچ، صدق اور صدق جدید کے بانی اور مدیر تھے۔ ان کے تمام اسفار کے احوال انھیں اخبارات میں شائع ہوا کرتے تھے۔ عبدالقوی دریابادی نے مولانا کے اندرون ملک کے اسفار کو ''سیاحت ماجدی'' کے نام مرتب کیا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی زبان میں بلا کی تاثیر تھی چونکہ وہ زبان و بیان کی باریکی سے آگاہ تھے۔ سفرنامے میں ان کا لہجہ اور اسلوب نمایاں ہے۔ وہ بہت جلد معاملات کے اندرون تک پہنچ جاتے ہیں۔ پاکستان میں جب ان کی ملاقات ان کے دوستوں، بزرگوں،

[1] روزنامچہ سیاحت۔ خواجہ غلام الثقلین، تجارتی پریس، میرٹھ، ۱۹۱۲، ص ۵۳

عزیزوں سے ہوتی ہے وہ اپنی محرومی، مجبوری اور حسرت و یاس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

''کراچی میں بچھڑے ہوئے خدا جانے کہاں کہاں کے اور کب کب کے مل گئے۔ مولانا شوکت علی کے چشم و چراغ اور محمد علی کے بھتیجے اور داماد زاہد علی کو دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔'' [1]

مولانا کا یہ سفرنامہ پاکستان کے سیاسی حالات و سماجی مسائل پر مشتمل ہے۔ بچھڑے ہوئے لوگوں اور ہمدم دیرینہ سے مدت کے بعد اچانک ملاقات پر جو خوشی اور طمانیت کا احساس ہوتا ہے، اس کا اظہار اس رودادِ سفر میں مذکور ہے۔ زبان و بیان کی شیرینی، رواں دواں اسلوب اور واقعاتی تنوع کی وجہ سے یہ سفرنامہ اہمیت کا حامل ہے۔

---

[1] ڈھائی ہفتے پاکستان میں، مولانا عبدالماجد دریابادی، عبدالماجد اکیڈمی، لکھنؤ، میرٹھ، ۱۹۸۱

بابِ ششم

علی گڑھ میں مکتوب نگاری کا ارتقا

(بیسویں صدی کے مکتوب نگاروں کے حوالے سے)

اردو مکتوب نگاری بحیثیت صنف

علی گڑھ میں مکتوب نگاری کے ارتقا پر گفتگو کرنے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس صنف سے متعلق تھوڑی بحث کر لی جائے۔ 'خط' درحقیقت عربی لفظ ہے، جس کے معنی 'سطر' یا 'تحریر' کے ہیں۔ اس طرح 'خط' یا مکتوب وہ تحریر ہے جس میں اس کا محرر یا 'مراسلہ نگار' (مکتوب نگار) ذاتی خیالات و جذبات قلم بند کر کے اپنے کسی دوست، عزیز یا رشتہ دار (جسے اصطلاحاً 'مکتوب الیہ' کہتے ہیں) تک پہنچاتا ہے۔ موجودہ دور جدید ٹکنالوجی کا دور ہے جہاں ہم اپنے اعزا و اقارب سے موبائل یا کمپیوٹر کے ذریعے اپنی خیریت و عافیت ان تک پہنچاتے یا پھر ان کی خیریت و عافیت معلوم کرتے ہیں لیکن اس سے قبل اپنے دوستوں و رشتہ داروں کی خیریت معلوم کرنے کا ذریعہ یہی خطوط ہوا کرتے تھے جو ڈاک کے ذریعے بھیجے یا موصول کیے جاتے تھے۔ یوں تو تقریباً ہر پڑھا لکھا فرد خط لکھا کرتا تھا لیکن ان خطوط میں بعض وہ خطوط بھی شامل ہیں جو مشاہیر کے ذریعے لکھے گئے ہیں اور جو اپنی زبان و بیان کے لحاظ سے ادبی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ادب میں آنے کے بعد اس فن نے ایک صنف کی صورت اختیار کر لی اور اس کی بعض ہیئت و تکنیک کا بھی تعین کیا جانے لگا۔ لہٰذا اس کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر نسرین ممتاز بصیر یوں رقم طراز ہیں:

> ''ادبی اصطلاح میں خطوط نگاری باقاعدہ ایک صنف ہے جس کے اپنے حدود و معیار ہیں اور جس کی اپنی انفرادی ہیئت و تکنیک ہے۔ یہ صنف جب مخصوص رنگ میں ڈھل کر ادب کا پیرایہ اختیار کر لیتی ہے تو خطوط نگاری کے زمرے میں آجاتی ہے۔''[1]

لیکن بعض لوگوں کا استفسار ہے کہ مکتوب نگاری کو باقاعدہ ادب کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں

---

[1] اردو خطوط نگاری ایک مطالعہ: ڈاکٹر نسرین ممتاز بصیر، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۵، ص ۱۲

ڈاکٹر سید عبداللہ کا خیال ہے کہ:

''خطوط نگاری ادب کے دوسرے شعبوں کے برعکس اصلاً ادب نہیں بلکہ محض ایک ضروری اور افادی عمل ہے۔ خط نگاری خود ادب نہیں مگر جب اس کو خاص ماحول، خاص مزاج، خاص استعداد اور خاص فضا میسر آجائے تو یہ ادب بن سکتی ہے۔ مگر خط کو ادب بنانے کا کام بہت مشکل ہے..... یہ شیشہ گری ہے بلکہ اس سے بھی نازک تر..... خط نگاری اصلاً فن لطیف نہ بھی ہو تب بھی بعض اوقات فن کے درجۂ اعلیٰ تک پہنچ جاتی ہے۔''[1]

ان تمام مباحث سے قطع نظر خطوط کی اپنی ایک ادبی، تاریخی اور سماجی حیثیت بھی ہے۔ اردو میں لکھے گئے مختلف ادوار کے خطوط کا مطالعہ کرنے سے ہمیں اس زبان کے ارتقا سے متعلق بعض اہم معلومات اور پھر اس مخصوص دور میں اس کی حقیقی شکل کا بھی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس دور کے سماجی اور سیاسی حالات کیا تھے، اور خود مکتوب نگار کن حالات سے دوچار تھا، ان سب کا ذکر ان خطوط میں ملتا ہے۔ ساتھ ہی یہ خطوط مکتوب نگار کا ایک ہلکا سا سوانحی خاکہ بھی پیش کرتے ہیں جو اس کی سوانح تیار کرنے میں ایک اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ بقول نسرین ممتاز بصیر:

''ترسیل ابلاغ کے لیے خط کی ایجاد ہوئی۔ خط کا مقصد مکتوب الیہ کے احوال معلوم کرنا اور اسے اپنے حالات سے واقف کرانا ہے اسی مناسبت سے زندگی کے دوسرے مسائل و کوائف بھی اسی کے دائرۂ موضوعات میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ان خطوں میں مکتوب نگار کو ایک عام انسان کی مانند زندگی کے بہاؤ میں بہتے اور اس سے نبرد آزما ہوتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے کیوں کہ ان میں انسان اپنے دلی جذبہ و احساس اور حالات، وضاحت سے بیان کرتا ہے۔ جس طرح تمام انسان ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے ایک طرح کے ہوتے ہوئے بھی انفرادی شخصیت کے مالک ہوتے ہیں اسی طرح مکتوب نگار کی اجتماعی زندگی کے برخلاف اس کی خالص نجی زندگی کے نقوش بھی رقعات ہی کے ذریعہ متعین کیے جا سکتے ہیں۔ خطوط کے ذریعہ مکتوب نگار اپنی سوانح عمری کا ایسا بہت سا خام مواد

---

[1] وجہی سے عبدالحق تک: ڈاکٹر سید عبداللہ، بحوالہ۔ اردو خطوط نگاری ایک مطالعہ: ڈاکٹر نسرین ممتاز بصیر، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۵، ص ۱۲۔۱۳

فراہم کرتا ہے جو اس کے سوانح نگاروں کے لیے نہ صرف راست ماخذ کا کام دیتے ہیں بلکہ اکثر و بیشتر اپنے دور کے حالات کی جانب اشارہ بھی کرتے ہیں۔'' [1]

اردو مکتوب نگاری کی تاریخ

اردو کے ابتدائی مکتوب نگاروں میں ایک نام رجب علی بیگ سرور کا ہے۔ وفات کے کم و بیش سترہ سال بعد ان کے صاحبزادے میر احمد علی نے ان تمام خطوط کو یکجا کر کے 'انشائے سرور' کے نام سے شائع کیا جو ادبی لحاظ سے کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ رجب علی بیگ کا زمانہ وہ ہے جب لکھنؤ میں نواب واجد علی شاہ کی حکمرانی تھی، لیکن ساتھ ہی انگریزوں کے ذریعے ہندوستان کے مختلف خطوں کو برطانوی سلطنت میں ملانے کا کام بھی زور شور سے چل رہا تھا۔ پھر ایک ایسا وقت بھی آیا جب نواب واجد علی شاہ کو جلاوطن کر کے کلکتہ کے مٹیا برج علاقے میں محصور کر دیا گیا۔ لہٰذا اس کا ذکر رجب علی بیگ سرور اپنے ایک خط میں یوں کرتے ہیں:

''دفعتاً عجب واردات ہوئی کہ خبر ویرانی و بربادی لکھنؤ کو بکو مشہور ہوئی۔ شیشۂ دل سنگ حوادث سے چور ہوا۔ وہاں کا قیام نہ کسی طرح منظور ہوا۔ ہر چند مہاراج بہادر نے بڑی عنایت کی کفالت کی راہ سے بہت کچھ رعایت کی مگر دل و دماغ نہ رہا۔ بہر کیف افتاں و خیزاں اشک ریزاں لکھنو آیا۔ ایک عالم کو تہلکہ عظیم میں مبتلا پایا۔ شہر میں سناٹا، چھوٹا بڑا آفت میں مبتلا ہر گلی کوچہ میں انگریزی بندوبست اپنے اپنے میں میں ہر ایک مست۔'' [2]

رجب علی بیگ سرور کے درج بالا خط سے جہاں ایک طرف اس زمانے کے لکھنؤ کی حالت کا اندازہ ہوتا ہے وہیں دوسری جانب اس دور میں رائج مقفیٰ و مسجع اردو نثر کا نمونہ بھی ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے۔ لہٰذا ادبی، تاریخی اور سماجی اعتبار سے ان خطوط کی اہمیت کافی بڑھ جاتی ہے۔

1857 کے آس پاس کا ہی زمانہ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کا بھی ہے جنھوں نے اردو مکتوب نگاری

---

[1] مقدمہ، خطوط سرسید، مرتبہ ڈاکٹر نسرین ممتاز بصیر، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۵، ص ۵-۶

[2] بحوالہ۔ اردو خطوط نگاری ایک مطالعہ: ڈاکٹر نسرین ممتاز بصیر، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۵، ص ۶۳

میں ایک الگ اسلوب کی بنیاد ڈالی۔ غالب کی خطوط نگاری کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے 'مراسلہ' کو 'مکالمہ' بنا دیا۔ گویا ان کے خطوط تحریر نہیں معلوم ہوتے بلکہ یوں لگتا ہے جیسے کوئی ہمارے سامنے بیٹھا ہوا ہم سے ہم کلام ہے۔ فنی نقطۂ نظر سے یہی غالب کے خطوط کی سب سے بڑی اہمیت ہے۔ اس کے علاوہ غالب کے خطوط سے 1857 کی پہلی جنگ آزادی اور اس کے بعد انگریزوں کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں پر کیے جانے والے مظالم، خاص کر دہلی، جہاں غالبؔ کا قیام تھا، کے حالات پوری تفصیل کے ساتھ ملتے ہیں۔ غالب کے خطوط میں بلا کی چاشنی اور شیرینی موجود ہے، خاص کر ان کا مزاحیہ انداز واقعی تعریف کے قابل ہے۔ ذیل میں ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ میر مہدی مجروح کے نام 2/دسمبر 1859 کو لکھے گئے ایک خط میں دہلی کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بھائی! کیا پوچھتے ہو؟ کیا لکھوں! دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی؛ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع بازارِ جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلا پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو، دلّی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اِس نام کا تھا۔'' [1]

یوں اگر رجب علی بیگ سرور کے مذکورہ بالا خط کا موازنہ غالب کے اس خط سے کیا جائے تو زبان کی سطح پر ہمیں واضح فرق دیکھنے کو ملتا ہے، یعنی رجب علی بیگ سرور کے یہاں جس طرح ثقیل اور فارسی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، غالب کے یہاں اس کے بالکل برعکس عام فہم اور سادہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ غالب کے خطوط میں بوجھل پن کہیں نہیں نظر آتا اور واقعی ایسا لگتا ہے جیسے کوئی ہم سے باتیں کر رہا ہو۔

خطوط غالب پر تبصرہ کرتے ہوئے اردو کے ممتاز و معروف طنز و مزاح نگار رشید احمد صدیقی ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''غالب کے صاحب طرز ہونے کی نشان دہی اس سے بھی ہوتی ہے کہ ان کے رقعات کے مطالعے سے ان کی شاعری اور زندگی کے تمام داخلی اور خارجی پہلو سامنے آجاتے ہیں۔ ان کے رقعات سے ان کا پورا اعمال نامہ مرتب کر سکتے ہیں۔ الفاظ و عبارت کی دھوم دھام اور تام جھام سے آپ مرعوب

[1] خطوط غالب (انتخاب)، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۹۵، ص ۹

نہ ہو جائیں تو خط لکھنے والے کی ذات آپ پہچان لیں گے۔

غالبؔ کے ایسے خطوط بھی ہیں جن سے ان کی شخصیت کے بعض بڑے کمزور پہلو ظاہر ہوتے ہیں، ان خطوط پر پردہ ڈالنے اور غالبؔ کو معصوم ثابت کرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔ کوئی آدمی دنیا میں ایسا نہیں ہے جس میں کوئی کمزوری نہ ہو۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی کمزوریوں سے لوگ عام طور پر واقف نہ ہوں۔'' [1]

زبان کی یہ سلاست اور سادگی عہد سرسید تک آتے آتے مزید واضح ہو جاتی ہے کیوں کہ سرسید کا ایک خاص کمال یہی تھا کہ انھوں نے اپنے دوست واحباب سے یہ فرمائش کی تھی کہ اردو زبان کو نہایت سلیس اور عام فہم بنایا جائے۔ اسی لیے انھوں نے حالی، شبلی اور محمد حسین آزاد جیسے حضرات سے گذارش کی کہ وہ اردو نثر کو ثقیل اور بوجھل الفاظ کے دائرے سے باہر نکالیں۔ اردو ادب کی تاریخ میں یہ ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ خود سرسید نے بھی اسی اصول کو اپنی زندگی کا مطمح نظر بنایا۔ اپنے بیٹے سید حامد کے نام سرسید کا درج ذیل خط ملاحظہ ہو:

عزیز از جان حامد

تمہارا خط پہونچا۔ خیر و عافیت سے دل خوش ہوا۔ سید محمود کا آج ہی خط آیا ہے وہ بخیریت ہیں۔ وہ یکم اکتوبر کو یا آٹھویں اکتوبر کو برندری (کذا) سے روانہ ہوں گے اور ۱۶ یا ۲۳ کو بمبئی پہونچیں گے۔ اگر تمہارے نزدیک دہلی کے لوگوں کو کچھ ہرج و دقت نہ ہو تو میں احمد الدین کو علی گڑھ میں کالج کے متعلق پچیس تیس روپیہ کی نوکری پر بلالوں مگر یہ خیال ہے کہ اس کے چلے آنے کے بعد دلی میں گھروں میں کوئی شخص نہیں رہتا۔ تمہاری کیا صلاح ہے۔ بلانا مناسب ہے یا نہیں۔

والسلام۔ خاکسار۔ سید احمد

علی گڈھ ۷ ستمبر ۱۸۸۳ء [2]

عہد سرسید اور اس کے بعد بھی اردو میں مکتوب نگاری کا سلسلہ جاری و ساری رہا لیکن ان تمام خطوط کا

---

[1] تحقیق نامہ، شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور، ۹۵۔۱۹۹۴، ص ۷۳، بحوالہ رشید احمد صدیقی کے خطوط: پروفیسر آل احمد سرور، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص ۱۲

[2] خطوطِ سرسید، مرتبہ ڈاکٹر نسرین ممتاز بصیر، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۵، ص ۴۱۔۴۲

احاطہ کرنا یہاں ممکن نہیں ہے۔ ان حضرات کے خطوط گاہے بہ گاہے مختلف افراد اور اداروں کے ذریعے شائع ہو کر منظر عام پر آتے رہتے ہیں۔ جنگ آزادی کے دور کا ذکر کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کا حوالہ نہ دیا جائے تو یہ بددیانتی ہوگی۔ ''غبارِ خاطر'' مولانا کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے قلعہ احمد نگر کی اسیری کے دوران اپنے مشفق و ہمدم مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو لکھے ہیں۔ یہ خطوط مولانا کی اردو دانی کے بہترین نمونے ہیں۔ بقول پروفیسر محمود الٰہی:

''مولانا کے اسلوب کا ایک مظہر 'غبار خاطر' ہے۔ یہ وہ اسلوب ہے جسے 'جو حسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں' کا مصداق کہا جا سکتا ہے۔ یہاں مولانا کی 'کج کلہی' زیادہ نمایاں ہوگئی ہے۔ جب طالع بیدار کسی کو رات بھر سونے نہیں دیتا تو اس کو طرب آگیں بے خوابی کہتے ہیں۔ اسی طرب آگیں بے خوابی کے جلوے غبار خاطر میں بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ جلوے لذت اندوزی کے نمونے ہیں لیکن جسم اور ذہن کی لذت اندازی نہیں، روح کی لذت اندوزی!'' [1]

مولانا کے یہ خطوط ایک طرح سے پورے پورے مضامین ہیں جس میں انھوں نے جس نقطے کو بھی موضوع بحث بنایا ہے اس پر پوری پوری تفصیل رقم کی ہے۔ لیکن اندازِ بیان میں ایسی دلکشی ہے کہ قاری پر کچھ بھی گراں نہیں گزرتا اور وہ سب کچھ بھول کر اس کی رنگینی و رعنائی میں گم ہو جاتا ہے اور بے اختیار اس کی زبان سے لفظ 'واہ' نکل جاتا ہے۔ چائے پر مولانا کی فلسفیانہ گفتگو ملاحظہ ہو:

''آپ کو معلوم ہے کہ میں ہمیشہ صبح تین سے چار بجے کے اندر اٹھتا ہوں، اور چائے کے پیہم فنجانوں سے جامِ صبوحی کا کام لیا کرتا ہوں۔ خواجہ شیراز کی طرح میری صدائے حال بھی یہی ہوتی ہے کہ:

خورشید مے ز مشرقِ ساغر طلوع کرد
گر برگ عیش می طلبی، ترکِ خواب کن

یہ وقت ہمیشہ میرے اوقاتِ زندگی کا سب سے زیادہ پر کیف وقت ہوتا ہے، لیکن قید خانے کی زندگی میں تو اس کی سرمستیاں اور خود فراموشیاں ایک دوسرا ہی عالم پیدا کر دیتی ہیں۔ یہاں کوئی آدمی ایسا

[1] پیش لفظ، غبار خاطر (انتخاب)، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، دوسرا ایڈیشن، ۱۹۹۵، ص ۶

نہیں ہوتا، جو اس وقت خواب آلود آنکھیں لیے ہوئے اٹھے، اور قرینہ سے چاے بنا کر میرے سامنے دھر دے۔ اس لیے خود اپنے ہی دست شوق کی سرگرمیوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ میں اس وقت بادۂ کہن کے شیشہ کی جگہ چینی چائے کا تازہ ڈبا کھولتا ہوں، اور ایک ماہر فن کی دقیقہ سنجیوں کے ساتھ چاے دم دیتا ہوں، پھر جام وصراحی کو میز پر دہنی طرف جگہ دوں گا، کہ اس کی اولیت اسی کی مستحق ہوئی۔ قلم و کاغذ کو بائیں طرف رکھوں گا کہ سروسامانِ کار میں ان کی جگہ دوسری ہوئی۔ پھر کرسی پر بیٹھ جاؤں گا، اور کچھ نہ پوچھیے کہ بیٹھتے ہی کس عالم میں پہنچ جاؤں گا۔ کسی بادہ گسار نے شامپین اور بورڈو کے صد سالہ تہ خانوں کے عرقِ کہن سال میں بھی وہ کیف وسرور کہاں پایا ہوگا، جو چاے کے اِس دورِ صبح گاہی کا ہر گھونٹ میرے لیے مہیا کر دیتا ہے۔''[۱]

یہ تھا اردو مکتوب نگاری کی تاریخ کا ایک سرسری جائزہ۔ اب آیئے دیکھتے ہیں کہ مکتوب نگاری کے حوالے سے اردو کے غیر افسانوی نثر کے ارتقا میں علی گڑھ کا کیا رول رہا ہے۔

بیسویں صدی میں علی گڑھ سے وابستہ مشہور شخصیات کے خطوط

بیسویں صدی میں جہاں ادب کے اہم اور نئے رجحانات کو فروغ حاصل ہوا وہیں خط صرف نصف ملاقات کرنے اور مراسلہ کو مکالمہ بنانے کا ذریعہ نہیں رہ گیا بلکہ اس میں ایک معتبر ماخذ، قابل توجہ صنف ادب کے بہت سے محاسن پیدا ہوئے اور دھیرے دھیرے ان میں اضافہ ہوتا رہا۔ عام طور پر مشاہیر کی تحریروں کو قوم کے اجتماعی حافظے کا سرمایہ تصور کرنے والوں نے خطوط کی جمع آوری اور ان کی اشاعت میں فی زمانہ گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ مختلف ادبا، شعرا، رہنماؤں اور دانشوروں کے مکتوبات منظر عام پر آئے جن سے اصلاح سخن کی روایت کو فروغ پانے میں مدد ملی اور سوانحی مواد بھی بڑی حد تک سامنے آیا۔ ذیل کی سطور میں علی گڑھ سے وابستہ ان مشہور شخصیات کے خطوط پر تفصیلی گفتگو کرنے کی کوشش کی گئی ہے جنھوں نے بیسویں صدی میں اردو مکتوب نگاری کے ارتقا میں اہم رول ادا کیا۔

---

۹ غبار خاطر (انتخاب)، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، دوسرا ایڈیشن، ۱۹۹۵، ص ۶۶ - ۶۷

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے خطوط

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے تحقیق وتنقید، تدوین متن، خطبات ومقدمات اور فرہنگ ولغات کے ساتھ ساتھ اردو مکتوب نگاری کی روایت کو بھی فروغ دیا۔ ان کے مکاتیب رسالہ اردو، قومی زبان، اردو ادب، ہم قلم وغیرہ رسالوں میں متعدد اہل قلم کی کاوشوں کے ذریعہ منظر عام پر آتے رہے ہیں لیکن مجموعی طور پر ان مکاتیب کی تدوین کا کام ابھی باقی ہے۔ مولوی صاحب کے خطوط کے جو چند اہم مجموعے شائع ہوئے وہ یہ ہیں:

(۱) اردوئے مصفّیٰ (ڈاکٹر مولوی عبدالحق، بابائے اردو مدظلہم کے خطوط کا مجموعہ) مرتبہ عبدالحق جوبلی کمیٹی، کراچی، ناشر: ابوتمیم فرید آبادی، اردو بازار، لاہور، فروری ۱۹۶۱)

(۲) خطوطِ عبدالحق۔ مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، پنجاب یونیورسٹی پریس، لاہور، ۱۹۷۶

(۳) خطوطِ عبدالحق۔ مرتبہ محمد اکبرالدین صدیقی، اردو اکیڈمی، حیدرآباد دکن، ۱۹۶۶

(۴) مکتوبات بابائے اردو، ڈاکٹر مولوی عبدالحق بنام حکیم محمد امامی۔ مرتبہ محمد امام امامی، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۰

(۵) مکتوباتِ عبدالحق۔ مرتبہ جلیل قدوائی، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۶۳

مولوی صاحب کے خطوط ان کی سیرت وشخصیت کے ترجمان ہیں۔ ان خطوط کے ذریعہ ان کے علمی مشاغل ومصروفیات، اردو کے لسانی مسائل، ادبی معاملات اور انجمن ترقی اردو کی خدمات کے بہت سے گوشے منظر عام پر آگئے ہیں۔ موضوعات کے لحاظ سے یہ خطوط اہم ہونے کے ساتھ ساتھ زبان واسلوب کے اعتبار سے بھی اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ مولوی عبدالحق کی نثر میں جو سلاست، روانی، دلکشی اور تاثیر ہے وہ ان خطوط میں بھی پوری طرح نظر آتی ہے۔ اردو مکتوب نگاری کی روایت میں ان خطوط کی بڑی اہمیت ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کے خطوط

مولانا عبدالماجد دریابادی کا شمار اردو کے مایہ ناز ادیبوں میں ہوتا ہے۔ان کی تحریروں میں جو شستگی اور صفائی دیکھنے کو ملتی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔زبان وادب کے جن باریک نکتوں پر ان کی پکڑ تھی، اس کا اندازہ ان کی تحریروں کے مطالعہ کے بعد بخوبی ہوتا ہے۔اس کا خیال انھوں نے نہ صرف اپنی تحریروں میں رکھا ہے بلکہ اپنی تنقیدوں کے حوالے سے بھی انھوں نے اپنے دور کے ادیبوں اور صحافیوں کو مفید مشوروں سے نوازا ہے۔علامہ شبلی نعمانی، مولانا محمد علی جوہر، سرسید احمد خاں، علامہ اقبال، اکبرالہ آبادی، سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد غرض کہ اس وقت کی تمام بڑی شخصیتوں کی فکری اور شخصی جھلکیاں مولانا کے مکتوبات سے عیاں ہیں۔اس ضمن میں ان کے وہ خطوط قابل ذکر ہیں جو انھوں نے علی گڑھ سے تعلیم حاصل کرنے والی نامور ہستیوں کے نام لکھے ہیں، خاص کر ڈاکٹر عبداللطیف، سابق پروفیسر انگریزی، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد؛ روزنامہ قومی آواز، لکھنو کے سابق ایڈیٹر حیات اللہ انصاری اور دہلی یونیورسٹی میں عربی کے ممتاز استاد اور اردو کے صف اول کے ناقد اور محقق نثار احمد فاروقی کے نام۔مولانا عبدالماجد دریابادی کے اور بھی بے شمار خطوط ہیں جو ادب کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں لیکن مذکورہ بالا شخصیات کو لکھے گئے خطوط کو میں نے اس لیے اہمیت دی کہ ان تمام حضرات کا تعلق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے رہا ہے اور مولانا نے ان کے نام یہ خطوط 1950 کے عشرے میں لکھے ہیں، اور یہی دور میرے موضوع کا احاطہ کرتا ہے۔

مولانا کے یہ مکتوبات ''مکتوبات ماجدی'' کے نام سے کئی جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں جن کے مرتب ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی ہیں اور جسے 'ادارہ انشائے ماجدی کولکاتا' نے شائع کیا ہے۔

ڈاکٹر عبداللطیف کے نام 8/مارچ 1954 کو لکھے گئے ایک خط میں مولانا عبدالماجد صاحب مذہبی امور پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''افکار اسلامی کی تشکیل جدید پر آپ کا کتابچہ پہونچا آپ نے جو دلائل پیش کئے ہیں ان کے بڑے حصے سے مجھے اختلاف ہی نہیں سخت اختلاف ہے۔انتشار فکر، خلط مبحث، ناواقفیت فن ان سب کی

علامتیں کتابچہ مذکور میں موجود ہیں۔ تاہم جس نتیجے تک آپ پہونچے ہیں وہ چنداں غلط نہیں اس سے فی الجملہ اتفاق ہے۔

بجز قرآن ہر دینی کتاب کا جائزہ از سر نو ہر دور میں لیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی لازمی ہے کہ خود جائزہ لینے والے اس فن میں مستند معلم ماہرین کا درجہ رکھتے ہوں۔ ناواقفوں کے مجمع کا نام تحقیقی مجلس رکھ دینا مضحکہ خیز ہوگا۔ اس لئے میری رائے ہے کہ اس مجلس میں ایسے اشخاص ضرور رکھے جائیں جیسے مولانا مناظر احسن گیلانی نیز ان کے بعض تلامذہ جامعہ عثمانیہ، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ڈاکٹر میر ولی الدین سابق صدر شعبہ فلسفہ جامعہ عثمانیہ، مولانا محمد طیب صاحب دیوبند وغیرہم یا پاکستان کے مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی کراچی، مولانا ظفر احمد تھانوی ڈھاکہ، مولانا شاہ محمد جعفر لاہور۔ مجلس میں تاوقتیکہ ایسے ارباب فن شامل نہ ہوں گے بجائے مفید ہونے اور مضر ہی ہوگی۔'' [1]

مولانا کے اس خط کا مطالعہ کرنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ مذہبی امور پر ان کی پکڑ کس قدر مضبوط تھی۔ ساتھ ہی انھیں اس بات کا بھی پورا علم تھا کہ ان کے دور میں ایسے کون سے حضرات ہیں جو قرآن و حدیث پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے نہایت سنجیدہ اور مفکرانہ موضوعات کو بھی عام فہم انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کا منفرد اسلوب واضح طور پر ان کی تحریروں میں جھلکتا ہے۔

صحافت اور ادب دو ایسے میدان ہیں جن کا آپس میں ٹکراؤ ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ یہ تصادم ناگزیر یوں ہے کہ ان دونوں کا تعلق براہِ راست زبان سے ہے اور چونکہ ہر دور میں اخبار و رسائل کے قارئین کی تعداد، ادبی کتابوں کے قارئین سے زیادہ رہی ہے۔ اس لیے صحافت نے اکثر اردو کے الفاظ کا ہیولیٰ بگاڑا ہے، یعنی لفظ کا استعمال اس کے صحیح معنوں میں نہ کر کے اسے کسی اور طرح استعمال کیا ہے۔ یا پھر بعض دفعہ املے کے معاملے میں تضادات پیدا کیے۔ اس سے اردو کے بہت سے الفاظ اپنی حقیقی ہیئت و معنی کو چھوڑ کر دوسری شکل میں جانے پہچانے جانے لگے۔ لیکن ایسا بہت کم دیکھنے کو ملا ہے کہ کسی مخلص ادیب و شاعر نے ان صحافتی غلطیوں کو درست کرنے کی کوشش کی ہو۔ عبدالماجد دریابادی ایسے ادیبوں میں نہیں تھے۔ جب کوئی شخص کسی

[1] مکتوبات ماجدی (جلد چہارم): مولانا عبدالماجد دریابادی، مرتب، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، ادارہ انشائے ماجدی، کولکاتا، ۲۰۰۷، ص ۲۰۱

لفظ کا استعمال غلط کرتا تھا تو وہ اس پہ سرزنش ضرور کرتے تھے۔ حیات اللہ انصاری کو لکھے گئے کئی خطوط میں انھوں نے اپنی اس قسم کی خفگی کا اظہار کیا ہے۔ حیات اللہ انصاری، روزنامہ 'قومی آواز' لکھنؤ کی اشاعت کے ابتدائی ایام سے ہی، 1945 سے 1972 تک اس کے ایڈیٹر رہے۔ موصوف نہ صرف یہ کہ اردو کے صف اول کے صحافی ہیں بلکہ صاحب طرز ادیب بھی ہیں۔ ان کے ایک ضخیم ناول 'لہو کے پھول' کو کافی شہرت حاصل ہوئی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے رسالہ 'صدق' اور 'قومی آواز' کے مابین مختلف مسائل پر بحث وتکرار کے باوجود حیات اللہ انصاری کے مولانا سے بڑے خصوصی تعلقات تھے اور وہ ان کا بہت احترام کیا کرتے تھے۔ لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود دونوں کے درمیان ادبی نوک جھونک کا سلسلہ ہمیشہ چلتا رہتا تھا۔ اس ضمن میں حیات اللہ انصاری کے نام مولانا عبدالماجد دریابادی کے ذیل کے دو خطوط ملاحظہ فرمائیے:

''دریاباد

۸/اپریل ۱۹۵۴ء

بسم اللہ

برادرم السلام علیکم

رات کو 'ناول' پر نشریہ سنا، ریڈیو سے بہت کم کام لیتا ہوں، خبریں وغیرہ نہیں سنتا۔ جس خاص خاص تقریروں کے لئے کھولتا ہوں اور اسی ڈاک سے ریڈیو اسٹیشن کو اپنا سرسری تبصرہ بھی لکھ بھیجتا ہوں، (ایڈوایزری کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے یہ بھی کرنا پڑتا ہے) اس تبصرے میں تو داد ہی داد ہے۔ بقیہ الگ آپ سے دو ایک باتیں کہنے کی ہیں۔

(۱) 'زہرناک' یہ لفظ نہ میں نے کسی اہل زبان کو بولتے سنا یا لکھتے دیکھا اور نہ اردو کی لغت میں یہ لفظ ملا۔ قاعدے سے بھی لاحقہ، ناک، وصفیت کے معنی عموماً انہیں اسما کے ساتھ رہتا ہے جو فعلیت کا پہلو بھی رکھتے ہوں مثلاً 'خطرناک'، 'شرمناک'۔

(۲) ایک بار شاید آپ عدم تصنع پن بھی بولے، بے تصنعی میں کیا برائی تھی۔ بروزن بے توجہی، بے تعصبی، بے تکلفی، بے تعلقی اگر عم لانا تھا تو محض عدم تصنع کافی تھا۔

(۳) ۱۵منٹ میں اس سے زیادہ کیا کہا جا سکتا تھا۔ یہ تو بالکل ٹھیک ہے لیکن ذرا سرشار کے بے تکلف اور منشی سجاد حسین کے پر تکلف مزاح کے سلسلے میں عباس حسین ہوش کا نام لے آنا محض ان کی عزت افزائی ہی کرنا ہوئی وہ زبان صحیح جیسی بھی لکھتے ہوں لیکن معاذ اللہ ٹھس کتنی، آپ یقین فرمائیں کہ 'ربط وضبط' پڑھ ڈالنے کی میں نے بارہا کوشش کی لیکن ہر دفعہ ناکام رہا۔ نثر میں ٹھیک شیخ ناسخ کی شاعری کا برجستہ نمونہ!

(۴) آپ کی 'ٹاک' بڑی حد تک 'ٹاک' ہی تھی اور ایسا بہت کم ہوتا ہے عام طور سے لوگ مشقت و تعب کے ساتھ اپنے تحریری مقالے سناتے ہیں اور بعض تو جیسے ہجے بھی لگاتے ہیں۔'' [۱]

اسی طرح ایک دوسرے خط میں زبان کی لغزشوں سے متعلق حیات اللہ صاحب کو کیسی پھٹکار لگاتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

''دریاباد

۷ر ستمبر ۱۹۵۹ء

بسم اللہ

عزیز مکرم السلام علیکم

قومی آواز کی پالیسی سے مجھے بحث نہیں البتہ زبان کی لغزشیں خصوصاً خبروں کے کالموں میں ہمیشہ بہت کھٹکتی رہتی ہیں، بارہا آپ کو بھیجنے کو جی چاہا، ہمیشہ رہ گیا، آج فوراً قلم اٹھایا۔

۶ر ستمبر کا صبح ایڈیشن پیش نظر ہے۔ صفحہ ۸ کی آخری خبر کا عنوان ہے ''ایک طالب علم کے علاوہ تمام طلبا الہ آباد میں رہا کر دیے گئے'' علاوہ تو In addition کے معنی میں آتا ہے یہ موقع بجز یا سوا کا تھا۔

طلبہ کا صحیح املا طلبہ ہے فضلا کے وزن پر علماء فضلا، جہلا آتے ہیں طلبہ نہیں۔

اس کے علاوہ بارہا آپ کے ہاں Misconduct کے ترجمہ بدسلوکی اور بداخلاقی دیکھا۔ یہ دونوں ترجمے بالکل غلط ہیں اور بالکل دوسرا مفہوم رکھتے ہیں۔'' [۲]

---

[۱] مکتوبات ماجدی (جلد چہارم): مولانا عبدالماجد دریابادی، مرتب، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، ادارہ انشائے ماجدی، کولکاتا، ۲۰۰۷، ص ۲۳۰۔۲۳۱

[۲] مکتوبات ماجدی (جلد چہارم): مولانا عبدالماجد دریابادی، مرتب، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، ادارہ انشائے ماجدی، کولکاتا، ۲۰۰۷، ص ۲۳۳

اسی طرح مولانا نے نثار احمد فاروقی کے نام جو خطوط لکھے، ان میں بھی اسی قسم کی ادبی نوک جھونک ملتی ہے۔ نثار احمد فاروقی امروہہ کے رہنے والے اور دہلی یونیورسٹی میں عربی کے ممتاز استادوں میں تھے۔ ان کا شمار عصر حاضر کے اردو کے صف اول کے ناقدین اور محققین میں ہوتا ہے۔ مولانا ان کی تحقیق اور علمی ذوق اور کاوشوں کے بڑے مداح تھے۔ نثار احمد فاروقی کے نام کا درج ذیل خط ملاحظہ ہو:

''دریاباد

۲۴/اپریل ۱۹۵۴ء

بسم اللہ

کرم گستر وعلیکم السلام

میں نہ آیات مصحفی سے واقف ہوں نہ اعجاز حسین عرف جمنا خان سے آشنا پہلی بار یہ نام سننے میں آئے۔

اس قصبے کے تو یہ صاحب یقیناً نہیں اگر محلہ دریاباد، الہ آباد کے ہوں تو ممکن۔

مہذب لکھنوی و مہذب لکھنوی سے بھی مجھے نیاز حاصل نہیں۔ کتابیں کئی لکھی ہیں۔

بلا شائبہ انکسار عرض ہے کہ میرا مطالعہ کلیات و دواوین وغیرہ کے باب میں محدود در محدود ہے۔ شعر و شاعری سے تعلق صرف ذوق و تفریح کی حد تک ہے۔ اس سے زیادہ ان پر وقت صرف کرنا وقت ضائع کرنا ہے۔ کاوش و جستجو جو کچھ بن پڑی ہے صرف کتاب اللہ کے لئے مخصوص رکھتا ہوں۔

مصحف کی خدمت کے بعد مصحفی کے لئے گنجائش ہی کہاں رہ جاتی ہے۔

والسلام

عبدالماجد''[1]

ایک بار نثار احمد فاروقی مولانا کی ایک مشہور و مقبول تصنیف ''حکیم الامت'' پڑھ کر ان سے بیحد متاثر ہوئے۔ اس تصنیف کا مطالعہ کرنے کے بعد انھوں نے مولانا کو ایک بڑا ہی عقیدت مندانہ خط لکھا، مولانا نے

[1] مکتوبات ماجدی (جلد چہارم): مولانا عبدالماجد دریابادی، مرتب، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، ادارہ انشائے ماجدی، کولکاتا، ۲۰۰۷، ص ۲۴۹

اس خط کا جواب یوں دیا:

دریاباد

یکم فروری ۱۹۵۷ء

بسم اللہ

عزیز مکرم سلمہ اللہ وعلیکم السلام

آپ بھی آخر ان لوگوں میں نکلے جنہیں ملمع پر اصل کا دھوکا ہو گیا! خیر یہ حقیقت سے جتنا بھی دور ہو بہر حال آپ کو اجر اپنے حسن ظن کا تو مل ہی گیا!

جہاں تک ہر نئے مریض کو مشورہ دیتے رہنے کا تعلق ہے پرانا مریض بعض اپنے تجربات کی بنا پر ہر وقت حاضر رہتا ہے یہ سمجھ کر جب کبھی آپ لکھیں گے کچھ نہ کچھ عرض کر ہی دیا جائے گا۔ بس اس کے آگے اور کچھ نہیں یہ حدود ہمیشہ اور اچھی طرح ذہن میں رہیں۔ مطالعے کا جہاں تک تعلق ہے حضرت تھانویؒ کے مواعظ اور تصانیف متعلق سلوک وطریقت نمبر اول پر ہیں۔ زندہ ہستیوں میں حیدر آباد کے ڈاکٹر ولی الدین صاحب صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ ہر طرح قابل قدر و قابل استفادہ ہیں۔

مریض کو اپنے مرض کا احساس ہو جانا ہی بہت بڑی دولت ہے۔[1]

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مولانا عبدالماجد دریابادی کے یہ تمام خطوط ادبی اور مذہبی مباحث سے مملو ہیں۔ ان میں زبان و بیان کی وہ باریکیاں بیان کی گئی ہیں جو آج ہمارے لیے بیش بہا خزینہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان خطوط کا مطالعہ کیے بغیر ہم ادب کے ان باریکیوں کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے، لہٰذا یہی وہ عناصر ہیں جن کی بنیاد پر ہمارے مشاہیر کے خطوط کو غیر افسانوی نثر میں ایک منفرد و ممتاز حیثیت حاصل ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کے خطوط

ذاکر صاحب کے خطوط کے کئی مجموعے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ سے شائع ہو چکے ہیں۔

[1] مکتوبات ماجدی (جلد چہارم): مولانا عبدالماجد دریابادی، مرتب، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، ادارہ انشائے ماجدی، کولکاتا، ۲۰۰۷، ص ۲۵۰

یہاں پر ہم نے ان کے صرف انہی خطوط کو شامل کیا ہے جو انھوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی کو لکھے ہیں اور جنھیں پروفیسر مختارالدین احمد نے 'ذاکر صاحب کے خطوط (جلد سوم) میں جمع کیا ہے۔ ذاکر صاحب کے ان خطوط کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بری طرح کھٹکتی ہے کہ یہ خطوط صرف دفتری کام کاج کے سلسلے میں لکھے گئے ہیں، یعنی ان میں خشکی کا احساس قاری کو بری طرح ستاتا ہے۔ ان کے زیادہ تر خطوط خشک اور سپاٹ لہجے میں لکھے گئے ہیں۔ درج ذیل میں اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

صدر دفتر

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

مورخہ یکم نومبر ۱۹۳۶ء

مخدوم محترم مدظلہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

گرامی نامہ ملا۔ یاد فرمائی کا شکریہ۔ علی گڈھ میں اس مرتبہ تو چند منٹ بھی اطمینان سے گفتگو نہ ہوسکی، جس کا بہت افسوس ہے۔ مولانا مرحوم کی کتاب کو دیکھنے کا جو وعدہ آپ سے کیا تھا۔ افسوس کہ ابتک نوبت نہ آئی بہت نادم ہوں۔ گرمی کی تعطیل میں ارادہ تھا کہ اس کام کو پورا کردونگا۔ مگر اس وقت سے علالت کا کچھ ایسا سلسلہ چلا کہ کچھ نہ کرسکا۔ ستمبر اور اکتوبر میں یہاں سے رخصت پر رہا اور آج دو مہینہ بعد پہلی مرتبہ دفتر کا کام کررہا ہوں۔

نیازمند طالب دعا

ذاکر حسین [1]

ظاہر ہے کہ ایسے خطوط کو ہم ادب کا درجہ نہیں دے سکتے کیوں کہ اس میں ایسی کوئی خوبی نظر نہیں آتی جو اس کے ادبی فن پارہ ہونے پر دلالت کرتی ہو۔ ایک عام آدمی کے خط اور اس خط میں کوئی امتیاز نظر نہیں آتا۔ البتہ درج بالا خط میں ذاکر حسین نے ایک اہم کام کی طرف اشارہ کیا ہے جو مولانا محمد علی جوہر کی سوانح حیات رقم کرنے سے متعلق ہے۔ بقول پروفیسر مختارالدین احمد:

---

[1] ذاکر صاحب کے خطوط (جلد سوم): مولانا عبدالماجد دریابادی، مرتب، پروفیسر مختارالدین احمد، خدابخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۹، ص ۳۷

''مولانا محمد علی کی انگریزی کتاب Islam: Kingdom of God جس کا مسودہ غیر مکمل حالت میں مولانا مرحوم کے دوسرے کاغذات کے ساتھ بیگم محمد علی نے ذاکر صاحب کو بھجوایا تھا۔ ذاکر صاحب نے سارا ذخیرہ شفیق الرحمٰن قدوائی کے سپرد کیا اور انھوں نے اپنے شاگرد رئیس احمد جعفری کے حوالے کیا جو مولانا کی سوانح حیات لکھنے پر مامور ہوئے تھے۔ سیرت محمد علی کی تکمیل و اشاعت کے بعد وہ بمبئی چلے گئے اور یہ قیمتی ذخیرہ رئیس صاحب کے قائم کردہ ''محمد علی میوزیم'' میں محفوظ رہا۔ بعد کو پروفیسر محمد مجیب نے مذکورہ کتاب کا مسودہ افضل اقبال صاحب کے حوالے کیا جنھوں نے اسے My Life A Fragment کے نام سے مرتب کیا اور ناشر کتب شیخ محمد اشرف نے لاہور سے ۱۹۴۲ میں شائع کیا۔ اس کا ہندستانی ایڈیشن سیما پبلی کیشن دہلی نے ۱۹۷۹ میں نکالا ہے اور اس وقت وہی ممکن الحصول ہے۔''[1]

یوں ذاکر صاحب کے ان خطوط کی تاریخی اہمیت تو ہے لیکن ان کے خطوط کو ادب کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ یہاں پر ان کے ایک خط کا ذکر کرنا لطف سے خالی نہ ہوگا۔ اس خط میں ذاکر حسین صاحب کے ہندوستان کا صدر منتخب کیے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ خط کچھ یوں ہے:

راشٹر پتی بھون

نئی دہلی

یکم جون ۱۹۶۷ء

مخدوم محترم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

گرامی نامہ ملا۔ یاد فرمائی کا شکریہ۔ 'مبارکباد' کا شکریہ کن لفظوں میں ادا کروں۔ آپ بزرگوں کی دعاؤں سے یہ منصب نصیب ہوا ہے۔ آپ ہی کی دعاؤں سے شاید اس کے فرائض کو کما حقہ ادا کر سکوں۔ یقین ہے کہ ان سے محروم نہ رہوں گا، اور اگر یہ انعام ہے تو اس کا مستحق بنوں گا، آزمایش ہے تو اس میں پورا اتروں گا۔

---

[1] ذاکر صاحب کے خطوط (جلد سوم): مولانا عبدالماجد دریابادی، مرتب، پروفیسر مختار الدین احمد، خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۹، ص ۱۰۱۔۱۰۲

''گلہ'' میرے لیے تنبیہ ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ نہ بیچاری نیلوفر (میری منجھلی نواسی) ''ہوسٹس'' بنی ہے، نہ بننا چاہتی ہے۔ اخبار جو چاہتے ہیں لکھ دیتے ہیں۔ اپنی رائے کو خبر کی حیثیت دے دیتے ہیں۔ اور مخلص دوست انھیں باور کر لیتے ہیں۔ ہوا یہ کہ دو ایک انگریزی اخباروں کی 'مونث نامہ نگار' میری بیوی بچوں کو دیکھنے آئے (آئیں)، جنھیں پہلے شاید انھوں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ بیوی تو اپنی خاموشی سے بچی رہیں۔ بچی انگریزی بول لیتی ہے اس نے ان کے سوالوں کے الٹے سیدھے جواب دیے۔ شاید نامہ نگاروں سے زیادہ رواں انگریزی بولتی تھی۔ بس، فیصلہ کر لیا گیا یہ تو صدر کی 'ہوسٹس' ہوگی، دوسرے دن میری بیوی کی تصویر میرے ساتھ اخبار میں نکل گئی۔ بس، کیا تھا طے ہو گیا کہ 'یہ فرسٹ لیڈی' ہوں گی! اس کا قصہ یہ ہے کہ میرے ایک عزیز دوست تھے رگھونندن سرن، پیارے لال موٹر والے کے صاحبزادے۔ بیچارے ایک ہوائی حادثہ میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کی بیوہ رکشا شرن دہلی کی مشہور سماجی کام کرنے والیوں میں ہیں۔ میری بیوی کو بھی سرن کے تعلق کی وجہ سے جانتی ہیں اور اکثر ان کے پاس آتی رہتی ہیں۔ انتخاب والے دن بھی آئیں اور پہلے اندر گھر میں گئیں۔ میں لوگوں کے ہجوم میں باہر گھرا تھا اور آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ رکشا شرن نے اندر میری بیوی سے پوچھا کہ تمہارے میاں نے تمہیں بھی بتایا کہ وہ صدر ہو گئے۔ انھوں نے کہا کہ وہ تو صبح کے بعد ادھر آئے نہیں۔ رکشا اس پر مجھ سے بہت خفا ہوئیں کہ اپنی بیوی کو بھی آ کر خبر نہ کی اور باہر ہار پہن رہے ہیں! باہر میرے پاس آئیں اور کہا آپ بھی خوب آدمی ہیں کہ اپنی بیوی کو خبر تک نہ کی اور یہاں مردوں میں گھرے کھڑے ہیں۔ ابھی میرے ساتھ چلیے۔ میں نے کہا آپ چلیے میں موقع پا کر آ جاؤں گا۔ وہاں جو گیا تو انھوں نے زنانہ کمرے کے باہر ایک فوٹو گرافر (جسے وہ شاید ساتھ لائی تھیں یا وہیں سے پکڑ لیا تھا) بھی تھا۔ رکشا (نے) گویا میرا تعارف میری بیوی سے کرایا کہ یہ صدر ہو گئے ہیں اور آپ کو بتایا بھی نہیں۔ اتنے میں اور عورتیں بھی کمرے میں جمع ہو گئیں فوٹو گرافر نے Snapshot لے لیا۔ میں نے دیکھا، مگر میں سمجھا کہ یہ رکشا نے اپنے لیے تصویر کھچوائی ہے۔ دوسرے دن تصویر اخبار میں شائع ہو گئی۔ مجھے بھی اچھا نہ لگا اور میری بیوی تو بہت ناخوش ہوئیں۔ مگر

تصویر تو چھپ چکی تھی۔ صبر کرلیا۔ میری بیوی میری بیوی ہیں ''فرسٹ لیڈی'' نہیں ہیں۔ اس ساری روئداد کے معلوم ہونے کے بعد بھی آپ مجھ سے ناخوش ہوں تو میری بدنصیبی ہے۔

یہ خط بالکل نجی خط ہے۔ صرف آپ کی ذاتی اطلاع کے لیے۔

خدا کرے آپ بخیر ہوں۔ والسلام [1]

یہاں پر ذاکر صاحب کا حقیقی انداز اسلوب کھل کر سامنے آتا ہے۔ جیسا کہ خط کے اخیر میں انھوں نے لکھا ہے، یہ بالکل نجی خط ہے جہاں پر دو انسانوں کے بیچ کوئی پردہ نہیں ہوتا۔ یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں پر تصنع کے تمام رنگ اتر جاتے ہیں اور انسان اپنی حقیقی شکل وصورت میں نظر آتا ہے۔ لہٰذا یہاں پر ذاکر صاحب نے اپنی بات کو بیان کرنے کا جو طریقہ اور اسلوب اپنایا ہے وہ ادبی لحاظ سے بالکل سادہ اور سپاٹ ہے جس میں کوئی فنی کاریگری نظر نہیں آتی۔

مولانا احسنؔ مارہروی کے خطوط

مولانا احسن اتر پردیش کے ضلع ایٹہ کے ایک مشہور ومعروف گاؤں، مارہرہ کے رہنے والے تھے۔ وراثت میں کافی کچھ جائداد ملنے کے باوجود انھوں نے اپنی زندگی میں علمی وادبی کاموں کو ترجیح دی۔ 1922 میں اپنے بچوں کی تعلیم کی غرض سے احسن صاحب نے علی گڑھ کا سفر کیا، لیکن اسی سال اکتوبر میں مسلم یونیورسٹی کے انٹرمیڈایٹ کالج میں بطور استاد ان کا تقرر ہوگیا۔ بعد میں اس انٹر کالج کے مسلم یونیورسٹی میں ضم ہونے کے بعد مولانا یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے منسلک ہوگئے اور یہاں پر رہتے ہوئے تقریباً 16، 17 برس تک علمی وادبی خدمات انجام دیں۔

احسن مارہروی نے اپنی زندگی میں مختلف شخصیات کو خطوط لکھے، جن میں سے بعض حقیقی طور پر ادب کے دائرے میں آتے ہیں۔ مولانا کے ان خطوط کو ڈاکٹر عنوان چشتی اور صغیر احسن جلال آبادی نے 'مکاتیب احسن' کے نام سے یکجا کر دیا ہے۔ ان حضرات نے ان خطوط پر مقدمہ وحواشی بھی لکھے ہیں۔ مولانا احسن

[1] اردو خطوط نگاری۔ ایک مطالعہ، ڈاکٹر نسرین ممتاز بصیر، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۵ء، ص ۳۱۳

مارہروی کے خطوط پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے ڈاکٹر نسرین ممتاز بصیر ایک جگہ لکھتی ہیں:

''ان (مولانا احسن مارہروی) کے خطوط اردو مکتوبات کی تاریخ میں مولانا سید سلیمان ندوی اور اسی قبیل کے دوسرے اہل علم کے خطوط کے مقابلے میں رکھے جا سکتے ہیں۔ مولانا احسن مارہروی نے حالی اور آزادی کا زمانہ دیکھا تھا وہ خواجہ حسن نظامی، ڈاکٹر عبدالحق، نیاز فتحپوری، اکبر الہ آبادی اور پریم چند جیسے مشاہیر کے شریک عصر ہیں۔

یہ وہ دور تھا جب خطوط نگاری کا ایک صاف ستھرا اور سلجھا ہوا انداز منظر عام پر آ چکا تھا اور غالب کی نگارشات نے آنے والے مکتوباتی ادب پر گہرا نقش مرتب و مرتسم کیا تھا۔ اردو افسانہ، ناول پہلے بھی منظر عام پر آ چکے تھے۔ صنف انشائیہ کو فروغ ہو رہا تھا۔ تنقید و صحافت کے نئے معیار بن رہے تھے اس پس منظر میں احسن کے خطوط سامنے آتے ہیں۔

احسن مارہروی کے خطوط میں بے تکلفی، سادگی، سلاست و روانی ہے۔ قواعد زبان، جملوں کی ساخت، ترکیب لفظی حتی کہ املا کا اہتمام بھی موجود ہے۔''[1]

مولانا کے دو ایسے خطوط میرے پیش نظر ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مکتوب نگاری سے وہ کسی حد تک شغف رکھتے تھے اور اس کی ادبی و تاریخی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے خود اس کے لیے کوشاں تھے کہ داغؔ جیسے مشہور شاعر کے تمام خطوط کتابی شکل میں یکجا ہو جائیں۔ ان خطوط میں انھوں نے ''مکاتیب غالبؔ کی اہمیت و افادیت کی جانب بھی اشارہ کیا ہے، بلکہ اسی کو ''شمع ہدایت'' بنانے کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ نواب کلب علی خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''یہ واقعہ ہے کہ مرزا غالب کے خطوط اس وقت تک جس جس نے مرتب و شائع کیے ہیں ان سب میں ''مکاتیب غالب'' سب سے افضل سب سے اعلیٰ ہے۔ صحت کتابت اور پابندی املا وغیرہ کی خصوصیات ایسی ہیں جن کا وجود اور کہیں نہیں پھر ایسی کتاب کو شمع ہدایت نہ بنایا جائے تو اور کس کو بنایا جائے۔

---

[1] مکاتیب احسن (مع مقدمہ و حواشی)، جلد اول، مرتبین۔ ڈاکٹر عنوان چشتی، صغیر احسنی جلال آبادی، اردو سماج، جامعہ نگر، نئی دہلی، ۱۹۸۳ء، ص ۸۲

امید ہے کہ مزاج گرامی قرین عافیت ہوگا۔ مرزا داغ مرحوم کے بہت سے خطوط رامپور اور حیدرآباد میں مل سکتے ہیں۔ مگر افسوس کہ اب انتظار میں وقت گزارنا گوارا نہیں موجودہ ڈیڑھ سو خطوط ہی شائع کردوں گا۔'' [1]

اسی طرح داغؔ کے خطوط کا ذکر کرتے ہوئے ۸ر جون ۱۹۴۰ء کو مانی جائسی کو لکھتے ہیں کہ:

''کل کی ڈاک سے نوازش نامہ باعث مسرت و امتنان ہوا۔ یہ ایک خط لاکھ خطوں کے برابر ہے۔ پرانے کاغذات اور تبرکات کے ضائع ہو جانے کی وبا ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے۔ میری ایسی ایسی چیزیں غائب اور فنا ہوئی ہیں کہ جن کے خیال سے بے حد ملال اور تکلیف ہوتی ہے مگر صبر و شکر کے سوا کیا چارہ کار ہے۔ میں نے یہ خط کاپی پر صاف کرلیا۔ ریاست رام پور سے ۲۵ عرضداشتیں مل گئی ہیں جو نواب یوسف علی خاں و کلب علی خاں کو بھیجی گئی ہیں۔ اسی طرح سب خطوط ڈیڑھ سو سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ جابجا تلاش کی اور کر رہا ہوں مگر کہیں سے اب امید نہیں اس لیئے کوشش ہے کہ جلد از جلد ''انشائے داغ'' مکمل کر کے مطبع بھیجدوں۔ آخر میں پھر اس توجہ کا شکر گزار ہوں۔ اگر اس دوران میں کوئی اور خط یا اصلاح مل جائے تو بھیجدی جائے۔'' [2]

ان خطوط سے مولانا کے داغؔ کے خطوط کو یکجا کرنے کے انہماک کا پتہ چلتا ہے۔ آج ہم مکتوب نگاری کے جس فن پر گفتگو کر رہے ہیں، یہ انہی حضرات کی کوششوں کا ثمرہ ہے جس کی بدولت یہ بیش قیمتی خزانہ ہم تک پہنچا ہے۔ مولانا احسن نے داغؔ کے خطوط کو جمع کرنے میں کتنی پریشانیاں اٹھائیں اور اس کے لیے کس کس سے رابطہ قائم کیا، ان تمام چیزوں کی تفصیل ان کے خطوط میں مل جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے استاد فصیح الملک نواب مرزا خاں داغؔ کے خطوط ''انشائے داغ'' کے نام سے مرتب کیے تھے جسے بدقسمتی سے وہ اپنی زندگی میں شائع نہ کر سکے لیکن بعد از مرگ ان کی وصیت کے مطابق انجمن ترقی اردو ہند، دہلی سے یہ مجموعہ شائع کیا گیا۔

---

[1] مکاتیب احسن (مع مقدمہ و حواشی)، جلد اوّل، مرتبین۔ ڈاکٹر عنوان چشتی، صغیر احسنی جلال آبادی، اردو سماج، جامعہ نگر، نئی دہلی، ۱۹۸۳ء، ص ۸۸۔۸۹

[2] مکاتیب احسن (مع مقدمہ و حواشی)، جلد اوّل، مرتبین۔ ڈاکٹر عنوان چشتی، صغیر احسنی جلال آبادی، اردو سماج، جامعہ نگر، نئی دہلی، ۱۹۸۳ء، ص ۸۷

ناطق گلاوٹھی کے نام لکھے گئے درج ذیل خط سے مولانا کے اس انہماک کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے:

''کل ہند اردو کانفرنس دہلی کی سرسری ملاقات میں جناب سے استاد مرحوم کے خطوط کی نقل کے لئے عرض کیا تھا اور آپ نے وعدہ فرمایا تھا کہ جو خط مل گئے ہیں ان کی نقلیں بھیجدوں گا جس کی یاددہانی کے لئے میں نے ایک عریضہ حاضر خدمت کیا تھا مگر شومئ قسمت سے اس کا جواب نہیں ملا۔ یہ ممکن ہے کہ وہ خط نامکمل پتا ہونے کی وجہ سے دست بوس نہ ہوسکا ہو مگر آپ کی غیر معمولی شہرت وشخصیت ایسی نہ تھی جس کے لئے ناگپور کے سوا کسی اور پتے کی ضرورت ہوتی۔ آج پھر یہ کارڈ حاضر خدمت عالی کر رہا ہوں اور ایک صاحب سے مفصل پتا پوچھ کر لکھتا ہوں۔ استاد مرحوم کے خطوط کی ترتیب ختم ہو رہی ہے براہِ کرم اگر چند خطوط کی نقل عطا ہو جائے تو کرم ہوگا۔'' [1]

اردو کے ایک معروف صحافی اور ادیب عبداللطیف اعظمی کے نام مولانا کا درج ذیل خط ملاحظہ ہو:

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۶/۴/۳۷ء

۴۔ مارلیسن روڈ

لطف فرمائیں۔ تسلیم خلوص تضمیم

گرامی نامہ پہنچا۔ یادآوری کا شکریہ۔ جس مسئلے کے متعلق جناب نے خاکسار کی رائے دریافت کی ہے اس کا جواب حسب ذیل ہے۔

لفظ ''نکات'' کے باب میں مجھے ان حضرات کی رائے سے اتفاق ہے جو بکسر اوّل صحیح سمجھتے ہیں۔ اگر کسی لفظ کی صحت وعدم صحت کا مدار لغت پر ہے تو غیاث اللغات کی یہ عبارت پڑھی جائے۔ ''نکات'' بکسر اول جمع نکتہ و بضم محض غلط، چرا کہ وزن فعال بضم از اوزان جمع نیست'' (از منتخب و مدار و بہار عجم و مزیل) نکتے کی ایک جمع ''نُکت'' بھی ہے وہ بضم نون ہے۔ جو حضرات نکات کو بضم نون غلط العام فصیح کے تحت میں لانا چاہتے ہیں وہ اگر مسٹر ہنسلے آئی سی ایس قسم کے لوگ ہیں تو ان کے نزدیک مرض، عرق ورق، شرف وغیرہ بھی بسکون اوسط ہونا چاہئیں۔ درآں حالے کہ یہ الفاظ بفتحتین ہیں۔

---

[1] مکاتیب احسن (مع مقدمہ وحواشی)، جلد اوّل، مرتبین۔ ڈاکٹر عنوان چشتی، صغیر احسنی جلال آبادی، اردو سماج، جامعہ نگر، نئی دہلی، ۱۹۸۳ء ص ۱۸۳۔۱۸۲

اسی طرح حذف بسکون اوسط ہے مگر آج کل یہ اور اس قسم کے دوسرے الفاظ تمام پی۔ ایچ۔ ڈی قسم کے حضرات کی زبانوں سے غلط استعمال ہوتے ہیں۔ بے شک بعض الفاظ ایسے ملتے ہیں جنھیں خلاف لغت استعمال کیا گیا ہے۔ تحقیق لغت میں قیاس آرائی بے کار ہے۔ صرف استعمال مستند و معتبر ہے بقول مشہور:

درسخن کار بر قیاس مکن　　ترش باشد ترش نہ تلخ تلخ

امروز۔ امشب۔ امسال۔ پر قیاس کر کے ام سحر۔ امشام۔ ام لیل نہیں بول سکتے۔ وہ اہل علم اور ارباب قلم جن کی تحریریں مسلّم و معتبر ہیں اور جنھیں مجتہد فن کا مرتبہ حاصل ہے اگر ان کے استعمال میں کوئی لفظ خلاف لغت مستعمل ہو گیا ہے اور متفق علیہ مروج ہو چکا ہے وہ فصیح سمجھائے گا۔ اور انھیں فصحا کو زمرۂ عام میں مانا جائے گا ورنہ بلحاظ استعمال تخت۔ وقت بسکون اوسط کو تخت۔ وقت بفتحتین بولئے منصّر (منحصر) اور فصیل کو (سفیل) بولنے والے جہلا اور بازاری لوگ ہیں اور اسی زمرے میں وہ حرف شناس آجاتے ہیں جنھیں فن سے آگاہی نہیں اور ادبی حیثیت نہیں رکھتے۔ ان کو عوام کہا جائے گا نہ عام۔ میرے نزدیک غلط العام فصیح سے وہ اہل علم مراد ہیں جو مستند و معتبر ہیں۔ اور وہ لوگ جو بوجہ ناواقفیت یا عدم توجہی فن تحقیق سے نابلد ہیں ان کو عوام میں شامل کرنا چاہئے۔ اور ان کے لئے غلط العام فصیح کے ساتھ یہ فقرہ بڑھانا چاہئے کہ غلط العوام قبیح۔

امید ہے کہ آپ اس مختصر جواب سے مطمئن ہو گئے ہوں گے مزید اطمینان کے لئے حدائق البلاغہ۔ بحر الفصاحت اور نئی تصانیف میں قواعد اردو وغیرہ دیکھئے۔ والسلام خیر ختام۔

راقم

سید علی احسن۔ احسنؔ مارہروی [1]

درج بالا خط سے مولانا احسنؔ مارہروی کی زبان دانی کا پتہ چلتا ہے۔ میرے خیال سے کسی ایک لفظ کی وضاحت اتنے مدلل انداز میں کسی اور نے شاذ و نادر ہی کی ہوگی۔ یہی وہ خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے یہ

[1] بحوالہ 'صفیہ کے خطوط: انجمن آرا'، مشمولہ علی گڑھ میگزین، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۶۷۔۱۹۶۶، ص ۱۲۵

مکتوبات حیات ابدی حاصل کر چکے ہیں۔ جس طرح سے اردو ادب کا ہر شعبہ علی گڑھ کی بیش بہا خدمات سے گرانبار ہے اسی طرح غیر افسانوی نثر کے ارتقا میں ان خطوط کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

صفیہ اختر کے خطوط

صفیہ اختر نے اپنے شوہر اور اردو کے مشہور شاعر جاں نثار اختر کے نام جو خطوط لکھے ہیں وہ 'حرف آشنا' اور 'زیر لب' کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ خطوط ایک شوہر کے تئیں بیوی کے روحانی اور دلی جذبات کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔ ان خطوط کا مطالعہ کرنے سے ایک مشرقی عورت کا پورا منظر نامہ ہماری آنکھوں کے سامنے جلوہ افروز ہو جاتا ہے کہ اس کی زندگی میں اس کے شوہر اور رفیق حیات کی کیا اہمیت ہے۔ ایک ایسی عورت کا تصور ابھر کر سامنے آتا ہے جو صبر و تحمل اور ایثار و قربانی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ ان خطوط میں جہاں شوہر سے قربت کے لمحات کی تمام تر خوشیاں اور رعنائیاں اور ان سے وابستہ مراسم کی یادیں تازہ ہوتی ہیں وہیں دوسری طرف شوہر سے فرقت کے لمحات کی اذیت ناک داستانیں بھی سننے کو ملتی ہیں۔ ان دونوں لمحات سے وابستہ یادوں کو الفاظ کا جو پیراہن عطا کیا گیا ہے، وہی ان خطوط کو ادب کا درجہ عطا کر کے ادبی تاریخ کا ایک انمول خزینہ بناتا ہے۔ صفیہ کے خطوط کے بارے میں مشہور شاعر فراق گورکھپوری اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ذاتی تعلقات اور گھریلو زندگی سے متعلق شوہر کے نام بی بی کے خطوط میں انسانیت کی اتنی قدریں، مانوسیت اور ہم آہنگی کی اتنی پاکیزہ مثالیں، اسلوب بیان کی بے تکلفی، خلوص و صداقت، نیک مزاجی و بلند کرداری کی اتنی جھلکیاں، ظرافت کا نمک صحیح معنوں میں جیون ساتھی کا لب و لہجہ جس طرح یہ قدر اول کی چیزیں اس کتاب میں موجود ہیں شاید ہی اردو یا کسی بھی زبان میں شوہر کے نام بی بی کے خطوط کے کسی دوسرے مجموعے میں نظر آسکیں۔'' [1]

صفیہ کے خطوط مشرقی عورت کے عام تصور سے یوں ممتاز ہیں کہ اس میں شوہر کو ایک 'دیوتا' کا درجہ

---

[1] حرف آشنا، علوی بک ڈپو، بمبئی

نہیں دیا گیا ہے بلکہ ان کے خطوط میں شوہر کو ایک 'دوست' کا مرتبہ عطا کیا گیا۔ ایک طرف ہمارے سامنے 'دیوتا' کا وہ تصور موجود ہے جس کے پیچھے عورت پوری طرح مظلوم و مجبور نظر آتی ہے، کیوں کہ یہاں پر اسے اپنے شوہر کے سامنے اپنے لب وا کرنے کی بالکل اجازت نہیں ہے۔ شوہر اگر حاکم ہے تو بیوی محکوم ہے۔ یہاں پر عورت کا کام صرف اور صرف اپنے شوہر کی اطاعت گزاری اور فرماں برداری کرنا ہے جس میں چون و چرا کرنے پر اسے اپنے شوہر اور اس کے گھر والوں کے غم و غصے اور عتاب کا شکار ہونا پڑتا ہے، ذلیل و خوار اور رسوا کیا جاتا ہے اور بعض مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں جس میں عورت کو قتل بھی کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس صفیہ کے خطوط میں شوہر کو ایک 'دوست' کا درجہ حاصل ہے جس کے بارے میں وہ 'حرف آشنا' کے دوسرے ہی خط میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''شوہر کا تصور اب میرے لیے ایک دیوتا کا تصور نہیں، ایک دوست کا تصور ہے لیکن ایسے دوست کا تصور جو مجھ سے بہت سی باتوں میں فوقیت رکھتا ہو، خیالات میں، ارادوں میں، عمل میں اور پھر اس فوقیت کو تسلیم کرنے میں مجھے ایک ابدی سکون حاصل ہوتا ہے۔'' [1]

صفیہ اختر کا یہ تصور موجودہ معاشرے میں شوہر و بیوی کے رشتوں کے درمیان در آنے والی ان کڑواہٹوں کا بہترین حل پیش کرتا ہے جس پر عمل پیرا ہو کر ازدواجی رشتوں کو مضبوط و مستحکم اور پائیدار بنایا جا سکتا ہے۔ آج کی عورت ہر چیز ماننے کے لیے تیار ہے لیکن یہ قبول کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں کہ وہ مرد سے کسی بھی معاملے میں کم تر ہے یا پھر مرد کو عورت پر فوقیت حاصل ہے اور یہی بنیادی سبب ہے جس کی وجہ سے آج کا انسانی معاشرہ ٹوٹتا بکھرتا ہوا نظر آتا ہے۔

اس لحاظ سے صفیہ اختر کے خطوط جہاں ایک طرف ایک وفا شعار اور ہمدرد بیوی کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں وہیں دوسری طرف وہ ازدواجی زندگی سے متعلق بعض اہم مسائل کا حل بھی پیش کرتے ہیں۔ یوں ان خطوط کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔

صفیہ اختر کے خطوط کی انہی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے ہمارے بعض نامور ادیب و شاعر نے ان کے

---

[1] بحوالہ 'صفیہ کے خطوط: انجمن آرا' مشمولہ علی گڑھ میگزین، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۶۷۔۱۹۶۶، ص ۱۲۶

بارے میں اپنی آرا کا اظہار کیا ہے اور ان کے محاسن بیان کیے ہیں، مثال کے طور پر مشہور افسانہ نگار کرشن چندر صفیہ کے خطوط کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صفیہ کے خطوں میں مجھے نئی ہندوستانی عورت کی جھلک نظر آتی ہے، وہ عورت جو بیوی ہے، رفیق بھی ہے، ساتھی بھی، وہ عورت جو مرد کے بازوؤں کی زینت ہی نہیں بلکہ خود اس کا ایک بازو ہے۔ اس کی قوت اور توانائی ہے۔ ایسی عورت جو اپنے شوہر سے الگ ہٹ کے بھی سوچ سکتی ہے، وہ عورت جو اپنے شوہر کی پرستش کرتے ہوئے بھی اس کی ناقد ہو سکتی ہے۔ اس کی ناصح ہو سکتی ہے۔ وہ عورت جو اپنے خاوند کی دوست ہے۔ اس کی ہمراز ہے۔ کبھی بھائی کی طرح بازوؤں میں بازو ڈال کر چلتی ہے۔ کبھی ایک عجیب انداز سے شفیق باپ کی طرح سمجھاتی ہے۔''[1]

جاں نثار اختر کے نام صفیہ کا ایک خط ملاحظہ ہو:

لکھنؤ

۲۷/جون ۱۹۵۰ء

اختر عزیز!

تمہارا خط ملا تھا۔ دو تین دن کیوں تمہیں خط نہ لکھ سکی ان جذباتی باتوں کو زبانی یا تحریر سے نہیں سمجھا جا یا جا سکتا۔ خط کو پا کر پوری شام مجھ پر عجب فاتحانہ انداز طاری تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کائنات مجھے حاصل ہے اور دوسری صبح جو سو کر اٹھی تو اس کا ردِ عمل دیکھو کہ بات بات پر آنسو امڈ آتے تھے۔ کل دن بھر قلم اٹھانے کی ہمت نہ ہوتی تھی، بہتیرا خود کو سمیٹنا چاہا مگر قابو نہ حاصل ہوتا تھا۔ میری جان مجھے مضبوط رہنے دو اپنی خاطر، میں آہنی عزم اور استوار ارادے چاہتی ہوں۔

اختر! مجھے معصوم نہ کہو، یہ تمہارے جذبے کی معصومیت تھی جو تم نے ایسا محسوس کیا، پھر بھی اگر سب کچھ تمہارے قدموں پر نچھاور کر کے سب کچھ پا لینے کا نام معصومیت ہے تو تم اسی طرح سے سوچ سکتے

---

[1] زیر لب (صفیہ اختر کے خطوط جاں نثار اختر کے نام)، صفیہ اختر، صفیہ اکیڈمی حیدر آباد، ص ۵۵۔۵۷

ابھی کتنا طویل وقفہ اور پریشان کن مراحل ہیں، میری تمہاری ملاقات میں۔ یہ کیسا شدید جبر ہے کہ نہ میں تم تک پہنچ سکتی ہوں اور نہ تم میرے پاس آسکتے ہو دوست۔ بعض وقت تو یہ بچے بھی وبال معلوم ہونے لگتے ہیں لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ یہ نہ ہوتے تو ان حالات میں زندگی بھی مشکل ہو جاتی۔ بہر حال ''دنیا ہوگی ہر قربانی کا کرنا ہوگا خون کا پانی'' والی بات ہے...

آج کل تو بعض وقت سب کے بیچ سے نکل بھاگنے کی خواہش پیدا ہونے لگتی ہے کسی کو کیا معلوم، دل ہر لحظہ کتنا بے چین رہتا ہے اس دل پھڑ کنے کی پہچان کسے ہو سکتی ہے کون ہمدردی کر سکتا ہے، کوئی نہیں آؤ تمہاری آغوش میں چھپ جاؤں اور تھوڑی دیر تک خوب پھوٹ پھوٹ کر رولوں میرا دل ہلکا ہو جائے گا۔''[1]

جاں نثار اختر کے خطوط

جس طرح صفیہ اختر نے بطور بیوی اپنے شوہر جاں نثار اختر کے نام خطوط لکھے، اسی طرح ان خطوں کا جواب جاں نثار اختر نے بھی انھیں دیا جس میں اپنی بیوی کے تئیں شوہر کے جذبات کی ترجمانی بہترین انداز میں ہوتی ہے جس کی مثال کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتی۔ مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی نے جان نثار اختر کے ان تمام خطوط کو یکجا کر کے 'خاموش آواز' کے عنوان سے 1981 میں شائع کیا۔ شوہر و بیوی کے درمیان رشتوں کی جو گرمی صفیہ کے خطوط میں دیکھنے کو ملتی ہے، تقریباً وہی جذبہ جاں نثار اختر کے خطوط میں بھی نظر آتا ہے۔ 'خاموش آواز' میں شامل پہلے ہی خط سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ خط ملاحظہ ہو:

گوالیار

میری صفو

تمہارے دونوں خط کہو تو زبانی سنا سکتا ہوں۔

تمہارے خط میں میرے لیے کتنی جاذبیت ہے تم کیا جانو، جی چاہتا ہے صفیہ یوں ہی باتیں کرتی

---

[1] سخن دلنواز (خطوط کا مجموعہ): خواجہ غلام السیدین، مرتبہ صغریٰ مہدی، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۸۵، ص ۴۹

رہے اور میں اس کے ہونٹوں کی نازک نازک جنبشوں کو مسلسل تکتا رہوں۔ ہر رات سوتے وقت تم میرے پاس آ بیٹھتی ہو اور میں نہ جانے تم سے کیا کیا باتیں کرتا ہوں تم مگر کوئی بات نہیں کرتیں، اس لیے کہ تم مجھ سے خفا ہو؟ نہیں نہیں میری صفیہ مجھ سے خفا نہیں ہو سکتی میں تو آج بھی اسی کی گود میں سر رکھ کر سوتا ہوں۔

میری جان۔ تیری ہر چیز تجھے یاد کرتی ہے۔ میں جب سے آیا ہوں بہت کم اُس کمرے میں جاتا ہوں۔ جیسے ہر شے مجھ سے پوچھتی ہے صفیہ کو کہاں چھوڑ آئے۔ آؤ میری صفیہ ورنہ میں تو پاگل ہو جاؤں گا۔ میں تمہارے بغیر اُس کمرے میں ایک رات نہ سو سکا۔ بیچ کے کمرے میں بستر اٹھا لایا ہوں۔ تمہارا بستر۔

ابھی آتی ہے بو بالش سے اُس کی زلفِ مشکیں کی

کل سے وہی کالج کی زندگی ہے اور میں، مشاعرے کا ہنگامہ بخیر گزر گیا۔ علی جواد زیدی نازل ہو گئے تھے۔ کل دوپہر کی ٹرین سے واپس گئے۔ تمہاری معتوب بوتل 'خشک' ہو گئی۔ کیا سوچنے لگیں میں نے تو ''قطرے قطرے کا حساب'' دیا ہے۔ تمہارے آنسو سے زیادہ تو شراب نہیں ہو سکتی۔

ہاں میری صفیہ یہ کیسے کہتی ہے 'تازہ' کے بجائے 'باسی' ہو چکی ہے۔ میں تو باسی کے لفظ پر کبھی گواہی نہ دوں گا 'شگفتہ' کے لفظ پر البتہ قسم کھا سکتا ہوں۔

تمہاری بھیجی ہوئی تصویروں میں سے مجھے کوئی تصویر پسند نہیں آئی۔ ان میں کوئی تصویر 'میری صفیہ' کی نہیں، ''میری صفیہ'' نے تو ۲۵ر دسمبر کو جنم لیا ہے۔ اب جب تم گوالیار آؤ گی تو میں خود تمہاری تصویر لوں گا۔ کیوں؟

اچھا اب تم اچھی اچھی باتیں کرو۔ مگر ٹھہرو مجھے پیار کر لینے دو۔

تمہارا

اختر

۱۶ر جنوری ۱۹۴۴ء

'خاموش آواز' میں جاں نثار اختر کے وہ خطوط بھی شامل کیے گئے ہیں جو انھوں نے خدیجہ کے نام لکھے

ہیں۔ عام خطوط کی طرح یہاں پر بھی روزمرہ زندگی کے حالات، ذاتی مصروفیات، سفر وغیرہ کا بیان اور علمی وادبی مشغولیات کا ذکر ملتا ہے۔ ان تمام خطوط میں استعمال کی گئی زبان سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ مکتوب نگار کا رشتہ مکتوب الیہ سے کیا ہے۔ بڑی عام فہم اور آسانی سے سمجھ میں آنے والی زبان کا استعمال کیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی اسلوب نگارش بالکل جداگانہ اور فطری پن لیے ہوئے ہے۔ [1]

خواجہ غلام السیدین کے خطوط

خواجہ غلام السیدین کے خطوط کا مجموعہ 'سخنِ دلنواز' ہے جسے صغریٰ مہدی نے مرتب کر کے مکتبہ جامعہ، دہلی سے شائع کرایا ہے۔ یہ خطوط سیدین کی زندگی کے بعض اہم پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہیں، مثال کے طور پر ہندوستانی وزارت تعلیم سے ان کا انسلاک، اندرون و بیرونِ ملک اس سلسلے میں ان کا سفر اور تعلیم و تعلم سے متعلق ان کی تمام سرگرمیوں کا ذکر ان خطوط میں اکثر مل جاتا ہے۔ بیگم صالحہ عابد حسین کے نام 30 ستمبر 1928 کے ایک خط میں پانی پت سے دہلی تک کے اپنے ایک سفر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پیاری مصداق، دعائیں! ہم رات بارہ بجے یہاں پہنچے۔ سید صاحب تو کسی مجبوری کی وجہ سے آ نہیں سکتے تھے۔ انھوں نے بنیا کو اور ایک شخص کو ہمارے سامان وغیرہ کے انتظام کے لیے پانی پت کے راستے دہلی بھیجا تھا۔ لیکن وہ ہمیں نہ مل سکے اور ہم ایک گاڑی سے محروم رہنے کے بعد افتاں و خیزاں یہاں پہنچے۔ اسٹیشن پر کئی آدمی تھے۔ کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ رات بہت تکان تھی اور طبیعت بے کیف تھی۔ اب اچھا ہوں۔'' [2]

اس کے علاوہ اپنے دوست واحباب اور خاص کر اپنی بہنوں اور بیٹیوں کے نام انھوں نے جو خطوط لکھے، ان کا مطالعہ کرنے سے ہمیں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ وہ لڑکیوں سے کتنی محبت کرتے تھے، ان کی تعلیم کے لیے کتنے فکرمند رہا کرتے تھے اور خاندان سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کا انھیں کس قدر احساس تھا۔ ساتھ

ہی ان خطوط میں شوخی وظرافت کے بعض انمول نمونے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔صالحہ عابد حسین کے نام 4/جون 1932 کو علی گڑھ سے لکھا گیا خط کچھ یوں ہے:

''پیاری مصداق، دعائیں! اظہر میاں کی معرفت، تمہارے پرچے سے تمہارا نتیجہ معلوم ہوا۔ فاحمد للہ علیٰ ذالک میں نہ کہتا تھا کہ یہ لڑکی صوبے میں اول آکر رہے گی۔میری طرف سے اکھن (اختر فاطمہ) اور ممن اور ان کے ''والدین'' اور تم سب کی چھوٹی بزرگ بہن احمد فاطمہ کو مبارک باد دینا او رکہنا کہ ان لڑکیوں نے اول درجے کو مذاق سمجھ رکھا ہے اور اسے ایسی کثرت اور آسان سے حاصل کر کے اس کی قدر گھٹا دی ہے۔اور بے چاری لڑکیوں کے سیکنڈ اور تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے کو تقریباً ایک قابل شرم حرکت بنا دیا ہے۔اسی لئے تو سرسید لڑکیوں کی اسکولی تعلیم کی مخالفت کرتے تھے کہ اگر یہ لڑکیاں پڑھ جائیں گی تو لڑکوں کو کیوں خاطر میں لائیں گی.....''[1]

درج بالا خط میں انھوں نے شوخی وظرافت کا بہترین نمونہ پیش کرتے ہوئے لڑکیوں کے ذریعے امتحانات میں اول آنے کا ذکر بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ان سطور کو پڑھنے سے ان لڑکیوں کو واقعی زبردست ہمت وحوصلہ ملے گا جو لڑکوں کے مقابلے اکثر پیچھے رہ جاتی ہیں اور اپنی بہترین کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر پاتیں۔

خواجہ غلام السیدین کے بعض ایسے بھی خطوط ہیں جن میں وہ اکثر مکتوب الیہ پر فقرے کستے ہیں۔یہ فقرے طنزیہ نشتر چبھونے والے نہیں ہوتے بلکہ ان میں مزاح کی چاشنی گھلی رہتی ہے جس سے مکتوب الیہ ناراض ہونے کے بجائے ان فقروں پر قہقہہ لگاتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ایسے فقروں کا استعمال ہم عام طور پر بہنوں اور بھائیوں سے گفتگو کے دوران کیا کرتے ہیں۔

اپنی دو بیٹیوں – صابرہ زیدی اور شاہدہ زیدی کے نام 18/جولائی 1969 کو ایڈمنٹن سے لکھے گئے ایک خط میں خواجہ غلام السیدین یوں رقم طراز ہیں:

''.....بقول شیکسپیئر کے:

---

[1] سخن دلنواز (خطوط کا مجموعہ): خواجہ غلام السیدین، مرتبہ، صغریٰ مہدی، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۸۵، ص ۴۹

The can do it extempore whenever it is roaring

(تم دونوں تو ایسے جاہل ہو کہ شاید یہ مشہور حوالہ بھی نہ سمجھو!) [1]

اسی خط میں دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''...زہرا آج کچھ مستعدی دکھا رہی ہیں لیکن خود کچھ پکانا ممکن نہیں۔ وہ تم سب کو بہت بہت سلام و دعا پیار کہتی ہے اور جس وقت پرسوں یہاں آ کر ذکیہ اور اپنی امی کے خط پڑھے تو خوب ''تیغ نگہہ کو آب دی'' (کون کون بیوقوف اس حوالے کو نہیں سمجھی؟)۔'' [2]

مندرجہ بالا دونوں مثالوں میں قوسین کے اندر جو جملے لکھے ہوئے ہیں، یعنی ''تم دونوں تو ایسے جاہل ہو کہ شاید یہ مشہور حوالہ بھی نہ سمجھو!'' اور ''کون کون بیوقوف اس حوالے کو نہیں سمجھی؟'' پڑھنے والے کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ بکھیر دیتے ہیں۔ اس میں نہ صرف یہ کہ بیٹی اور باپ کے درمیان پیار و محبت کی جھلک دکھائی دیتی ہے بلکہ ان لڑکیوں کی تعلیم سے متعلق باپ کتنا فکر مند ہے، اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ساتھ ہی یہ خطوط اعلیٰ طنز و ظرافت کے نمونے پیش کرتے ہیں۔

ایک مشفق اور ناصح باپ کے طور پر بھی خواجہ غلام السیدین نے بعض خطوط لکھے ہیں۔ زندگی کے ہر نازک موڑ پر اپنی بیٹی کی رہنمائی کرنا، اسے اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہنا اور اسے ہمیشہ اس کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے رہنا ہی ایک مہربان باپ کا فرض ہوتا ہے، جسے غلام السیدین نے اپنی بیٹی زہرا سیدین کے نام میسور سے 30/نومبر 1949 کو لکھے گئے ایک خط میں یوں ادا کیا ہے:

''میری جان سے زیادہ پیاری زہرا۔ اگرچہ یہ محبت کے اظہار کرنے کا کوئی بہت مؤثر طریقہ نہ ہوا کیونکہ زندگی مجھے ذرا بھی پیاری نہیں۔ تمہیں اپنی زندگی کی یہ اہم سالگرہ مبارک ہو اور خدا تمہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے اور تمہیں خدمت خلق اور حوصلہ دے کر محبوب خلق بنائے اور تم ہمیشہ اپنے موجودہ اور آئندہ خاندان اور رشتہ داروں کی آنکھ کا تارا بنی رہو۔ میں اس وقت تم سے سینکڑوں میل

---

[1] سخن دلنواز (خطوط کا مجموعہ): خواجہ غلام السیدین، مرتبہ، صغریٰ مہدی، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۸۵، ص ۳۲۲

[2] سخن دلنواز (خطوط کا مجموعہ): خواجہ غلام السیدین، مرتبہ، صغریٰ مہدی، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۸۵، ص ۳۲۲

دور ہوں لیکن اگر خیال کے پر ہوتے ہیں اور محبت آب و گل کے اس زنداں میں اسیر نہیں جس کو جسم کہتے ہیں تو میری محبت اور میری بہترین دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ آج تم شعور اور بلوغ کی ایک نئی منزل میں قدم رکھ رہی ہو۔ خدا کرے تم اس کی ذمہ داریوں سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہو کیونکہ یہ منزل ایسی ہے جب کہ انسان کا دل لازماً اپنے حقوق کی طرف جھکتا ہے لیکن اس کا ضمیر اور اس کی انسانی شرافت اور اس کا دماغ اسے یہ بتاتا ہے کہ ذمہ داریاں حقوق سے زیادہ اہم ہیں کہ حقوق خود بخود حاصل نہیں ہو سکتے بلکہ فرائض کی کامیاب انجام دہی کا نتیجہ ہوتے ہیں کہ اگر سب لوگ اپنے حقوق پر کم اور فرائض پر زیادہ زور دیں تو یہ دنیا بہت زیادہ خوشگوار اور با امن بنائی جا سکتی ہے۔''[1]

اسی طرح کے ایک اور خط میں اپنی بیٹی، بلقیس سیدین کو اس کی اٹھارویں سالگرہ پر بمبئی سے 4 ردسمبر 1950 کو یوں نصیحت کرتے ہیں:

''جان عزیز بلقیس! خدا کا شکر ہے کہ جس نے تمہاری اٹھارویں سالگرہ کی نعمت بخشی اور مجھے اس کے دیکھنے کے لیے زندہ رکھا۔ خدا تمہاری زندگی کے سارے راستے کو ایسی محبت بھری اور پیاری سالگرہوں کے سنگ میل سے سنوارے اور تمہیں اپنے دوستوں عزیزوں پیاروں (موجودہ اور آئندہ) کی آنکھوں کا تارا بنا کر رکھے۔

میری جان – یوں تو زندگی کا ہر دن اہم اور زندگی کی ہر سالگرہ ایک نئے باب کا آغاز ہے لیکن اٹھارویں سالگرہ کی ایک خاص اہمیت ہے کیونکہ اس کو بچپن اور بلوغ کی سرحد قرار دیا گیا ہے۔ خدا کرے تم آج جس منزل میں داخل ہو رہی ہو اس میں تمہاری خوبیاں اور نیکیاں اور صلاحیتیں زیادہ چمکیں اور اجاگر ہوں۔ اگر ان پر کسی عادت اور کمزوری کی گرد نے خفیف سا پردہ ڈال رکھا ہے تو تم اپنے ارادے اور استقلال سے اس کو دور کر ڈالو تا کہ تمہاری فطرت کا سونا کندن بن کے چمکے اور تمہاری اور تمہاری بہنوں کی بدولت تمہاری نیک اور محبت شعار ماں تمہارے نالائق لیکن پیار کرنے

---

[1] سخن دلنواز (خطوط کا مجموعہ): خواجہ غلام السیدین، مرتبہ، صغریٰ مہدی، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۸۵، ص ۳۲۳

والے باپ کا نام روشن ہو اور تمہارے سب عزیزوں کی تمہارے تعلق کی وجہ سے شگفتگی اور شیرینی پیدا ہو.....''[1]

خواجہ غلام السیدین کے یہ وہ خطوط تھے جن میں ان کے خاندانی اور سماجی رشتوں کا ذکر تھا۔ ان تمام خطوط میں انھوں نے بہت ہی عام اور سادہ زبان استعمال کی ہے لیکن ان کے بعض ایسے خطوط بھی ہیں جن کا شمار ادب کے اعلیٰ فن پاروں میں کیا جاسکتا ہے۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال صابرہ زیدی کے نام لکھے گئے ایک خط میں ملتی ہے:

''باتیں بہت سی کرنی تھیں بلکہ ہوسکتی تھیں مگر آج کل میرا قلم فرائض تحریر میں اس قدر مصروف اور طبیعت فعل تحریر سے اس قدر بیزار ہے کہ زبان قلم سے ان باتوں کا کرنا مشکل ہے۔''[2]

اس کو سمجھنے کے لیے ذہن پر تھوڑا سا بوجھ دینا پڑتا ہے لیکن اس میں مرکبات کا بہترین استعمال کیا گیا ہے۔ البتہ ایسے جملوں کی خامی یہ ہے کہ ان میں فطری پن نظر نہیں آتا بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایسے الفاظ لکھنے کی زبردستی کوشش کی گئی ہے۔ اس وجہ سے اس میں مصنوعی پن پیدا ہو گیا ہے۔ پھر بھی مجموعی طور پر خواجہ غلام السیدین کے ذریعے اپنے اہل خانہ کو لکھے گئے خطوط میں جہاں ایک طرف آپسی رشتوں اور میل محبت کا ذکر ملتا ہے وہیں دوسری طرف ان میں ایک باپ یا بھائی کی طرف سے اپنی بیٹیوں یا بہنوں کو کی گئی نصیحت بھی ملتی ہے جو کہ ان کے لیے زندگی کے ہر موڑ پر مفید اور کارآمد ہے۔

رشید احمد صدیقی کے خطوط

رشید احمد صدیقی کا نام آتے ہی ہمارے ذہن میں طنز و مزاح کے پٹاخے پھوٹنے لگتے ہیں اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا پورا منظر نامہ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ یہاں کا ماحول اور یہاں کی تہذیب اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ یوں اجاگر ہوتی ہے کہ جس کسی نے علی گڑھ کا سفر نہیں کیا اور مسلم یونیورسٹی کو

[1] سخن دلنواز (خطوط کا مجموعہ): خواجہ غلام السیدین، مرتبہ صغریٰ مہدی، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۸۵، ص ۳۳۳-۳۳۴

[2] سخن دلنواز (خطوط کا مجموعہ): خواجہ غلام السیدین، مرتبہ صغریٰ مہدی، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۸۵، ص ۱۸۴

نہیں دیکھا وہ اس کا نظارہ رشید صاحب کی ان تحریروں کو پڑھ کر کر لیتا ہے۔

بقول آل احمد سرور:

''رشید صاحب کی اہمیت اور معنویت کے کئی پہلو ہیں مگر اس بات سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ ان کی شہرت و عظمت کا دارومدار زیادہ تر ان کے طنز و مزاح کے سرمائے پر ہے۔ یہ رنگ یوں تو اس کی سبھی تصانیف میں جھلکتا ہے مگر خصوصیت سے مضامینِ رشید، خنداں اور خطوط میں جلوہ گر ہے۔ اس کے علاوہ گنج ہائے گراں مایہ، ہم نفسان رفتہ کے مرقعوں، خودنوشت آشفتہ بیانی میری اور طنزیات و مضحکات میں بھی جو آب و تاب ہے وہ اس مخصوص جوہر کی کارفرمائی کی وجہ سے بھی ہے:

رشید احمد صدیقی نے کہیں لکھا ہے کہ:

جو قوم اپنی خامیوں کو جس حد تک طنز و ظرافت کا نشانہ بنانے اور اس طور پر ان کی اصلاح کرنے کا حوصلہ اور ظرافت رکھتی ہے اسی حد تک اس کی بڑائی کا درجہ متعین ہوتا ہے۔'' [1]

لیکن جہاں تک رشید صاحب کے خطوط کا معاملہ ہے تو وہ ان خطوط کے شائع کرنے کے حق میں کبھی نہیں رہے۔ آل احمد سرور اس سلسلے میں ایک عجیب و غریب واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''یہ تو واضح ہو چکا ہے کہ رشید صاحب اپنے خطوں کی اشاعت پسند نہ کرتے تھے۔ ان کی تاکید تھی کہ ان کے خطوط تلف کر دیے جائیں۔ اصغر گونڈوی مرحوم سے ان کی بہت دوستی تھی۔ جب ان کا انتقال ہوا تو وہ تعزیت کے لیے الٰہ آباد گئے۔ انھیں معلوم تھا کہ اصغر صاحب ان کے خطوط بہت احتیاط سے رکھتے ہیں۔ انھوں نے ان کا پلندہ نکلوایا اور خود ان خطوط کو ضائع کر دیا۔'' [2]

لیکن ان تمام مخالفتوں اور ممانعتوں کے باوجود ان کے خطوط منظر عام پر آئے۔ بقول آل احمد سرور:

''رشید صاحب کی اس واضح اور صریح ہدایت کے پیش نظر اب تک میں نے خطوط کا کوئی مجموعہ شائع نہیں کیا جو انھوں نے میرے نام لکھے تھے۔ اگرچہ میرے خیال میں یہ خطوط کسی طرح ان خطوط سے

---

[1] رشید احمد صدیقی کے خطوط: پروفیسر آل احمد سرور، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۶، ص ۷

[2] رشید احمد صدیقی کے خطوط: پروفیسر آل احمد سرور، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۶، ص ۱۲

کم ادبی اہمیت نہیں رکھتے جواب تک شائع ہوئے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس مجموعہ میں خاصی بڑی تعداد ایسے خطوں کی ہے جو رشید صاحب کی مکتوب نگاری کے شاہکار کہے جا سکتے ہیں۔ مگر جب میں نے یہ دیکھا کہ ان خطوط کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور ان میں وہ خطوط بھی شامل ہیں جو انھوں نے اپنے بچوں کو لکھے تھے اور ان بچوں کے ایما سے ان کی اشاعت ہوئی ہے تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ اب اپنے نام ان خطوں کی اشاعت کو مزید التوا میں رکھنے کا کوئی جواز نہیں رہا۔ اس لیے رشید صاحب کے انتقال کے انیس برس سے زائد کا عرصہ گذر جانے کے بعد اب ان کی اشاعت عمل میں آ رہی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب ان کو صاف کرنا شروع کیا تو ان میں پانچ خط رسالہ 'سوغات'، بنگلور میں دے دیے گئے تھے کہ لوگوں کو اس مجموعہ کی عنقریب اشاعت کا علم ہو جائے۔ میں رشید صاحب کی روح سے معذرت کے ساتھ خطوط کا یہ مجموعہ شائع کر رہا ہوں۔'' [1]

لیکن یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ آخر کیا وجہ تھی جس کی بنا پر رشید صاحب اپنے خطوط کو شائع کیے جانے کے مخالف تھے۔ اس کا جواب بھی آل احمد سرور نے دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''ان (خطوط) کے مطالعے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ رشید صاحب کو اپنے خطوط کے شائع نہ ہونے پر کیوں اصرار تھا۔ خطوط میں انھوں نے آزادی سے بعض معاصرین کی تعریف کی ہے۔ بعض پر اعتراضات بھی کیے ہیں اور بعض پر طنز بھی۔ گویا یہ خط ان کے اس وقت کے جذبات و احساسات کی عکاسی کرتے ہیں۔'' [2]

شاید اسی لیے انھیں ایسا لگا ہو کہ اگر یہ خطوط منظر عام پر آ گئے تو بلا وجہ کئی افراد کی دشمنی مول لینی پڑے گی اور خود ان کے متعلق دوسرے لوگوں کی رائے میں بھی تبدیلی آئے گی۔ اسی لیے وہ ہمیشہ ان خطوط کو شائع کرنے سے منع کرتے رہے۔ اس کا ایک اور سبب بتاتے ہوئے سرور صاحب لکھتے ہیں:

''رشید صاحب کو انتہا پسندی سے چڑ تھی۔ انتہا پسندی خواہ سیاست میں ہو خواہ مذہب میں ناپسند

---

[1] رشید احمد صدیقی کے خطوط: پروفیسر آل احمد سرور، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۶، ص ۱۳۔۱۴

[2] رشید احمد صدیقی کے خطوط: پروفیسر آل احمد سرور، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۶، ص ۱۶

کرتے تھے۔انھوں نے جس طرح ترقی پسندوں کو نہیں بخشا اسی طرح مولانا عبدالماجد کو بھی نہیں چھوڑا۔'' [1]

ان تمام مباحث سے قطع نظر آیئے براہِ راست خود رشید صاحب کے ان خطوط کا مطالعہ کرتے ہیں جو انھوں نے سرور صاحب کو لکھے ہیں۔جگر مرادآبادی کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط میں سرور صاحب کو لکھتے ہیں:

''سرور صاحب،جگر صاحب کے بارے میں آپ دونوں متفق ہیں۔اپنے اپنے اعترافات کا انداز مختلف۔جگر صاحب کی شاعرانہ شخصیت کو آپ اجاگر کیجیے۔نتیجہ وہی نکلے گا جو میں کہتا آیا ہوں۔ ذات،صفات سے پہچانی جاتی ہے لیکن ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ ذات عین صفات ہوتی ہے۔شخص ہمیشہ شاعر سے بڑا ہوتا ہے۔شاعرانہ شخصیت جز ہے،کل نہیں۔اچھا ذرا اس نکتہ پر غور کیجیے قرآن کی تمامتر حیثیت کیا ہے؟ اس کے ایک سرے پر سب سے بڑی قدرت اور دوسرے سرے پر سب سے بڑا ''اثر'' یا ''عمل''،یعنی ایک سرے پر خدا دوسرے پر رسالت۔قرآن میں کچھ نہیں دھرا ہے اگر اسکے دونوں سرے غائب ہوں۔قرآن کی تمام تر اہمیت خدا اور رسولؐ سے ہے۔خدا اور رسولؐ کی اہمیت قرآن سے نہیں۔شاعر کی شاعرانہ شخصیت کا اسی روشنی میں مطالعہ کیجیے۔

مگر ان باتوں میں کچھ نہیں دھرا ہے۔دھرا اس میں ہے جو آپ لکھیں گے وہ میں دیکھوں گا تو کہوں گا۔جگر صاحب اور ان کا کلام تو رہے علیحدہ خود آپ کہاں ہیں۔اور یہی اہم ہے۔لیکن یہ تو ہر پھر کر میں نے اپنی ہی بات کہہ دی۔لاحول ولاقوۃ۔

یہ کاغذ ختم ہو گیا اور لاحول ولاقوۃ پر۔اس سے بڑھ کر شگون نیک کیا ہوگا!'' [2]

اسی طرح ایک خط میں اپنی مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے سرور صاحب کو لکھتے ہیں:

''کارڈ ملا۔کام بہت سارے اکٹھا کر لیے۔کرنے کا جی نہیں ہوتا اس لیے طبیعت بدحظ رہتی ہے۔ پوچھیے گا اکٹھا کیوں کر لیے۔اس کا جواب کیا دوں،کچھ شوق،کچھ مروت،بہت کچھ بلکہ سب کچھ

---

[1] رشید احمد صدیقی کے خطوط:پروفیسر آل احمد سرور،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،۱۹۹۶،ص ۱۶

[2] رشید احمد صدیقی کے خطوط:پروفیسر آل احمد سرور،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،۱۹۹۶،ص ۸۶۔۸۷

زبردستی۔ایک کوشروع کرتا ہوں۔اس سے نفرت ہوجاتی ہے۔دوسرا شروع کرتا ہوں بیچ میں پہنچتا ہوں تو معلوم ہونے لگتا ہے کہ تیر نہیں رہا ہوں ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں۔نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم۔اچھے چھوڑتا ہوں۔تیسرا اٹھاتا ہوں۔تھوڑی ہی دیر چل کر معلوم ہوتا ہے میاں رحم کرو، کمزور، مار کھانے کی نشانی۔!

اس وقت میرے کاغذوں کی دنیا کوئی دیکھے تو سمجھے کہ کوئی دیوانہ ہے جو کبھی کبھی ہوش میں آجاتا ہے۔ کبھی کبھی ہوش میں آجاتا ہوں تو پھاڑ پھوڑ کر بیٹھ جاتا ہوں۔دلی کے ریڈیو والوں نے کچھ تقریروں کی فرمائش کی۔نامنظور کرنے جارہا تھا کہ گھر والے سر ہوگئے۔کسی نے بھی تو ہمدردی نہ کی۔سب نے بے ہودہ یا بوڑھا قرار دیا۔اور یہی وہ موقع ہوتا ہے جب لوگ مجاہدانہ سرگرمی سے ظلم کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان سے زیادہ سمجھدار یا ہمدرد یا بہادر کوئی اور نہیں۔تقریروں کی ہامی بھرلی، دو کر آیا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے دل پر کیا گذر گئی۔دلی کا نام آتا ہے تو طبیعت بیٹھنے لگتی ہے۔آپ جانتے ہیں کہ وہاں کا جانا کیسا شاق ہوتا ہوگا۔

حیات اللہ انصاری نے قومی آواز کا ۲۸/جولائی کا پرچہ بھیج دیا۔اڈیٹوریل پڑھ کر طبیعت میں گدگدی پیدا ہوئی۔سب کام چھوڑ کر پانسات صفحے لکھ ڈالے۔پرسوں کے پانیر میں خبر دیکھی پاکستان اور کشمیر ایک دوسرے سے ملوث ہیں۔لکھنا بند کردیا۔طبیعت کھٹی ہوگئی۔دیکھیے اس کا ردعمل کیا ہو۔مسودہ پھاڑ دیا۔معلوم نہیں میرے لکھنے کو حکومت یا ابنائے وطن کیا سمجھیں۔ایسا کام ہی کیوں کیا جائے جس سے پیچیدگی پیدا ہونے کا امکان ہو۔'' [1]

یہ ظرافت کے وہ نمونے ہیں جو رشید احمد صدیقی کا امتیاز ہیں اور اسی وجہ سے انھیں اردو ادب میں، اور خاص کر طنز و مزاح نگاری میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔

سرور صاحب رشید صاحب کے خطوط سے ۶۸ اقتباسات مثال کے طور پر پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

---

[1] رشید احمد صدیقی کے خطوط: پروفیسر آل احمد سرور، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۶، ص ۸۵

''ان خطوط کے چند اقتباسات سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ رشید صاحب کے ان خطوط میں اپنے زمانے کے متعلق، معاصرین کے متعلق، مذہب، سیاست، صحافت، اردو، مسلمان، اپنے کچھ مخصوص دوستوں سے مزاح المومنین اور ان کے علاوہ اپنی ذات وصفات کے متعلق بہت کچھ ملتا ہے۔'' [1]

آل احمد سرور کے خطوط

ادبی مشاہیر کے زیادہ تر خطوط اصلاح شعر یا پھر کسی مسودے پر نظر ثانی کی غرض سے تحریر کیے گئے ہیں۔ اردو میں ایسے خطوط کی تعداد بے شمار ہے۔ بھلا ہو ان حضرات کا جنھوں نے ان خطوط کو اپنی جان و مال کی طرح عزیز رکھا اور پھر ان خطوط کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا۔ یہ خطوط ہمارے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آج کے دور میں جب کہ ادب کا معیار روز بروز گرتا جا رہا ہے اور ادبی فن پاروں کو داد و تحسین کا مرتبہ عطا کرنے والے افراد بھی ناپید ہوتے جا رہے ہیں، ان خطوط کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔

آل احمد سرور سے اردو کا ہر طبقہ واقف ہے۔ موصوف کے خطوط ہمارے لیے واقعی بیش بہا ادبی خزینہ ہیں۔ شام موہن لال جگر بریلوی، بیسویں صدی کے ایک ممتاز شاعر ہیں۔ اردو اکادمی لکھنؤ نے 1974 میں ان کی ادبی خدمات پر ایوارڈ سے سرفراز کیا تھا اور حکومت اتر پردیش نے آپ کی مشہور مثنوی ''پیام ساوتری'' پہ انعام دیا تھا۔ جگر بریلوی نے اپنی اسی مثنوی کا ایک نسخہ آل احمد سرور کے پاس تبصرہ کے لیے بھیجا تھا، جس کا ذکر سرور صاحب نے جگر کے نام اپنے ایک خط میں کیا ہے:

لکھنؤ یونیورسٹی

۱۴/دسمبر ۱۹۵۴ء

مکرمی تسلیم

آپ کا خط اور پیام ساوتری کا ایک نسخہ دونوں ملے۔ پیام ساوتری ایک نظر میں دیکھ گیا۔ پوری مثنوی میں بڑی پختگی شگفتگی اور روانی ہے۔ بعض بعض اشعار تو نہایت ہی بلند پایہ ہیں۔ میں اس مثنوی پر

[1] رشید احمد صدیقی کے خطوط: پروفیسر آل احمد سرور، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۶، ص ۱۷

تفصیل سے اپنے رسالے اردو ادب میں ریویو کروں گا اس خط سے تو صرف کتاب اور خط کی رسید دینی مقصود تھی۔ کتاب بڑی قابل قدر ہے اور موضوع کے لحاظ سے ایک اضافہ۔

جہاں تک نصاب میں رکھنے کا سوال ہے ابھی اس کے متعلق عرض نہیں کر سکتا۔ نصاب کی کمیٹی جب ہوگی اس وقت اس پر بھی غور کیا جائے گا کتاب کا ایک نسخہ لائبریری کے لئے منگوالیا گیا ہے۔ آپ کی دوسری کتابیں کہاں سے مل سکتی ہیں اطلاع دیجئے۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

خیر طلب

آل احمد سرور [۴۱]

اسی طرح مبشر کو لکھے گئے ایک خط میں اس بات کا ذکر موجود ہے کہ وہ ادب میں دلچسپی لینے والوں کی حوصلہ افزائی کس طرح کرتے ہیں۔ خط ملاحظہ ہو:

سرسید نگر علی گڑھ

2-3-79

برادرم مبشر

امید ہے کہ تم خیریت سے ہوگے۔ زاہدہ بدایوں سے آئیں تو انھوں نے تمہاری نئی کتاب دی یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تم برابر تصنیف و تالیف میں لگے رہتے ہو اور اس کے ساتھ اپنا اسکول بھی چلا رہے ہو۔ تمہاری باقاعدگی اور لکھنے پڑھنے میں انہماک اور زبان و ادب کی خدمت دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ خدا کرے اسی طرح کام کرتے رہو اور لکھتے رہو۔ خطوط چھپوانے میں یہ خیال ضرور رکھنا چاہئے کہ وہ خطوط ہی چھاپے جائیں جن میں یا تو کوئی ادبی مسئلہ بیان کیا جائے یا جن میں اسلوب کی کوئی خوبی ہو یا کوئی اہم واقعہ آجائے۔ میں یکم مارچ کو سری نگر جانے والا تھا مگر کچھ کام ایسے نکل آئے کہ اب وسط مارچ تک یہاں قیام رہے گا اس کے بعد جاؤں گا، بہر حال اس سال اور سری نگر

[۱] مکاتیب سرور، مرتبہ انجینئر وارث رفیع محمد بخش قادری، اندرا نگر، لکھنؤ، ۲۰۰۳، ص ۲۷

میں رہنا ہے اور پھر علی گڑھ میں جم کر رہوں گا اور اپنے ادبی کاموں پر پوری توجہ کروں گا۔ وہاں کی دیکھ بھال بھی ضروری ہے۔ زاہدہ اچھی ہیں تمہیں سلام کہتی ہیں۔ خیریت اور کوائف سے باخبر رکھو۔

مخلص

آل احمد سرور [1]

آل احمد سرور کا درج بالا خط اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں سرور صاحب نے کسی ادبی رسالے میں کن خطوط کو شائع کرنا چاہیے، اس کی طرف ہلکا سا اشارہ کیا ہے اور کہا ہے کہ '.....وہ خطوط ہی چھاپے جائیں جن میں یا تو کوئی ادبی مسئلہ بیان کیا جائے یا جن میں اسلوب کی کوئی خوبی ہو یا کوئی اہم واقعہ آ جائے۔' جب کہ آج کے ادبی رسائل و جرائد کا یہ حال ہے کہ ان میں ادبی محاسن والے خطوط کے برخلاف ذاتی تعلقات والے خطوط کو شامل کرنے کا رواج زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں علمی اور ادبی صلاحیت کے مالک افراد گم نامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں اور ان افراد کو دونوں جہان کی کامیابی ملتی جا رہی ہیں جو اس کے نہ تو مستحق ہیں اور نہ ہی اس کے لائق۔ یہی ہمارے زمانے کی ستم ظریفی ہے۔

آل احمد سرور کے دیگر ایسے بہت سے خطوط ہیں جن میں وہ اپنی ادبی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر فانی بدایونی سے متعلق مبشر کو انھوں نے جو خطوط لکھے ہیں، ان میں وہ یکے بعد دیگرے مختلف ادبا و شعرا کے اس دنیا سے رخصت ہونے پر افسوس کا ذکر کرتے ہیں اور اس بات کے لیے فکر مند نظر آتے ہیں کہ ان ادبی شخصیات پر سیمینار وغیرہ کا سلسلہ چلتا رہے۔ اس سلسلے میں اپنی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے درج ذیل کے دو خطوط میں یوں رقم طراز ہیں:

۲۰ نومبر ۱۹۷۹ء

برادرم مبشر

تمہارا ایک خط وصی کے انتقال پر ملا تھا۔ انکے تو ہم سب سوگوار ہیں کیا کیا جائے۔ ساتھی ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے ہیں رہے نام اللہ کا۔

---

[1] مکاتیب سرور، مرتبہ انجینئر وارث رفیع، محمد بخش قادری، اندرا نگر، لکھنؤ، ۲۰۰۳، ص ۴۸۔۴۹

بھائی فانی کی پیدائش کو سو سال ہو گئے لوگ غافل تھے۔ میں نے کوشش کر کے انجمن ترقی اردو ہند کی طرف سے ایک قومی کمیٹی بنوادی جو دسمبر یا جنوری میں سیمینار کریگی۔ علی گڑھ، حیدرآباد سری نگر میں بھی سیمینار ہوں گے بدایوں میں بھی کچھ ہونا چاہیے اس کام کے لئے تم پر ہی نظر پڑتی ہے۔ اپنے یہاں کچھ لوگوں کو بلا کر ایک کمیٹی بنوادو جو بدایوں میں یوم فانی منائے۔ جنوری میں کرلو یا دسمبر کے آخر میں۔ میں وسط دسمبر تک علی گڑھ پہنچ جاؤں گا وہاں سے بدایوں جانا آسان ہے۔ ایک دن کا جلسہ کرلو۔ رفیع سے بھی مدد لو پتہ نہیں حکیم مختار زندہ ہیں یا نہیں اگر زندہ ہوں تو ان سے مدد ملے گی۔ آفتاب احمد بہت مدد دیں گے بہر حال بدایوں والوں کو کچھ کرنا چاہئے۔ جواب جلد دو یہاں ۲۴ر نومبر یوم فانی منا رہا ہوں۔

مخلص آل احمد سرور [1]

سرسید نگر علی گڑھ

29-12-79

برادرم مبشر

بہت انتظار کے بعد تمہارا خط ملا، میں حیران تھا کہ تم نے میرے خط کا جواب کیوں نہیں دیا۔ بہر حال اب حالات معلوم ہوئے تمہارا خط مجھے سری نگر میں نہیں ملا۔ میں وہاں سے ۱۰ر دسمبر کو چلا تھا اور ۱۱ر کی شام کو یہاں آ گیا۔

یہ اچھا ہے کہ تم لوگوں نے ۱۳ر جنوری کو یوم فانی منانے کا پروگرام بنایا ہے مگر بھائی مجھے تمہاری طرف سے تاریخ کی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی اس لئے میں نے بمبئی کے ایک پروگرام کو منظور کرلیا۔ میں ۱۱ر جنوری کو دہلی اور وہاں سے شام کو بمبئی جا رہا ہوں وہاں ۱۲ر اور ۱۳ر جنوری کو پریم چند پر ایک سیمینار ہے جس میں مجھے مقالہ پڑھنا ہے۔ وہاں سے ۱۶ر تک واپسی ہوگی۔ اگر تمہاری ۱۳ر کی مقرر کردہ تاریخ پر لوگ آ سکتے ہیں تو پھر تم ۱۳ر کو جلسہ کرلو میرا انتظار نہ کرو اگر میری موجودگی ضروری سمجھتے ہو تو

[1] مکاتیب سرور، مرتبہ انجینئر وارث رفیع محمد بخش قادری، اندرا نگر، لکھنؤ، ۲۰۰۳، ص ۴۹۔۵۰

پھر کوئی دوسری تاریخ رکھو مگر یہ ۱۸ر سے ۲۰ر جنوری تک ہو کیوں کہ ۲۱/۲۲ر کو مجھے گورکھپور جانا ہے اور اس کے بعد دہلی میں جامعہ ملیہ میں ایک توسیعی لیکچر دینا ہے بہر حال جو طے کرو اس کی جلد اطلاع دو تا کہ میں پروگرام میں گنجائش رکھوں۔[1]

ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرور صاحب ادبی کاموں میں کس قدر مشغول رہا کرتے تھے۔ ان کے یہ خطوط اس لیے بھی اہم ہیں کہ ان کی بنیاد پر اس زمانے کی ادبی تاریخ لکھنے کے لیے کافی کچھ مواد فراہم ہو سکتا ہے۔ یہی بات تمام ادوار کے مکتوب نگاروں پر صادق آتی ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو بیسویں صدی میں مکتوب نگاری کے ارتقا میں علی گڑھ کا ایک اہم رول رہا ہے۔ ان خطوط میں جہاں ایک طرف اردو کے غیر افسانوی نثر کا عہد بہ عہد ارتقا نظر آتا ہے وہیں دوسری طرف زبان و بیان، تہذیب و معاشرہ، تاریخ و تنقید کا بھی پورا ایک پس منظر کھل کر سامنے آتا ہے جو کہ ہمارے ادب کا بیش قیمتی سرمایہ ہیں جنھیں ہم کسی بھی لمحے نظر انداز نہیں کر سکتے۔

---

[1] مکاتیب سرور، مرتبہ انجینئر وارث رفیع، محمد بخش قادری، اندرا نگر، لکھنؤ، ۲۰۰۳، ص ۵۰

ماحصل

نثر اور شاعری کے اپنے حدود و امتیازات ہیں۔ دونوں کی ہیئتیں الگ ہیں اور جذبات و احساسات کی ترسیل کے لیے یہ دونوں ہی موثر وسیلے ہیں۔ شعری اور نثری بیانیے کی ساخت الگ ہے۔ نثر کا دائرہ بھی وسیع ہے جس طرح شاعری کا دائرہ متنوع ہے۔ شاعری کی بھی کچھ شاخیں ہیں تو نثر کے بھی اسالیب ہیں۔ نظم و نثر دنوں ہی میں علی گڑھ کی خدمات نہ صرف نا قابل فراموش ہیں بلکہ تاریخ ادب اردو کا اہم ترین حصہ ہیں۔ نثر کی ایک متعینہ ساخت ہے اور اس میں اظہارات کے مختلف طریقے ہیں۔ افسانہ بھی ایک نثری صنف ہے جس میں کچھ ایسے ترکیبی عناصر ہوتے ہیں جس کی وجہ سے نثر کا وہ حصہ افسانہ کہلاتا ہے۔ یہاں افسانے کی صنف یا اس کے حدود کے تعلق سے گفتگو مقصود نہیں، بس اتنا جان لینا ضروری ہے کہ علی گڑھ نے فکشن کے میدان میں بھی امتیازی خدمات انجام دی ہیں، بلکہ یوں کہا جائے کہ اردو فکشن کو ایک نئی راہ، روش اور روشنی علی گڑھ نے ہی عطا کی ہے اور بعض فکشن کے اساطین کا تعلق بھی علی گڑھ سے ہی رہا ہے۔ سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی اور معاصر افسانہ نگاروں کے بہت سے اہم نام علی گڑھ سے جڑے ہوئے ہیں۔ علی گڑھ کا دائرہ صرف فکشن تک ہی محدود نہیں رہا ہے بلکہ تمام ادبی، علمی موضوعات پر علی گڑھ کا کارنامہ اظہر من الشّمس ہے، جس طرح فکشن کو علی گڑھ نے ایک تنوع، تحرک اور تجدد عطا کیا ہے۔ اسی طرح غیر افسانوی نثر میں بھی علی گڑھ نے ایک نشان امتیاز قائم کیا ہے۔ چاہے خاکہ ہو، خود نوشت ہو، سوانح ہو، خطوط ہوں یا سفر نامہ، علی گڑھ نے ان تمام اصناف میں نہ صرف اضافے کیے ہیں بلکہ انھیں وسعتوں سے بھی ہم کنار کیا ہے۔ علی گڑھ کی روش میں تقلید اور تتبع شامل نہیں

ہے۔اس لیے ان اصناف میں علی گڑھ نے عمومی راہ وروش سے انحراف بھی کیا ہے اور اپنی تخلیقی جولانیوں سے اس کی تنگ دامنی کا ازالہ بھی کیا ہے۔

جہاں تک خاکے کا تعلق ہے تو علی گڑھ میں ایک طویل فہرست ہے ایسے خاکوں کی جس سے نہ صرف اس صنف کے امتیازات روشن ہوتے ہیں بلکہ اس کے ارتقا کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

خاکہ نثری ادب کی ایک دلکش اور دلربا صنف ہے، اس کا فن غزل اور افسانے کے فن سے بہت حد تک مشابہت ومماثلت رکھتا ہے۔ یہاں بھی رمز وکنایے میں شخصیت کے خدوخال پیش کیے جاتے ہیں۔ خوبیوں کے ساتھ ساتھ شخصی کمزوریوں پر بھی انگشت نمائی کی جاتی ہے لیکن اس کا مقصد شخصیت کی تحقیر یا تذلیل نہیں بلکہ اس کے ذریعے ہمدردی واپنائیت مقصود ہوتا ہے اور پڑھنے کے بعد قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ کاش موصوف میں یہ کمزوری نہ ہوتی تو اس کی شخصیت مزید بھاری بھرکم اور مستحکم ہوتی۔

علی گڑھ نے خاکہ نگاروں کی ایک ایسی نسل کو جنم دیا ہے، جس نے خاکے کی بنیادی ہیئتوں کا احترام کرتے ہوئے اس کے دائرہ کار کو مزید وسعت عطا کی اور کچھ ایسے تجربے کیے کہ خاکہ نگاری کو بھی ادب میں اہم مقام حاصل ہوگیا۔ دراصل یہ خاکے صرف شخصیات پر مرکوز نہیں تھے، بلکہ ان خاکوں میں پورا ایک عہد روشن نظر آتا ہے۔ان میں جو آگہی ہے، اس کے لیے شاید بہت ساری کتابیں بھی ناکافی ہوتیں۔ خاص طور پر رشید احمد صدیقی، مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی نے جو خاکے لکھے ان کو بے پناہ مقبولیت ملی اور ان کی تقلید میں ایسے خاکے لکھے گئے جن کا شمار یقیناً عمدہ خاکوں میں ہوتا ہے۔علی گڑھ کے جو خاکہ نگار ہیں ان میں یہ نام اہم ہیں:

- ''مولوی عبدالحق'' (چند ہم عصر)، مولوی صاحب کی خاکہ نگاری کا اہم پہلو یہ ہے کہ انھوں غیر اہم شخصیتوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔انھوں نے نام دیو مالی کی بڑی دلکش تصویر پیش کی ہے۔اور ثابت کیا ہے کہ نیکی کسی کی جاگیر نہیں۔نور خاں کا خاکہ بھی بہت دلکش ہے۔وہ ایک کھرے صاف گو اور دیانت دار انسان تھے۔
- ''رشید احمد صدیقی'' ظرافت سے آپ کو خاص لگاؤ تھا اس لیے بیشتر خاکوں میں ظرافت موج تہہ نشیں کی طرح کارفرما ہے۔خنداں، میں اقبال سہیل کا خاکہ ہے۔گنج ہائے گراں مایہ، ہم نفسان رفتہ میں رشید

صاحب نے اکابرین ومعاصرین کا خاکہ لکھا ہے۔ ذاکر صاحب رشید صاحب کی پسندیدہ شخصیت ہیں۔ اس لیے ''ہمارے ذاکر صاحب'' کے عنوان سے انھوں نے ان کا طویل خاکہ لکھا ہے۔ انھوں نے اپنے صاحب زادے ''شیخ نیازی'' کو بھی خاکہ کا موضوع بنایا ہے۔ آپ کے خاکوں میں بڑا تنوع ہے۔ ایک طرف جواہر لال نہرو، مولوی محمد علی اور ذاکر حسین کے خاکے ہیں تو دوسری طرف کندن بھی موجود ہے، جو ایم اے او کالج میں چپراسی تھا۔ اس کے بارے میں لکھتے ہیں ''کندن مر گیا اور گھنٹے بجتے رہے۔ کندن کالج کا گھنٹہ بجاتا تھا، معلوم نہیں کب سے، کم وبیش تیس پینتیس سال سے، اتنے دنوں سے اس پابندی سے کہ اس طرف خیال کا جانا بھی بند ہو گیا تھا کہ وہ مر جائے گا یا گھنٹہ بجانے سے باز آ جائے گا۔ طالب علمی کا زمانہ ختم کر کے اسٹاف میں آیا تو یہ گھنٹہ بجا رہا تھا۔ اس کے گھنٹوں کے مطابق کام کرتے کرتے پوری مدت ملازمت ختم کی۔ گھنٹے کی آواز روز مرہ کے اوقات میں ایسی گھل مل گئی تھی جیسے وہ کہیں باہر سے نہیں میرے ہی اندر سے آ رہی ہو۔''

- آغا حیدر حسن کا پہلا مجموعہ ''پس پردہ'' اور دوسرا ''ندرت زبان'' کے نام سے شائع ہوا۔ آغاز صاحب کے خاکوں میں جگہ جگہ اجتماعی عنصر کارفرما نظر آتا ہے۔ البتہ آپ کے بعض خاکے شخصیت کے خدوخال تک محدود نظر آتے ہیں۔

- خواجہ غلام السیدین کے تحریر کردہ خاکوں کا مجموعہ ''آندھی میں چراغ'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں بابائے قوم مہاتما گاندھی پنڈت جواہر لال نہرو، ذاکر صاحب، راس مسعود، علامہ اقبال اور خواجہ غلام الثقلین کے خاکے شامل ہیں۔ آپ کے خاکوں میں اخلاقی اقدار کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

- شاہد احمد دہلوی —— ''گنجینہ جوہر'' آپ کے خاکوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں ۱۷ لوگوں کے خاکے شامل ہیں۔ رسالہ 'نقوش' کے لیے ''دلی کا ایک دور'' کے نام سے آپ نے ۱۲ خاکے لکھے۔ تیسرا مجموعہ ''بزم خوش نفساں'' ہے۔ آپ کے خاکوں کا نمایاں وصف سراپا نگاری، واقعہ نگاری، جدت طرازی، برجستگی اور بے تکلفی ہے۔ میراجی پر آپ کا مشہور خاکہ ہے۔ ان کے بارے میں لکھتے ہیں ''میراجی بڑے گندے آدمی تھے، وہ ان میں سے تھے جو کہتے ہیں ''یا نہلائے دائی یا نہلائیں چار بھائی'' انھیں کبھی کسی نے نہاتے نہیں دیکھا۔''

- جلیل قدوائی —— آپ کے خاکوں کا پہلا مجموعہ ''تنقید اور خاکے'' دوسرا مجموعہ ''چند اکابر،

چند معاصر'' ہے۔آپ کے خاکوں میں طنز ومزاح کا عنصر نمایاں ہے۔

• مولانا عبدالماجد دریابادی —— مولانا محمد علی جوہر پر لکھے گئے طویل خاکے کی وجہ سے آپ کو شہرت ملی۔مولانا محمد علی سے متعلق آپ کا خاکہ اردو میں سوانحی خاکے کی منفرد مثال ہے،اس میں کلام نہیں کہ شخصی خاکے کی تمام خصوصیات اس میں پائی جاتی ہیں۔

• اعجاز حسین —— ''ادب کے شہزادے'' آپ کے خاکوں کا مجموعہ ہے جو ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا۔ اس میں ۴۴ شعرا کے مختصر خاکے ہیں۔آپ نے خاکوں میں حد درجہ اختصار سے کام لیا ہے،جس کی وجہ سے تشنگی کا احساس باقی رہتا ہے۔

• ''عبدالشکور'' (پ ۳ جولائی ۱۹۸-۱۸ مارچ ۱۹۷۰ بریلی) نے بعض عمدہ خاکے لکھے ہیں۔لیکن انھیں خاکہ نگار کی حیثیت سے شہرت نہیں ملی چونکہ وہ نمود ونمائش اور شہرت کے خواہش مند نہیں تھے۔''یاران میکدہ'' کے نام سے آپ کے خاکوں کا مجموعہ علمی وادبی حلقوں میں خراب سراہا گیا۔آپ کے تمام خاکوں میں طنز ومزاح کے ساتھ شوخی وظرافت کا رنگ نمایاں ہے۔

• ''سید صباح الدین عبدالرحمٰن'' اردو ادب میں بحیثیت مورخ مستحکم شناخت رکھتے ہیں۔ان کے تحریر کردہ خاکوں کا مجموعہ ''بزمِ رفتگاں'' کے نام سے شائع ہوا۔آپ شخصی حقائق اور واقعاتی حوالوں سے اپنے خاکے میں جان ڈال دیتے ہیں۔

• معین الدین دردائی —— ''جلوے'' آپ کے خاکوں کا مجموعہ ہے،جس میں بعض فنی کمزوریاں راہ پا گئی ہیں۔آپ کے خاکوں میں وہ معروضیت نہیں جو خاکے کو پروقار بناتی ہے۔تاہم اس مجموعے میں بعض عمدہ خاکے بھی ہیں۔

• ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی (پ ۱۹۲۷ اعظم گڑھ- یکم جون ۱۹۷۸ علی گڑھ) نے پاکستان سے جاری رسالہ ''نقوش'' (۱۹۵۶) میں علی گڑھ کی بعض سرکردہ شخصیات کا خاکہ لکھا۔آپ نے شخصیت کی تصویر کشی میں فنکارانہ چابک دستی کا ثبوت پیش کیا ہے،جن کی وجہ سے بعض شخصیتیں متحرک نظر آتی ہیں۔

• عصمت چغتائی (۱۹۱۵-۱۹۹۱) نے مجاز کا خاکہ ''نئے ادب کے معمار'' کے سلسلے کے لیے لکھا تھا۔

لیکن آگے چل کر انھوں نے اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی کا خاکہ ''دوزخی'' کے عنوان سے لکھا، جسے علمی وادبی حلقوں میں بے پناہ شہرت ومقبولیت ملی۔ حسن عسکری کے خیال میں ''دوزخی'' پورے ترقی پسند ادبی سرمائے میں ایک لازوال تخلیق کی حیثیت رکھتا ہے۔''

• ''سعادت حسن منٹو'' (۱۹۱۲-۱۹۹۵) —— آپ کے خاکوں کے تین مجموعے ''گنجے فرشتے'' (۱۹۵۲)، ''لاؤڈ اسپیکر'' (۱۹۵۵)، اور ''شخصیتیں'' (۱۹۵۶) میں شائع ہوئے۔ جس میں بے لاگ تبصرہ اور بے باک تجزیہ ہے۔ لکھتے ہیں ''میں ایسی دنیا پر، ایسے مذہب ملک پر، ایسے مہذب سماج پر ہزار بار لعنت بھیجتا ہوں، جہاں یہ اصول رائج ہوں کہ مرنے کے بعد ہر شخص کرکردار اور تشخص لانڈری میں بھیج دیا جائے جہاں سے وہ دُھل دُھلا کر آئے اور رحمۃ اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکا دیا جائے۔ گنجے فرشتے کے دیباچے میں لکھتے ہیں: ''میرے اصلاح خانے میں کوئی گھونگر پیدا کرنے والی مشین نہیں۔ میں بناؤ سنگار نہیں کرتا۔ آغا حشر کی بھینگی آنکھ مجھ سے سیدھی نہیں ہوسکی۔ اس کے منہ سے گالیوں کی بجائے میں پھول نہیں جھڑا سکا۔ میراجی کی ذلالت پر مجھ سے استری نہ ہوسکی۔ اور نہ میں اپنے دوست شیام کو مجبور کرسکا کہ وہ برخود غلط عورتوں کو سالیاں نہ کہے۔ اس کتاب میں جو فرشتہ بھی آیا ہے اس کا مونڈن ہوا ہے اور یہ رسم میں نے بڑے سلیقے سے ادا کی ہے۔''

• سید حامد (پیدائش ۷ جنوری ۱۹۲۰) نے بعض سیاسی، سماجی اور علمی شخصیتوں پر جو خاکے لکھے ہیں وہ مرقع نگاری، شخصیت نگاری اور تصویر کشی کے عمدہ نمونے ہیں۔ خاتون آہن مسز اندرا گاندھی کے خاکے کی بدولت آپ کو شہرت ملی جو مضامین کا مجموعہ ''کرب آگہی'' (تاج کمپنی، دہلی ۱۹۸۷) میں شائع ہوا۔

• حمیدہ اختر حسین —— آپ کے خاکوں کے مجموعے ''نایاب ہیں ہم'' مکتبہ دانیال، کراچی اشاعت سوم، ''چہرے مہرے'' مکتبہ دانیال، کراچی، طبع اول ۲۰۰۳) کے نام سے شائع ہوئے۔ مجموعے کا سب سے اہم خاکہ مولوی عبدالحق کی شخصیت پر مبنی ہے جو ''ہمارے مولوی صاحب'' کے عنوان سے ہے۔

• پروفیسر کبیر احمد جائسی (پ ۱۴ نومبر ۱۹۳۴) کے خاکوں کا مجموعہ ''ڈھونڈو گے انھیں برسوں'' ادارہ قرطاس، کراچی سے ۲۰۰۲ میں شائع ہوا۔ زیر نظر مجموعے میں علمی، ادبی، سیاسی، دینی شخصیتوں کے خاکے شامل

ہیں۔ مشمولہ تمام خاکوں میں اختصار کے بجائے طوالت ہے، جس کی وجہ سے بعض مرتبہ قاری اس وہم میں مبتلا ہوسکتا ہے کہ وہ خاکہ نہیں سوانح کا مطالعہ کر رہا ہے۔ لیکن شخصیات سے متعلق جو بیش بہا معلومات ان خاکوں میں جمع ہوگئی ہیں اس لحاظ سے اس کی معنویت اور اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ وہ انسان کو انسان کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

• پروفیسر نورالحسن نقوی کے ۱۵ خاکوں کا مجموعہ ''تصویریں اجالوں کی'' ۱۹۹۹ء میں ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں علمی، ادبی اور سیاسی شخصیتوں کے خاکے شامل ہیں، جن میں بیشتر کا تعلق علی گڑھ سے ہے۔ شخصیتوں کے قلمی مرقعے نہایت پرکشش اور خوبصورت انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔

• پروفیسر شہریار اور پروفیسر نورالحسن کی ادارت میں شائع ہونے والے رسال فکر ونظر کے ناموران علی گڑھ نمبر میں بھی بعض عمدہ خاکے ہیں، جن میں زیادہ تر فرزندانِ علی گڑھ کے تحریر کیے ہوئے ہیں۔

جہاں تک خودنوشت کا تعلق ہے تو علی گڑھ میں ایک طویل فہرست ہے ایسی خودنوشتوں کی جن سے نہ صرف اس صنف کے امتیازات روشن ہوتے ہیں بلکہ اس کے ارتقا کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ خاص طور سے وہ خودنوشتیں جو موجودہ دور میں لکھی گئی ہیں۔ ان کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ خودنوشت کا فن نہ صرف نکھر کر سامنے آیا ہے بلکہ اس کو کچھ ارتقائی شکلیں بھی میسر آئی ہیں۔ علی گڑھ میں جو خودنوشتیں لکھی گئی ہیں ان کا دائرۂ کار محدود نہیں بلکہ متنوع ہے اور ان میں علم وادب کی ایک دنیا آباد ہے۔ یہ خودنوشتیں صرف ذات کے حوالے سے ''یادنامے'' نہیں ہیں بلکہ مختلف علوم وفنون کا امتزاج ہے اور ان کے ذریعے ایک نئی کائنات سے آگہی ہوتی ہے، چونکہ معاصر خودنوشتوں میں فکر ونظر کی دنیا بہت وسیع رہی ہے اور انھیں اطلاعات کے جدید ترین وسائل میسر تھے، اس لیے ان خودنوشتوں میں آفاقی عناصر کے علاوہ آگہی کی وہ روشنی ہے جس سے پہلے کی خودنوشتیں محروم رہی ہیں۔ علی گڑھ کی امتیازی خودنوشتیں یہ ہیں:

• ''آشفتہ بیانی میری'' (کوہ نور پریس، دہلی، جنوری ۱۹۷۲) رشید صاحب کی یہ خودنوشت، خودنوشت کم اور علی گڑھ کی داستان زیادہ معلوم ہوتی ہے چونکہ رشید صاحب نے اپنی اس خودنوشت کو محض اپنے

حالات وواقعات کا اشتہار نہیں بنایا بلکہ اس کو انھوں نے یونیورسٹی سے جذباتی وابستگی کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس خونوشت کے تقریباً تین حصے پر علی گڑھ کی یادیں اور علی گڑھ کی باتیں حاوی ہیں۔ ان کے اسلوب کی ندرت، شگفتگی اور اشارتی انداز ان کی دوسری تحریروں کی طرح خودنوشت کا زیور ہے۔

• ''یادوں کی برات'' ـــــ جوش ملیح آبادی کی خودنوشت ہے، جو پہلی بار ۱۹۷۰ میں صفدر پریس، لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ جوش نے اپنی زندگی کے تمام واقعات کو اس انداز سے بیان کر دیا ہے کہ قاری ان کی زندگی کے نشیب وفراز سے واقف ہو جاتا ہے۔ تعلّی کے اظہار میں جوش نے فیاضی کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ خودنوشت مصنف کی بے باکی اور برملا گوئی کی بہترین مثال ہے۔

• ''یادِ ایام'' ـــــ نواب سعید احمد چھتاری۔ یہ خودنوشت دو جلدوں میں شائع ہو کر ۱۹۴۹ میں منظر عام پر آئی تھی۔ یہ خودنوشت یادداشتوں اور روزنامچوں کی مدد سے مرتب کی گئی ہے۔ نواب چھتاری انگریزوں کے عہد میں وزیر اور حیدرآباد کے منصب جلیلہ یعنی وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز رہے۔ خودنوشت کے واقعات سپاٹ ہیں۔ ان میں کوئی دلچسپی یا رنگینی نہیں ہے۔

• ''شاہراہِ پاکستان'' ـــــ چودھری خلیق الزماں (۱۹۶۷) یہ مصنف کی ذاتی زندگی کے بیان کے ساتھ تقسیم ہند کی کہانی پر بھی مشتمل ہے۔ انھوں نے تقسیم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اس لیے وہ تقسیم کے درد وکرب کو اسی احساس کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ چودھری خلیق الزماں بنیادی طور پر صحافی ہیں اس لیے رپورٹ نگاری اور رپوژ نگاری کے اثرات 'شاہراہِ پاکستان' میں محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اس میں آپ بیتی سے زیادہ جگ بیتی ہے۔ علی گڑھ کے نظام تعلیم پر تبصرہ کے علاوہ لکھنؤ کی معاشرتی فضا بھی اس میں ملتی ہے۔

• ''یادوں کی دنیا'' ڈاکٹر یوسف حسین خان کی خودنوشت ہے جو ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی۔ ایک مورخ اور ادیب کی حیثیت سے انھوں نے یہ خودنوشت لکھی ہے اس لیے یہ تاریخ اور تہذیب کا ایک نادر نمونہ ہے۔

• ''مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں'' (۱۹۷۴) اردو کی واحد خودنوشت ہے جسے مصنف اپنی حیات میں مکمل نہ کر سکے اور جسے بعد میں ان کی بہن صالحہ عابد حسین نے مکمل کیا۔ خواجہ غلام السیدین چونکہ ماہر تعلیم تھے، اس لیے تعلیم کے مسائل ومباحث بھی اس میں در آئے ہیں۔

• ''زرگذشت''(۱۹۷۷) مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کی زندگی کی ایک مخصوص دور کی روداد پر محیط ہے۔اس میں مصنف کا مزاحیہ اسلوب عروج پر نظر آتا ہے۔یوسفی کا کمال ہے کہ وہ دوسروں پر ہنسنے، پھبتیاں کسنے کے ساتھ ساتھ خود کو بھی طنز و مزاح اور مذاق کا نشانہ بناتے ہیں۔

• ''آپ بیتی''——یہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی خودنوشت ہے، جو اُن انتقال کے بعد منظر عام پر آئی۔مصنف کی بے دینی سے دین کی طرف مراجعت اور تالیف قلب کی داستان پیش کرتی ہے۔

• ''ورودِ مسعود''——یہ ماہر لسانیات مسعود حسین خاں کی خودنوشت ہے، جو ۱۹۸۸ میں شائع ہوئی۔اپنی زندگی کے رازہائے سربستہ جس صفائی اور بے باکی سے انھوں نے بیان کیے ہیں وہ صرف ان ہی کا خاصہ ہے۔جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تعلیمی و تہذیبی ماحول کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔

• ''جواب دوست''——ڈاکٹر نسیم انصاری کی خودنوشت ہے جو ۱۹۸۸ میں شائع ہوئی۔یہ ایک مختلف طرح کی خودنوشت ہے، اسے مصنف نے اپنے دوست مختار مسعود کو مخاطب کر کے لکھا ہے۔خودنوشت میں گفت و شنید کا انداز نمایاں ہے۔اس لیے اس میں مکالماتی رنگ شامل ہو گیا ہے۔اس میں میڈیکل کی تعلیم کے زمانے کے واقعات اور پھر ڈاکٹری کے تجربات بڑے خوبصورت پیرایے میں بیان کیے ہیں۔

• ''خواب باقی ہیں''(۱۹۹۱) آل احمد سرور کی خودنوشت ہے، جس میں بدایوں، الہ آباد، میرٹھ، پیلی بھیت، سیتاپور، بجنور، گونڈہ، آگرہ، غازی پور، شملہ اور کشمیر کے پرفضا اور پرکشش مقامات کی تمدنی اور تہذیبی زندگی کے نقوش در آئے ہیں۔اسی طرح اس میں علی گڑھ اور رام پور کی علمی و ادبی فضا اور معاشرتی صورت حال کا بیان بھی ہے۔اس میں سرور صاحب نے اپنی زندگی کے نشیب و فراز اور اپنی جدوجہد کی پوری داستان بھی لکھ دی ہے۔انھوں نے مختلف ماحول اور موسم میں اپنی زندگی کے شب و روز گزارے ہیں اور مختلف ماحول و موسم کے جو اثرات ان کے ذہن پر پڑے ہیں ان کی پوری تفصیل اس کتاب میں موجود ہے۔

• وامق جون پوری کی خودنوشت ''گفتنی ناگفتنی''(۱۹۹۳) کا بنیادی وصف یہ ہے کہ یہ مصنف کی نفسیاتی کیفیت اور ذاتی پسند و ناپسند، فکری بصیرت، شاعرانہ مزاج اور جونپور کے علمی و تہذیبی ماحول کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔

• ''اس آباد خرابے میں'' اختر الایمان کی خودنوشت ہے جو ۱۹۹۶ میں شائع ہوئی۔ اس خودنوشت کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے اس میں کہیں بھی سچ کو چھپانے کی قطعی کوشش نہیں کی بلکہ اپنی زندگی کے اندھیرے اجالوں کو واضح طور پر روشن کر دیا ہے۔

• ''حیاتِ مستعار'' جلیل قدوائی کی خودنوشت ہے جو ۱۹۸۷ میں شائع ہوئی۔ اس میں مصنف کی زندگی کے اٹھارہ سال کے حالات و واقعات کا بیان ہے۔

• ''گردِ راہ'' اختر حسین رائے پوری کی خودنوشت ہے جو المسلم پبلشرز، کراچی سے ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی۔ گردِ راہ میں انھوں نے اپنی زندگی اور اپنے اسفار کا بیان بہت خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ یہ گویا ان کی حکایت ہستی ہے جسے انھوں نے ادب اور زبان کے حوالے سے پیش کر دیا ہے۔ انھوں نے اپنی اس خودنوشت میں گفتنی اور ناگفتنی کی تمیز کے بغیر جو چیزیں ان کے ذہن میں آئیں اور لوح حافظہ پر جو یادیں روشن ہوتی گئیں انھیں قرطاس کے حوالے کر دیا۔

• ''ہم ساتھ تھے'' حمیدہ سالم کی خودنوشت ہے جو انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی سے ۱۹۹۹ میں شائع ہوئی۔ ہم ساتھ تھے، شورش دوراں کی توسیع ہے۔ یہ کتاب دراصل ان کی زندگی، خاندانی حالات و کوائف اور دیگر تہذیبی، سماجی و ثقافتی اقدار کا بیان ہے۔ 'ہم ساتھ تھے' ایک دلچسپ خودنوشت ہے، جس سے حمیدہ سالم کی زندگی کے مہ و سال ہی نہیں بلکہ مجاز اور صفیہ جاں نثار اختر کی زندگی کے بہت سے مخفی گوشے سامنے آتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے یادوں کا کولاژ ہے، جسے حمیدہ سالم نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔

• ''اعمال نامہ'' سر رضا علی عابدی کی خودنوشت ہے۔ یہ پیشہ ور مصنف نہیں، لیکن اپنے حالات زندگی قلم بند کر کے اردو زبان کی اس صنف میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ اعمال نامہ کے متعلق بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ اب تک اردو زبان میں بہترین خودنوشت سوانح ہے اور مصنف نے جہاں اپنی ذاتی زندگی پر کوئی نقاب نہیں ڈالی ہے وہیں اس دور کی سیاسی، قومی اور تہذیبی زندگی اور اس کے مسائل کو بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کتاب کا طرزِ نگارش دل آویز اور منفرد ہے اور صرف اسی ایک تصنیف کی بنا پر انھیں اردو کے بہترین نثر نگاروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علی گڑھ نے خودنوشت کے میدان میں روایتی حدود کو نہ صرف توڑا بلکہ اسے ایک تخلیقی صنف کی حیثیت سے بھی نئی شناخت عطا کی ہے۔

سوانح نگاری کا فن بھی آج کے دور میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔کسی بھی شخصیت کی صحیح تصویر سوانح سے ہی سامنے آتی ہے۔اگر اس میں ہزم واحتیاط کو برقرار نہ رکھا جائے تو بعض شخصیات مضحکہ خیز بن جاتی ہیں، اس میں غلو، مبالغہ، بے جا تعریف اور تنقیص سے بھی گریز کیا جانا چاہیے تا کہ شخصیت کی ہو بہو تصویر سامنے آسکے۔

- خواجہ الطاف حسین نے حیاتِ جاوید(۱۹۰۱)لکھ کر فن سوانح نگاری کا ایک معیار قائم کیا ہے۔سوانح نگاری کے آداب اسی کتاب سے دوسروں نے سیکھے ہیں۔حیات جاوید کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کی وجہ یہی ہے کہ انھوں نے سرسید کی مجموعی شخصیت کو اس عہد کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی۔یہ اور بات ہے کہ حیات جاوید میں حالی کی عقیدت زیادہ روشن ہے۔پھر بھی حالی نے فن سوانح نگاری کے جو رموز ہیں ان کو سمجھا ہے اور اس کی روشنی میں یہ کتاب لکھی۔حالی کے علاوہ اور بہت سے لوگوں نے سوانح لکھی اور ان باتوں کا التزام کیا جو کسی بھی سوانح کو عمدہ سوانح بنانے میں معاون ہوتی ہیں اس ضمن میں جو نام علی گڑھ کے حوالے سے نمایاں ہیں وہ یہ ہیں:

- مولانا ذکاءاللہ کی تصنیف ''سوانح عمری حاجی مولوی محمد سمیع اللہ خاں بہادر سی جی ایم (۱۹۰۹) مطبع نورالاسلام، حیدرآباد۔یہ کتاب سرسید کے دست راست مولوی سمیع اللہ خاں کی سیرت وشخصیت پر مبنی ہے، اس کتاب میں ان کی زندگی کے نشیب وفراز کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔چونکہ ان کی زندگی جہد مسلسل اور عزم مصمم سے عبارت ہے اور یہی دونوں خوبیاں کسی بھی انسان کو عظیم بناتی ہیں۔کتاب میں انگریزوں کے عہد کے واقعات بھی درآئے ہیں جن سے کتاب کی اہمیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔یہ کتاب ۱۱۴ابواب پر مشتمل ہے جو موصوف کی زندگی کے مختلف گوشوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ان کی قومی خدمت اور رفاہی جذبے کی تفاصیل سے بھی کتاب مزین ہے۔

• حیات محسن، مولوی حیدر علی خاں، فیر نواز جنگ بہادر محسن الملک کی سوانح ہے، جسے حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی خواہش کے مطابق مولوی امین زبیری مارہروی نے ترتیب دیا ہے اور جو مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ سے ۱۹۳۴ء میں طبع ہوئی۔

محسن الملک اٹاوہ کے سادات گھرانے میں ۹ر دسمبر ۱۸۳۷ میں پیدا ہوئے، آپ کے خاندان میں تعلیم کا چرچا نہیں تھا لیکن آپ نے اس جانب خصوصی توجہ دی۔ زیرنظر کتاب میں نواب محسن الملک کی سرسید احمد خاں سے دوستی اور ان سے قربت کی تفصیل بھی مذکور ہے۔ آپ نے سرسید احمد خاں کو اپنی آنکھوں دیکھا تھا، اس لیے سرسید کی روش اور حکمت عملی پر آپ تاحیات گامزن رہے۔ پرآشوب دور اور جاں گسل حالات میں آپ نے سرسید احمد خاں کا ساتھ دیا اور انکے تعلیمی مشن کو آگے بڑھانے میں آپ نے ہر طرح کی معاونت کی۔

سرسید کی طرح آپ کی قومی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔ انگریزوں نے آپ کی مدبرانہ کوششوں کو تسلیم کیا۔ آپ کی مناسب حکمت عملی نے ہی قحط اور عسرت کے زمانے میں عوام کو مفلوک الحالی کے عذاب سے بچایا۔ غرض پوری کتاب میں آپ کی زندگی کے تمام گوشوں پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے، جس سے کتاب کی اہمیت وافادیت مسلم ہوگئی ہے۔

• ''حیات آفتاب'' صاحب زادہ آفتاب احمد خاں (مرحوم) کی سوانح ہے جس کے مصنف حبیب اللہ خاں ہیں۔ سن اشاعت درج نہیں ہے البتہ پیش لفظ میں حبیب اللہ شروانی نے تاریخ لکھی ہے ۱۲ جون ۱۹۴۷ء، پرنٹر عبدالمجید مطبع اسرار کریمی پریس، الہ آباد۔

صاحبزادہ آفتاب احمد (۲۶-۱۹۲۴) تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے اور اپنی انتظامی صلاحیتوں سے یونیورسٹی کے وقار میں اضافہ کیا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی قومی وعلمی خدمات اظہر من الشّمس ہیں۔ کتاب میں ان کی علمی، ادبی، اصلاحی، سماجی، سیاسی خدمات کا بیان اور ان کی کوششوں کا اعتراف ہے۔ مصنف نے آفتاب احمد خاں کو نہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے اور نہ ہی ان کے رتبے کو کم تر کرنے کی کوشش کی ہے۔

ان سوانحی کتابوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے شخصیات کی تفہیم کا جو پیمانہ یا معیار وضع کیا ہے وہی معیار اپنانے سے کسی بھی شخصیت کی مکمل تصویر سامنے آسکتی ہے۔اس طرح سوانح نگاری کے میدان میں بھی علی گڑھ نے اپنے امتیازی نقوش مرتسم کیے ہیں اور اس فن کو بھی انتہائی وسعتیں عطا کی ہیں۔

جہاں تک خطوط نگاری کا تعلق ہے تو یہ بھی ایک بہت ہی پیچیدہ فن ہے۔خط لکنا جتنا آسان ہے اتنا ہی مشکل بھی۔دراصل خط سے انسانی شخصیت کا احساس ہوتا ہے۔دراصل خط کسی کی داخلی شخصیت اور اس کے باطنی تموج کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔علی گڑھ نے خطوط نگاری کے میدان میں اپنے امتیازات کو روشن کیا ہے اور روایتی خطوط نگاری سے الگ ہٹ کر اس کو بھی ارتقائی منزلوں سے ہم کنار کیا ہے کہ یہ خطوط صرف ادب کا حصہ ہی نہیں بلکہ ادب کی تفہیم اور تعبیر کا ایک اہم ترین وسیلہ بھی بن گئے ہیں۔علی گڑھ نے خطوط نگاری کے میدان میں نئے نئے تجربے کیے ہیں۔جو اہم خطو نگار ہیں اور جن کے خطوط کو ادبی اور تاریخی اہمیت حاصل ہے ان کے نام کچھ اس طرح ہیں:

- آل احمد سرور نے مکاتیب کے شائع کرنے سے متعلق ایک بات کہی تھی کہ ان ہی خطوط کو منظر عام پر آنا چاہیے جن میں کوئی ادبی مباحث ہو اور جس کا اپنا کوئی امتیاز ہو۔سرور صاحب کے مکاتیب اس خصوصیت کے حامل ہیں۔سرور صاحب نے اپنے خطوط میں انسانی رشتے کی پاسداری اور ادبی مشاغل پر بہت زور دیا ہے۔اپنے بھائی 'مبشر' اور انجمن ترقی اردو سے لکھے خطوں سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔موصوف کے مکاتیب ان کی ذاتی سادگی، ادبی لگن اور دیگر افراد کو ادبی ذوق کی ترغیب دینے اور ان کے ادبی کاموں کی حوصلہ افزائی کا نمونہ ہیں۔سرور صاحب نے اپنی تنقیدی تحریروں کے برعکس اپنے مکاتیب میں نہایت سادہ اور سہل انداز تحریر اختیار کیا ہے۔

- رشید احمد صدیقی کی تحریریں طنز وظرافت سے معمور ہوتی ہیں۔یہ خصوصیت ان کے مکاتیب میں بھی پائی جاتی ہے۔رشید صاحب کے کچھ خطوط ایسے ہیں جو اکبر کے بڑھاپے کے خطوط کی طرح امراض کی روداد ہیں یا کتابوں کی رسید۔مگر ایسے خطوط کی تعداد بھی بہت ہے جن میں انھوں نے بے تکلفی سے زندگی، ادب، ماحول، مشاہیر، موسم اور اپنے معاصرین کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔

خطوط میں انھوں نے آزادی سے بعض معاصرین کی تعریف کی ہے اور بعض پر اعتراضات بھی کیے ہیں۔ گویا یہ خط ان کے اس وقت کے جذبات واحساسات کی عکاسی کرتے ہیں۔ عام طور پر وہ انسیت پسند انسان تھے۔ ان کے خطوط کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ رشید صاحب اپنے زمانے سے متعلق، معاصرین سے متعلق، مذہب، سیاست، صحافت، اردو، مسلمان اپنے کچھ مخصوص دوستوں سے متعلق دلچسپ انداز سے تبصرہ کرتے ہیں۔

• خواجہ غلام السیدین نے اپنے زیادہ تر مکاتیب اپنے خویش واقارب کو ارسال کیے ہیں۔ موصوف کے مکاتیب کچھ خطوط غالب کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ بعض دفعہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ خط نہیں بلکہ دو افراد کے درمیان گفتگو کا معاملہ ہے۔ القاب وآداب بھی کافی مختصر ہوتے ہیں۔ نفس مضمون کو رواں اور سہل انداز میں پیش کر دیتے ہیں۔ عبارت میں طنز ومزاح کی کیفیت بھی جا بجا ملتی ہے۔ تحریر شگفتہ و برجستہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کا بخوبی اندازہ بیگم صالحہ عابد حسین کے نام ''مصداق'' اور صابرہ زیدی کے نام لکھے گئے مکاتیب سے ہوتا ہے۔

• مولانا عبدالماجد دریابادی کے مکاتیب سے ان کی علمی لیاقت اور سخن فہمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبداللطیف، حیات اللہ انصاری اور نثار احمد فاروقی کے نام جو مکاتیب ہیں ان سے مولانا کی زبان دانی، ادبی لیاقت اور دقیق سے دقیق مسائل پر ان کی گرفت کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا اپنی بات بے لاگ طریقے سے کہتے تھے اور ان لوگوں سے بھی خط وکتابت کا راستہ انھوں نے ہموار رکھا جن سے ان کی مخالفت رہتی تھی۔

• احسن مارہروی نے ۲۶-۴-۳۷ کو ایک خط جو اپنے کسی دوست کے نام لکھا ہے۔ یہ خط دراصل علمی نوعیت کا ہے۔ اس خط کے ذریعہ احسن مارہروی صاحب کی زبان دانی اور علمی تبحر کا پتہ چلتا ہے۔ اس خط میں موصوف نے غلط العام الفاظ کی صحت اور درستگی پر عالمانہ بحث کی ہے اور تحقیقی نقطہ نظر سے یہ واضح کر دیا ہے کہ وہ الفاظ جو اہل علم اور اربابِ قلم جن کی تحریر میں مسلم ومعتبر ہیں، اگر ان کے استعمال میں کوئی لفظ خلاف لغت مستعمل ہو گیا ہے اور متفق علیہ مروج ہو چکا ہے تو وہ فصیح اور درست سمجھا جائے گا خواہ اس کی لغت میں قرأت کچھ بھی ہو۔ مثلاً آج کل حَذف جو حَذْف کے لیے قرأت میں آتا ہے۔

ان خطوط سے ان کے اسالیب اور افکار سے بھی آشنائی ہوتی ہے چونکہ خطوط زیادہ کسی بھی اور صنف میں انسان کی باطنی شخصیت روشن نہیں ہوتی، اس لیے یہ خطوط کسی بھی تخلیق کار کی شخصیت اور اس کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کا بہترین وسیلہ ہیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے بھی اردو مکتوب نگاری کی روایت میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔

سفرنامہ میں بھی علی گڑھ کا امتیاز روشن ہے۔ خاص طور پر وہ سفرنامے جو مغربی دنیا کے ہیں۔ ان میں نہ صرف مقصدیت نظر آتی ہے بلکہ یہ احساس بھی جھلکتا ہے کہ ملک وقوم کی ترقی کے لیے ان لوگوں کے دلوں میں کیسے کیسے جذبات موجزن تھے۔ ان کا مقصد صرف عمارتوں کا مشاہدہ ہی نہیں بلکہ وہاں کے تہذیبی، سماجی، سیاسی، ثقافتی اور تعلیمی نظام سے آگہی بھی تھا۔ اس طرح وہ اپنے دل کی دنیا کو روشن کرتے اور ذہنی تابندگی کے لیے سفر کرتے تھے اور اس آگہی کی روشنی پوری قوم وملت تک پہنچانے کی سعی بھی کرتے تھے۔ ان کے سفرنامے محض جغرافیہ یا تاریخ نہیں بلکہ ان کے جذبات کے آئینہ دار ہیں۔ اور ان کے ذریعہ وہ قوم کے مستقبل کے سنوارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ علی گڑھ کے جو سفرنامہ نگار ہیں ان میں سرسید احمد خاں سے لے کر پروفیسر حافظ محمد شائق احمد یحییٰ تک ایک طویل فہرست ہے۔ جن کے سفرناموں میں اپنے الگ الگ زاویے ہیں۔ کسی نے وہاں کی تمدنی، تعلیمی اور تعلیمی صورت حال کو پیش نظر رکھا تو کسی کی نظر میں وہاں کے آرٹ اور ادب کا نقشہ تھا۔ کسی نے حیوانات، وائلڈ لائف کے نقطہ نظر سے اسفار کیے۔ اس طرح یہ سفرنامے اپنے اپنے ذہن اور ذوق کے مطابق لکھے گئے اور اس کے ذریعے ذہنوں میں مختلف ملکوں کے تعلق سے جو اجنبیت اور ناآشنائی تھی اسے دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ سفرنامے روایتی سفرناموں کی توسیع یا تجدید ہی نہیں بلکہ سفرنامے کی صنف کو نئے منطقوں سے آگاہ کرانے کی کوشش بھی ہے۔ ان سفرناموں نے ادب کو ایک نیا اسلوب دیا اور فکر کو بھی ایک نیا طرز دیا اس طرح یہ صرف اسلوب کی رنگارنگی کی وجہ سے نہیں بلکہ افکار کی وجہ سے ادب کی تاریخ میں زندہ رہیں گے۔ ہر ایک سفرنامہ نگار کا اپنا ایک مخصوص زاویہ نظر ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے پیش نظر کیا چیزیں رہی ہیں۔ ان سفرناموں سے جہاں ان

دگر'' (اردو ادب، لاہور، ۱۹۷۰) اور ''دکھلایئے لے جا کے اسے مصر کا بازار'' (مکتبہ اردو ادب، لاہور، ۱۹۷۶) شامل ہیں۔

• عابد حسین کا سفرنامہ ''رہ نوردِ شوق'' (مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۹) بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنے سفر کے احوال لکھے ہیں گو کہ انھیں مکمل طور پر سفرنامہ نہیں کہا جا سکتا مگر چونکہ اس میں بھی بہت سے عناصر سفر سے متعلق ہیں اس لیے اس کا شمار بعض لوگوں نے سفرنامے میں کیا ہے۔ یہ سفرنامہ اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں بہت ساری معلومات ہیں، بہت سے اہم اشخاص کے حوالے ہیں۔

• ''دنیا میرا گاؤں'' خواجہ غلام السیدین (سیدین میموریل ٹرسٹ، جامعہ نگر، نئی دہلی، ۱۹۸۵)۔ مجموعی طور پر خواجہ غلام السیدین کا سفرنامہ ہمیں ایک نئی کائنات سے روشناس کراتا ہے اور ہمارے اندر ایک ایسے جذبے کو جنم دیتا ہے، جن کے زندہ ہونے سے زندگی سنورتی ہے۔

• ''آوارگی'' جاوید دانش (حنفی ٹرسٹ، ۴۷ نیرس لین کلکتہ، اگست ۱۹۸۷)۔ جاوید دانش نے اپنے سیاحت نامے میں اپنی تخلیقی کیفیت کو برقرار رکھا ہے اور تنقیدی بصیرت کا ثبوت دیا ہے، جس کی وجہ سے یہ سفرنامہ مختلف اقوام وملل، امصار واماکن اور تہذیب، معاشرت کا مرقع بن گیا ہے اور سائیکی کی تصویریں بھی اس طرح کھینچ دی ہیں کہ یہ بہت سی جغرافیائی اور سماجیاتی، تاریخی، تہذیبی اور عمرانیاتی کتب کی ورق گردانی سے قاری کو بے نیاز کر دیتا ہے۔

• ''روزنامچہ سیاحت'' (تجارتی پریس، میرٹھ، ۱۹۱۲)، خواجہ غلام الثقلین کے روس، قسطنطنیہ، عراق، ایران، عرب (مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ) کے مختلف اسفار کی روداد پر مشتمل ہے۔

• ''سفر حجاز'' (معارف پریس، اعظم گڑھ، ۱۹۳۱)، سیاحت ماجدی (ادارہ انشائے ماجدی، کلکتہ، ۱۹۸۰) اور ''ڈھائی ہفتے پاکستان میں'' (عبدالماجد اکیڈمی، لکھنؤ، ۱۹۸۱) یہ تینوں سفرنامے عرب، پاکستان اور دیگر ممالک کے اسفار پر مبنی ہیں۔ ان سفرناموں کے مطالعے سے مولانا کی قوتِ مشاہدہ کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ چونکہ مولانا باریک بیں تھے، اس وجہ سے وہ مختلف علاقوں کا مطالعہ بھی اسی باریکی سے

کی مشاہداتی قوت اور قدرت مدرکہ اور دیگر تخلیقی قوتوں کا علم ہوتا ہے وہیں ان کے زاویہ نظر کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اشیا اور مظاہر کو کس زاویے سے دیکھتے ہیں یا دیکھنے کی قوت رکھتے ہیں۔ بہر حال سفرنامے کی صنف میں چند نام بہت اہم ہیں جنھیں اردو سفرنامے کی تاریخ لکھتے ہوئے قطعی طور پر فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ انھوں نے اردو سفرنامے کو نئی لہروں سے آشنا کیا۔

• علی گڑھ کے سفرناموں میں پہلا نام بانی درسگاہ سرسید احمد خاں کا ہے جنھوں نے ''مسافران لندن'' کے نام سے اپنا سفرنامہ تحریر کیا اور اپنے مشاہدات و تجربات پر مشتمل ایک ایسی کتاب لکھی جس سے نہ صرف لندن کی تہذیب و معاشرت معلوم ہوتی ہے بلکہ سرسید کو اس سفر سے ایک نئی روشنی اور تحریک بھی ملی۔ سرسید احمد خاں کے اس سفرنامے میں ان کے سوز دروں اور اپنی قوم کے تئیں مکمل طور پر بیداری کی آرزو دکھائی دیتی ہے۔

• حاجی محمد سمیع اللہ خاں بہادر کے سفرنامے کا نام بھی ''سفرنامہ لندن'' ہے۔ اس سفرنامے کا مقصد بھی قومی بیداری ہے۔

• پروفیسر ثریا حسین کا سفرنامہ ''پیرس و پارس'' (مکتبہ جامعہ ۱۹۸۴) اس اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے کہ انھوں نے سرسید کی طرح مغربی ممالک کے مسائل کا سنجیدگی سے تجزیہ پیش کیا ہے۔ پیرس و پارس دو تہذیبوں کا وصال ہے۔ مشرق و مغرب، جدید و قدیم دو متضاد لہروں اور سمتوں کا یہ حسین امتزاج ہے۔ پروفیسر ثریا حسین نے پیرس کی پوری تاریخ اور تہذیب اجمالی طور پر کتاب میں بیان کردی ہے۔

• خواجہ احمد عباس کا سفرنامہ ''مسافر کی ڈائری' (حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۴۰) بھی ان کے تجربات و مشاہدات پر مشتمل ہے جو ۱۹۳۸ء میں ورلڈ یوتھ کانفرنس نیویارک میں شرکت کے دوران انھیں حاصل ہوئے۔

• قرۃ العین حیدر خارجی طور پر متعدد ملکوں کے سفر کیے لیکن ان کا سب سے بڑا سفر باطن کا سفر ہے۔ وہ اپنی کہانیوں، افسانوں اور ناولوں میں اکثر حال سے ماضی اور ماضی سے حال میں سفر کرتی رہتی ہیں۔ ان کی بیشتر کہانیاں ماضی اور حال کے سفر کی داستان ہیں۔ ان کے سفرناموں میں ''جہان

کرتے تھے۔

- ''ایران نامہ'' حکیم سید ظل الرحمٰن کا سفر نامہ ہے۔ اس میں ان کے دو سفر ناموں کی مکمل روداد ہے۔ ۱۹۹۲ اور ۱۹۹۵ میں کیے گئے ایران کے سفر کی روداد ہے، جس سے ایران کی ادبی، تاریخی معلومات کے ساتھ ساتھ وہاں کے اہم مقامات، تاریخی عمارتیں، طبی ادارے اور وہاں کے شعرا و فضلا سے شناسائی ہوتی ہے۔

ان معروضات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیسویں صدی میں غیر افسانوی نثر کی تمام اہم اصناف یعنی خاکہ، سوانح، خودنوشت، خطوط نگاری اور سفر نامے کو فرزندانِ علی گڑھ نے فکری اور فنی معراج عطا کر دی۔

II + II

مآخذ و مصادر

آپ بیتی	مولانا عبدالماجد دریابادی	مکتبہ فردوس، لکھنؤ	۱۹۹۸ء
آندھی میں چراغ	خواجہ غلام السیدین	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۱۹۹۸
آشفتہ بیانی میری	رشید احمد صدیقی	کوہ نور پریس دہلی	۱۹۷۲
آوارگی	جاوید دانش (علیگ)	پرنٹ ویل آفسیٹ بیکلو ڈاسٹریٹ، کلکتہ	۱۹۸۷
انتخاب رشید احمد صدیقی	مرتب ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۹۸
اردو خودنوشت: فن و تجزیہ	ڈاکٹر وہاج الدین علوی	لبرٹی آرٹ پریس، دریا گنج، دہلی	۱۹۸۹
اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر خالد محمود	لبرٹی آرٹ پریس، دریا گنج، دہلی	۱۹۹۵
اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ	ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	کلاسیک چوک ریگل (مال)، لاہور	۱۹۹۹
اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۸۴
اردو ادب میں طنز و مزاح	ڈاکٹر سیدہ جعفر	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۷۸
اردو میں خودنوشت نگاری کا فن	ڈاکٹر صبیحہ انور	نامی پریس، لکھنؤ	۱۹۸۲
اردو میں سوانح نگاری کا ارتقا	ڈاکٹر سید علی شاہ	گلڈ پبلشنگ ہاؤس، ڈھاکہ	۱۹۶۱
اس آباد خرابے میں	اختر الایمان	اردو اکادمی، دہلی	۱۹۹۶
اردو میں خاکہ نگاری	ڈاکٹر صابرہ سعید	مکتبہ شعر و حکمت	۱۹۷۸
اعمال نامہ	سر رضا علی	کوہ نور پریس، دہلی	۱۹۷۲
اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا	ڈاکٹر ممتاز فاخرہ	رونق پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۸۴
الغزالی	شبلی نعمانی	دارالمصنفین، اعظم گڑھ	۱۹۰۲
ایران نامہ	پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن	لیتھو کلر پرنٹرس، علی گڑھ	۱۹۹۸
انسائیکلوپیڈیا برٹانکا (جلد دوم)	ہیلن ہمنگ وے	بسٹن پبلشر شکاگو	۱۹۷۳-۷۴
انتخاب خطوطِ غالب	مرزا غالب	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۹۵

انتخاب غبار خاطر	مرزا غالب	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۹۵
اردو خطوط نگاری	نسرین ممتاز بصیر	شوق آفسیٹ پریس، دریا گنج، نئی دہلی	۱۹۹۵
باغ و بہار	میر امن	اعجاز پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی	۱۹۸۹
برگ گل	پروفیسر مقبول احمد لاری	انجمن اسلام کا ادبی پرنٹنگ پریس، ممبئی	۲۰۰۱
بزم خوش نفساں رفتہ	مرتب جمیل جالبی	مکتبہ اسلوب، کراچی	۱۹۸۲
پاکستانی ادب کی شناخت کی نصف صدی	غفور شاہ قاسم	ریز پبلی کیشنز، تاج محل پلازہ، پاکستان	۲۰۰۰
پیرس و پارس	پروفیسر ثریا حسین	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	۱۹۸۴
تاریخ ادب	پروفیسر نور الحسن نقوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۶
تصویریں اجالوں کی	پروفیسر نور الحسن نقوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۹۹
جہان دیگر	قرۃ العین حیدر	مکتبہ اردو ادب، لاہور	۱۹۷۰
خواب دوست	نسیم انصاری	ایجوکیشنل بک ہاس، علی گڑھ	۱۹۸۸
جو کہا نہیں گیا	کسم انسل	راج پال اینڈ سنز کشمیری گیٹ، دہلی	۱۹۹۶
چند اکابر چند معاصر	جلیل قدوائی	ادارہ نگارش مطبوعات کراچی	۱۹۷۷
چند ہم عصر	مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی	۱۹۷۵
حالی کی نثر نگاری	ڈاکٹر عبدالقیوم	مجلس ترقی ادب لاہور	۱۹۶۴
حیات آفتاب	حبیب اللہ خاں	پرنٹر عبدالمجید، اسرار کریمی، الہ آباد	۱۹۴۷
حیات جاوید	الطاف حسین حالی	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۱۹۹۹
حیات محسن	مرتب محمد امین زبیری مارہروی	مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ	۱۹۳۴
حیات مستعار	جلیل احمد قدوائی	المخزن پرنٹر، کراچی	۱۹۸۷
خاموش آواز	جاں نثار اختر	مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال	۱۹۸۱
خامہ بگوش کے قلم سے	مرتب مظفر علی سید	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی	۱۹۹۵
خطوط سرسیّد	مرتب ڈاکٹر نسرین ممتاز بصیر	لیتھو کلر پرنٹرس، علی گڑھ	۱۹۹۵
خنداں	رشید احمد صدیقی	انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی	۱۹۶۵
خواب باقی ہیں	آل احمد سرور	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۹۱
خوں بہا	حکیم احمد شجاع	تاج کمپنی، لاہور	۱۹۴۳

دانش گاہ علی گڑھ میں ادب	پروفیسر خورشید احمد	یونیورسٹی پریس، علی گڑھ	۲۰۰۵
دنیا میرا گاؤں	خواجہ السیدین	سیدین میموریل ٹرسٹ، نئی دہلی	۱۹۸۵
دکھلایئے لے جا کے اسے مصر کا بازار	قرۃ العین حیدر	مکتبہ اردو ادب، لاہور	۱۹۷۰
ذاکر صاحب کے خطوط	مرتب پروفیسر مختار الدین آرزو	خدا بخش پبلک لائبریری، پٹنہ	۱۹۹۹
ڈھائی ہفتے پاکستان میں	مولانا عبدالماجد دریابادی	عبدالماجد اکادمی، لکھنؤ	۱۹۸۱
رشید احمد صدیقی	مرتب مالک رام	علمی مجلس، دہلی	۱۹۷۵
رشید احمد صدیقی: شخصیت اور ادبی قدر و قیمت	مرتب پروفیسر ابوالکلام قاسمی	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۹۸
رشید احمد صدیقی کے خطوط	آل احمد سرور	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۹۶
رقعات رشید صدیقی	مرتب مسعود حسین خان	لیتھو کلر پریس اچل تال، علی گڑھ	۱۹۸۱
رہ نورد شوق	ڈاکٹر سید عابد حسین	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی	۱۹۷۹
رقص شرر	ملک زادہ منظور احمد	رہبر آفسیٹ پرنٹرز، ترجمان گیٹ، دہلی	۲۰۰۴
روزگار فقیر	سید وحید الدین فقیر	لائن آرٹ پریس، لاہور	۱۹۳۶
روزنامچہ سیاحت	خواجہ غلام السیدین	تجارتی پریس، میرٹھ	۱۹۱۲
زرگزشت	مشتاق احمد یوسفی	چمن بک ڈپو، اردو بازار، دہلی	۱۹۷۷
زیر لب	صفیہ اختر	صفیہ اکیڈمی، حیدرآباد	۱۹۶۰
سخن دلنواز	خواجہ غلام السیدین	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	۱۹۸۲
سردار جعفری کے خطوط	مرتب خلیق انجم	انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی	۲۰۰۱
سرسید اور ان کے نامور رفقا	سید عبداللہ	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۹۴
سرسید اور ان کے کارنامے	نورالحسن نقوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۳
سفر حجاز	مولانا عبدالماجد دریابادی	معارف پریس، اعظم گڑھ	۱۹۳۱
سوانح عمری مولانا روم	شبلی نعمانی	دارالمصنفین، اعظم گڑھ	۱۹۰۲
سوانح عمری مولوی محمد سمیع اللہ	مولوی محمد ذکاء اللہ	مطبع نورالاسلام، حیدرآباد	۱۹۰۲
سیاحت ماجدی	مولانا عبدالماجد دریابادی	ادارہ انشائے ماجدی، کلکتہ	۱۹۸۰
سید احمد خاں	خلیق احمد نظامی	پبلی کیشنز ڈویژن، وزارت اطلاعات و نشریات، حکومت ہند	۱۹۹۴
شاہراہ پاکستان	چودھری خلیق الزماں	انجمن اسلامیہ، کراچی	۱۹۶۷

شنیدہ و دیدہ	پروفیسر اختر الواسع	رضا لائبریری، رام پور	۲۰۰۷
شیخ نیازی	رشید احمد صدیقی	سرسید بک ڈپو، علی گڑھ	۱۹۷۷
ضلع بجنور کے جواہر	فرقان احمد صدیقی	جید پریس، بلی ماران، دہلی	۱۹۹۱
طواف دشت جنوں	حقانی القاسمی	استعارہ پبلی کیشنز، نئی دہلی	۲۰۰۳
گفتنی ناگفتنی	وامق جونپوری	لبرٹی آرٹ پریس، نئی دہلی	۱۹۹۳
گرد راہ	اختر حسین رائے پوری	المسلم پبلشرز، کراچی	۱۹۹۳
گنجینۂ گوہر	شاہد احمد دہلوی	مکتبہ اسلوب، کراچی	۱۹۸۲
گنجہائے گرامایہ	رشید احمد صدیقی	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی	۱۹۹۵
لاؤڈ اسپیکر	سعادت حسن منٹو	گوشہ ادب، لاہور	۱۹۵۶
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں	خواجہ غلام السیدین	غلام السیدین ٹرسٹ، نئی دہلی	۱۹۷۴
مداوا	غلام فرقت کاکوروی	یوسفی پریس، لکھنؤ	۱۹۴۴
مسافرانِ لندن	سرسید احمد خاں	مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۶۱
مضامین خلیل الرحمٰن اعظمی (جلد ۱)	انتخاب پروفیسر شہریار	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	۲۰۰۴
مسافر کی ڈائری	خواجہ احمد عباس	حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۴۰
مضامین رشید	رشید احمد صدیقی	انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی	۱۹۶۵
مقالاتِ قومی سمینار	مرتب ریاض الرحمٰن شیروانی	اے کے آفسیٹ پرنٹرز، دہلی	۲۰۰۰
مکاتیب احسن (جلد اول)	مرتبین: ڈاکٹر عنوان چشتی، صغیر احسنی	اردو سماج جامعہ نگر، نئی دہلی	۱۹۷۷
مکاتیب سرور	مرتب وارث رفیع	محی بخش قادری، اندرا نگر، لکھنؤ	۲۰۰۳
مکتوباتِ ماجدی	مرتب ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی	ادارہ انشائے ماجدی، کلکتہ	۲۰۰۷
مولوی نذیر احمد کی کہانی - کچھ ان کی کچھ میری زبانی	مرزا فرحت اللہ بیگ	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۸۲
ناروا	غلام فرقت کاکوروی	سرفراز قومی پریس، لکھنؤ	۱۹۴۴
ہم ساتھ تھے	حمیدہ سالم	انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی	۱۹۹۹
ہم نفسانِ رفتہ	رشید احمد صدیقی	انڈین بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۶۶
ورودِ مسعود	مسعود حسین خان	خدا بخش لائبریری، پٹنہ	۱۹۸۸
یادِ ایام	احمد سعید خاں چھتاری	ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ	۱۹۴۹

یادگار حالی	صالحہ عابد حسین	انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی	۲۰۰۱
یارانِ میکدہ	عبدالشکور	کتاب خانہ، دانش محل، لکھنؤ	۱۹۴۳
یادوں کی برات	جوش ملیح آبادی	آئینۂ ادب لکھنؤ	۱۹۷۳
یادوں کی دنیا	ڈاکٹر یوسف حسین خان	معارف پریس، دارالمصنفین، اعظم گڑھ	۱۹۶۷

رسائل

امنگ	روزنامہ راشٹریہ سہارا، اردو، دہلی	۱۵ جون، ۲۰۰۸
علی گڑھ میگزین	(خصوصی شمارہ علی گڑھ، آئینۂ ایام میں) مدیر: محمد رضوان مصطفیٰ صدیقی،	۱۹۹۷
فروغ اردو	مولانا عبدالماجد دریابادی نمبر، پروفیسر احتشام حسین	۱۹۷۱
کانفرنس گزٹ	مدیر: ریاض احمد شیروانی	۲۰۰۶
فکر و نظر	سرور نمبر، مد: آزرمی دخت صفوی	نومبر ۲۰۰۳
تمثیل نو (دربھنگہ)	لندن میں دو روز	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶
ماہنامہ نیا دور	عبدالماجد دریابادی نمبر	اپریل ۱۹۷۸
نقوش	مدیر: طفیل احمد (آپ بیتی نمبر)	جون ۱۹۶۴
پہچان	مرتبین: زیب النساء، نعیم اشفاق	۲۰۰۷